شمالی امریکہ سے نکلنے والا علمی و ادبی مجلّہ

سہ ماہی

اردو انٹرنیشنل کینڈا

مدیر

اشفاق حسین

معاونِ خصوصی

پروفیسر حسن عابد

جلد ۲ — فروری - اپریل ۱۹۸۳ء — شمارہ ۱

ترتیب

افسانے

غزلیں

خطوط و تبصرہ

حرفِ آغاز

تیرگی کی چوکھٹ پر سر رکھ کر روشنی روشنی الاپنے سے نہ تو رنگ و نغمہ کی بارش ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی روشن صبح کے امکانات کی شمع جل سکتی ہے۔ مگر اپنی اندھی تحریروں کے حوالے سے چمکتی صبح کا نقشہ کھینچنے والوں کو کون بتلائے کہ روشنی تو خود ان کے کھوکھلے وجود کے اندر بھی ایک سڑتی ہوئی تعفّن زدہ لاش ہے، جس کی تدفین کا بھی اہتمام نہ ہو سکا۔ انہیں کون یہ سمجھائے کہ معاشرے کے اندر ہر لمحہ منفی اور مثبت رویوں کی معرکہ آرائی میں لکھنے والے کا کردار غیر جانبدار نہیں ہو سکتا۔ اور غیر جانبداری کا یہ لباس کسی ادیب کے جسم پر بھلا نظر آنے لگے تو ہمارے ادبی معیارِ جمال اور ذوقِ نظر کو کسی بھی نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے مگر حدِّ نظر تک پھیلی ہوئی ادبی رہگزار پر رُک رُک کر سانس لیتے ہوئے چراغوں کی لَو، بے نوری کے فیضِ عام کو اپنے دامن میں نہ چھپا سکے گی۔

بے نوری کا یہ فیضِ عام اگر دیکھنا ہو تو آج کے ادبی پیش منظر میں اُس بڑھتی ہوئی خلیج کو دیکھنا چاہیئے جو لکھنے والے اور قاری کے درمیان ہے —————— یہ صرف ابلاغ کا مسئلہ نہیں ہے، یہ صرف قدیم و جدید پیرایۂ اظہار کا فرق بھی نہیں ہے اور نہ ہی اسے صرف ٹوٹتی ہوئی قدروں کے عمل کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ ان ذمہ داریوں سے فرار کا لازمی نتیجہ بھی ہے جو لکھنے والے پر زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں سنجیدہ رویہ اختیار کرنے کو، کسی ادیب کے لیے اتنا ہی ضروری سمجھتی ہیں جتنا کہ خود اس کی نشو و نما کے لیے تازہ ہوا، پانی اور خوراک۔

اپنی ذات کا اظہار ہو یا اپنی ذات کے حوالے سے سماجی الجھنوں کا اظہار ہو، کسی نظریئے کے بغیر لکھا ہوا ادب ہو یا نظریات کے سائے میں پروان چڑھنے والی تخلیقات ہوں ـــــ دونوں قسم کے رویوں نے صرف اُسی صورت میں شکست کھائی ہے جب لکھنے والے کا رشتہ نہ تو اپنی ذات سے رہا اور نہ ہی خارجی عوامل اُس کی ذات کا جُز بن سکے۔ ویسے یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ لکھنے والا خیر وشر کی رزم آرائی میں کم از کم غیر جانبدار نہیں ہوتا چاہے وہ کسی بھی معاشرے میں زندہ ہو۔ اُس کی جانبداری کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں۔ اس کے نتائج جدا ہوسکتے ہیں، اس کا تجزیہ غلط یا صحیح کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر اہم بات یہ ہے کہ چیزوں کے بارے میں سنجیدہ رویّہ اختیار کیا گیا، اُن کے بارے میں ایک رائے قائم کی گئی اور اس کا اظہار فنّی سطح پر ہوا ـــــ یہی وہ صورتِ حال ہے، جو لکھنے والے اور قاری کے درمیان محسوساتی بُعد کی خلیج کو کم کرتی ہے۔

کیا آج کے لکھنے والے دو واضح مواقف کے مابین جاری ہمہ وقت مبارزہ آرائی میں خطِ فاصل کھینچنے کے لیے جرأت کا مظاہرہ نہیں کریں گے؟ اس لیے کہ یہی جرأتِ اظہار نہ صرف یہ کہ روشنی کے دائرہ کو وسیع کرتی ہے بلکہ فنّی تخلیقات کو دائمی زندگی بھی بخشتی ہے۔

اشفاق حسین

یادِ رفتگاں

سال جو گذر گیا . . . . اپنے پیچھے کئی ایسے ناموں کی تختیاں چھوڑ گیا کہ جو لوحِ مزار کی شکل میں اب ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ مگر جن کی تابندگی سے ہمارے عہد کے ماتھے پر آج بھی ایسی قندیلیں روشن ہیں جن سے آنے والے دنوں میں فکری رہنمائی حاصل ہوتی رہے گی۔

جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، احسان دانش، خدیجہ مستور غلام عباس، حفیظ جالندھری اور دوسرے بہت سے اہلِ قلم اسی سال ہم سے بچھڑ گئے . . . . سال جو گذر گیا اور جسے سن بیاسی بھی کہتے ہیں۔

نئے سال کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے، یادِ رفتگاں کے کچھ چراغ روشن کرنے کی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ چند صفحات بیادِ رفتگاں مختص کئے گئے ہیں۔

ادارہ

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

۱۰ ایم گے

افسانہ نگار غلام عباس

ڈاکٹر اجمل اجملی

دہلی

جوشؔ اور فراقؔ

پچھلے دنوں اُردو دنیا اور یہی کیوں برِ صغیر کی پوری ادبی دنیا اپنے دو قد آور ترین فرزندوں سے محروم ہوگئی۔ ۲۲ فروری کو جوشؔ صاحب نے ہمارا ساتھ چھوڑا اور ۳ مارچ کو فراقؔ صاحب نے۔ جوشؔ اور فراقؔ دو نام نہیں تھے۔ دو افراد نہیں تھے۔ بلکہ دو ایسی علامتیں تھیں جو برِ صغیر ہندوستان کے ایک پورے دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب، ہماری ثقافت، ہماری صدیوں پرانی روایات، اور ہمارے ملے جلے معاشرے کی ساری نفاستوں، لطافتوں، عظمتوں اور بلندیوں کا نچوڑ تھیں۔ یہ دونوں ذاتیں اور اس میں شک نہیں کہ ان دونوں کا شمار ہماری تاریخ کے ان عظمت مآب انسانوں میں کیا جائے گا جو ازل سے لے کر آج تک اس دھرتی کی کوکھ سے جنم لیتے رہے ہیں اور آئندہ بھی جنم لیتے رہیں گے کہ عظمت کا آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔

جوشؔ اور فراقؔ جس طرح ساتھ ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں اسی طرح دنیا میں آئے بھی تھے۔ فرق اتنا ہے کہ ان کی موتوں کے درمیان چند دنوں کا فاصلہ حائل ہے تو ان کی ولادتوں کے درمیان دو برسوں کی دوری حائل تھی اور یہاں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک نے یوپی کے مشرقی علاقے کے اس خطے میں جنم لیا جسے بھوج پوری کا علاقہ کہتے ہیں۔ اور دوسرے نے لکھنؤ کے نواح میں جہاں اودھی بولی جاتی ہے۔ فرق اور بھی ہوں گے کہ آخر کو یہ دونوں الگ الگ شخصیتیں تھیں اور قدرت بہرحال اتنی بڑی فنکار ہے کہ اس کا ہر نقش کسی نہ کسی لحاظ سے دوسرے نقش سے الگ ہوتا ہے مختلف ہوتا ہے اور خود اپنی شناخت رکھتا ہے۔ اب چاہے وہ اچھی ہو یا بُری۔

لیکن جوشؔ اور فراقؔ کے یہاں مماثلتوں کا پلڑا زیادہ بھاری ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دونوں نے ایک ہی دہائی کے اندر جنم لیا ان کا طبقاتی پس منظر بھی لگ بھگ ایک تھا۔ شبیر حسن خاں جوشؔ ٹھیٹھ جاگیردار گھرانے

کے فرد تھے تو گورکھپوری سہائے فراق کائستھ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور سبھی جانتے ہیں کہ کائستھوں کو ہمارے جاگیردارانہ نظام میں جو اہمیت حاصل تھی اس کی بدولت سامنتی تہذیب ان گھرانوں میں رچ بس گئی تھی تہذیبی پس منظر بھی دونوں کا ایک تھا شبیر حسن خان جوش کے دادا فقیر محمد خان گویا صاحب دیوان شاعر تھے تو فراق کے والد عبرت گورکھپوری بھی اپنے وقت کے استادوں میں گنے جاتے تھے بچپن میں مشرقی طرز تعلیم نے ان کا ذہنی پس منظر بنایا اور آگے چل کر دونوں ہی نے مغربی طرز کی تعلیم حاصل کی جوش نے سینئر کیمبرج تک پڑھ کر حالات کے زیر اثر تعلیم کو خیرباد کہہ دیا فراق نے اس سلسلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیا۔ اور سب سے بڑی مماثلت تو یہ تھی کہ دونوں ہی لیلیٰ اُردو کے دیوانے تھے۔ اور دونوں ہی نے اپنی زندگیاں اپنی محبوب زبان کی مشاطگی کے لئے وقف کردیں اس سلسلے میں بھی ایک بڑی مماثلت یہ ہے کہ ابتدائے شاعری میں دونوں ہی نے لکھنؤ کے رنگ شاعری سے رشتہ جوڑا اور اس زمانے کے دو بڑے اور اہم استادوں سے رابطہ قائم کیا فراق وسیم خیرآبادی کے شاگرد بنے تو جوش نے عزیز لکھنوی کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا لیکن جیسا کہ خود فراق نے تسلیم کیا ہے، وہ شاگرد بھلے ہی وسیم خیرآبادی کے رہے ہوں۔ اپنے ابتدائی دور کے بڑے شاعروں میں انہوں نے سب سے زیادہ اثر عزیز کا ہی قبول کیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے اپنے استادوں سے دونوں کا رابطہ ویسا ہی رہا، جیسا اقبال کا اپنے استاد داغ سے۔

مماثلتوں کی بات چل رہی ہے تو یہ بھی بتا دیا جائے کہ ان دونوں کے فکری سوتے اور سماجی و سیاسی رویے بھی لگ بھگ ایک تھے مذہب سے جوش کو بھی کوئی تعلق نہ تھا اور فراق کو بھی مہاتما گاندھی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہونے والی جدوجہد سے دونوں ہی قریبی طور پر جڑے رہے اور بعد میں دونوں ہی نے اپنے ملک کی بائیں بازو کی تحریکوں سے گہرے رابطے قائم کیے۔ اور خاص طور پر محنت کش انسانوں کے دکھ درد کو اپنے دلوں میں اپنی فکروں میں اور اپنے افکار و اپنی تخلیقات میں سمیٹ لیا۔ دونوں ہی نے فرسودہ سماجی رسوم و عقائد کے خلاف زور دار آوازیں بلند کیں قدامت پرستی، مذہبی، اور قومی و نسلی تعصب اور روایت زدگی کے مورچوں پر یلغار کرنے اور دانشوری کی نئی روایتیں بنانے میں جوش اور فراق دونوں ہی پیش پیش رہے۔

جوش و فراق کی گہری انسان دوستی بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے وہ انسان دوست ہی نہ تھے انسان پرست تھے، دونوں ہی انسان کو اس کائنات رنگ و بو کا مرکزی نقطہ سمجھتے تھے اور اگر ان کا کوئی عقیدہ تھا تو وہ تھا انسان دوستی اور انسان پرستی اور ان کا یہی وہ عقیدہ تھا جس نے دونوں کو اس معاشرے سے بغاوت پر اکسایا جہاں انسان انسان پر ظلم کرتا تھا جہاں انسان پر انسان کی حکمرانی تھی، استحصال تھا، استبداد تھا، اور جہاں سماجی حالات، ناانصافیوں محرومیوں اور ناکامیوں نے انسان کو ذلیل و خوار بنا رکھا تھا۔ دونوں ان حالات سے بددل تھے اور انسان کے لئے ایک خوشگوار

مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے اور اسی خواب نے دونوں کو مارکسزم تک پہنچایا۔ نیز مارکس واد کو زندگی کی ٹھوس حقیقت بنا دینے والی تحریک کی رہنا جماعت کمیونسٹ پارٹی سے اس قدر قریب کر دیا کہ انہیں عام طور پر کمیونسٹ سمجھا جانے لگا اور خود کمیونسٹ پارٹی کے حلقوں میں ان دونوں کو وہی اہمیت دی جانے لگی، جو ایک اہم پارٹی کارکن کی ہوتی ہے۔

ہاں تو میں بات جوشؔ اور فراقؔ کی انسان دوستی کی کر رہا تھا۔ انسان پرستی کی کر رہا تھا اس سلسلے میں مجھے جوشؔ کا ایک شعر یاد آرہا ہے لکھتے ہیں ؎

کوئی حد ہی نہیں اس احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

اور فراقؔ نے انہی جذبات کے تحت اپنی مشہور نظم آدمی نامہ لکھی ؎

ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

اس طرح دونوں کے ہی فن کا محور انسان، اس کی عظمت، اس کے جذبات اور اس کے احساسات ہیں جوشؔ و فراقؔ دونوں ہی نے انسان اور انسانیت کے گن گائے ہیں اور ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھا ہے جس میں انسان شرافت، صداقت، اطمینان قلب خودداری اور محرومیوں و ناکامیوں سے آزاد زندگی گذار سکے

لیکن اس مماثلت کے باوجود ادب کے میدان میں دونوں ہی نے اظہار کے الگ الگ پیرائے اپنائے۔ جوشؔ نے نظم کا راستہ پسند کیا اور فراقؔ نے غزل کا۔ ایک نے براہ راست شاعری کی، جو سوچا، جو سمجھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے صاف صاف کہہ دیا۔ پوری گھن گرج کے ساتھ پوری آب و تاب کے ساتھ اور دوسرے نے اپنے محسوسات و خیالات کو غزل کی ایمائیت اور اشاریت سے سجا بنا کر پیش کیا۔ باتیں وہی ہیں، درد وہی ہے کرب وہی ہے، لیکن طریقِ اظہار مختلف اور یہی طریقۂ اظہار ایک دوسرے کو آپس میں ممتاز اور منفرد بناتا ہے۔

جوشؔ کی شاعری ایک ٹھاٹھیں مارتا، بل کھاتا، بڑھتا پھیلتا دریا ہے۔ جس میں الفاظ خس و خاشاک کی طرح بہے جاتے ہیں یہ نہیں کہ شعری نزاکتیں نہیں ہیں۔ خیالات کی بلند پروازی نہیں ہے تشبیہات، اور استعاروں کی سجاوٹ نہیں ہے۔ جمالیاتی حسیت نہیں ہے، یہ سب کچھ ہے مگر جو چیز سب سے حاوی ہے وہ ہے طبیعت کی روانی، قلم اٹھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے الفاظ صف در صف شاعر عہد کے حضور میں ہاتھ باندھے کھڑے ہیں، اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں، ہمیں چن لو، ہمیں اپنا لو، ہمیں نت نئے معانی و مفاہیم سے سجا دو کہ ہم عورتِ گویائی کی آبرو بن جائیں۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ جوشؔ نے الفاظ و علائم کے یہ مطالبے پورے نہیں کئے۔

فراقؔ کی شاعری ٹھاٹھیں مارتا دریا نہیں، ایک جوئے نغمہ خواں ہے۔ جو خیالات کے پہاڑوں سے اترتے ہی سرسبز میدانوں میں آجاتی ہے اور بڑی آہستگی اور نرمی، خوش روی اور خوش خرامی کے ساتھ آہستہ آہستہ بہتی رہتی ہے۔ وہ تقریر نہیں کرتے باتیں کرتے ہیں۔ اور باتیں بھی ایسی کہ کانوں تک پہنچتی ہیں اور دلوں میں اترتی ہیں تو ہمارا پورا وجود ایک عجیب سی مٹھاس میں ڈوب جاتا ہے۔ فراقؔ اپنے نوکیلے لہجے کی مدھم آنچ میں تپا کر ہمارے وجود کو کندن بنا دیتا ہے۔

جوشؔ اپنی پاٹ دار آواز سے ہمیں جھنجھوڑ دیتے ہیں، ہمیں جگا دیتے ہیں، ہمیں وقت اور اس کی ضرورتوں کا احساس دلاتے ہیں اور ہمارے اعصاب پر کچھ اس طرح چھا جاتے ہیں کہ ہماری فکر ان کی فکر کی، اور ہمارے جذبات ان کے جذبات کے غلام بن جاتے ہیں خواہ تھوڑی ہی دیر کے لئے۔

فراقؔ سرگوشیوں میں ہمیں رازِ حیات و کائنات سمجھاتے ہیں وہ ہمارے شعور سے زیادہ ہماری جمالیاتی حس پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ ہمارے جذبات پر کم احساسات پر زیادہ وار کرتے ہیں اور یہ وار اتنا کارگر ہوتا ہے کہ اس کی چبھن ساری زندگی ہمارا ساتھ دیتی ہے۔ وہ ہمیں ایک عجیب طرح کی طمانیت ایک خاص قسم کی لذتیت اور ایک انوکھے طرز کے انبساطِ غم سے روشناس کرتے ہیں۔ ؎

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

یوں سمجھ رکھا تھا گویا بھول بیٹھے ہیں تجھے
رات تیری یاد سے دل میں وہ درد اٹھا کہ بس

اس دور میں زندگی بشر کی   بیمار کی رات ہو گئی ہے
کوئی مرے گیا ہے سیتا کو   زندگی ہے کہ رام کا بن باس

تو یہ فراقؔ تھا اور اردو کے ان دو عظیم فرزندوں میں جنہوں نے اپنی زندگی میں ہی کلاسیکی درجہ حاصل کر لیا تھا، جوشؔ و فراقؔ دونوں ہی نے اپنے دور کو متاثر کیا کبھی الگ الگ کبھی مشترکہ طور پر، اردو شاعروں کی کئی نسلیں ان دونوں کی چھاؤں میں پروان چڑھیں کسی نے جوشؔ کا انداز اپنایا، تو کسی نے فراقؔ کا لب و لہجہ، اور بیشتر نے دونوں قد آور شعراء کے لب و لہجہ اور اندازِ بیان کے ارتباط و اتصال سے خوش آہنگ کیفیت پیدا کی۔ آخر میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ہمارے دور کی شاعری خاص طور پر اردو شاعری قوسین میں گھری ہوئی ہے۔ ایک قوس جوشؔ کی شاعری ہے اور دوسری قوس فراقؔ کی شاعری اور قوسین کا یہ دائرہ اسی وقت ٹوٹے گا جب ہمارے سورج کو کسی ایسے شاعر کے سر پر چمکنے کا شرف حاصل ہوگا جس کا قد جوشؔ اور فراقؔ دونوں ہی سے بلند ہو۔ ایسا کب ہوگا یہ نہیں کہا جا سکتا مگر ہوگا ضرور، کیونکہ زندگی، تاریخ، تہذیب اور ثقافت کا قافلہ کسی منزل پر رکا نہیں کرتا۔

انور احسن صدیقی

کراچی

نذرِ جوش

وہ ہم سرِ آفتاب چہرہ — وہ دھوپ سا بے حجاب چہرہ
حیرت کدۂ صفات آنکھیں — آئینۂ کائنات آنکھیں
گم اِن کا سُراغ ہو چکا ہے

جو زہرِ خزاں کو پی کے مہکا — ہر گل جہاں آگ بن کے دہکا
شعلوں کی طرح شگوفے چٹکے — شبنم کے شرار جس میں دمکے
تاراج وہ باغ ہو چکا ہے

سنتا تھا جو کہکشاں کی آواز — وہ کوکب و مہر و مہ کا ہمراز
لاتا تھا جو آسماں سے چن کر — لفظوں میں دھنک کے رنگ بن کر
ساکت وہ دماغ ہو چکا ہے

ہر سنگِ ستم کا جو ہدف تھا — جو گوہرِ صدق کا صدف تھا
ہر خشتِ ہوس پہ تھا جو بھاری — ہر آہ، اجل کی ضرب کاری
ٹکڑے وہ ایاغ ہو چکا ہے

ہر ورطۂ بادِ صبح گاہی — دیتا ہے بچشمِ نم گواہی
خود اپنے لہو میں غرق ہو کر — چپ چاپ جلا کیا جو شب بھر
اب گل وہ چراغ ہو چکا ہے

فہمیدہ ریاض

نذرِ فراق

اے دلِ کافر عجز سے منکر آج ترا سر خم کیوں ہے
تیری رسیلی شریانوں میں یہ بے بس ماتم کیوں ہے
آنکھ تو رونا بھول گئی تھی پھر ہر منظر نم کیوں ہے

مت روکو بہنے دو آنسو کسی کو کرتے ہیں پرنام
آج جھکا ہے جھکنے دو سر چھپا تھا اس میں کوئی سلام
شاید اس کے حضور میں ہو تم جس کو کہتے ہیں انجام
یہ ہستی کی سرحد آخر ہوا جہاں ہر سفر تمام
بے بس ہے انساں بے بس ہے، بیتی رہ گئی روتی شام
اُٹھ گیا کوئی بھری دنیا سے باقی رہے خدا کا نام

یا پھر کاغذ پر پرچھائیں، ملے گا جس کو تختِ دوام
یہ ٹکڑے انسانی دل کے شاعر اور شاعر کا کلام
ناز کروں گی خوش بختی پر میں نے فراق کو دیکھا تھا
اُجڑے گھر میں دو تہذیبوں کے سنگم پر بیٹھا تھا
گرم ہم آغوشی صدیوں کی ہو گی کتنی پیار بھری
جس کی باہنوں میں کھیلی تھی اس کی سوچ کی سندرتا
شعر کا دل شفاف تھا اتنا جیسے آئینۂ تاریخ

کیا بھرپور وصال تھا جس نے اس شاعر کو جنم دیا
ہند کی وہ واحد سچائی اندھوں کو جو نظر نہ آئی
بنے وہ کیوں پرچارک اس کا جو خود اس کو جیتا تھا
گر تاریخ نے پاگل ہو کر خود اپنا سر پھوڑا ہے
خون اُچھالا ہے گلیوں میں اپنا ہنڈولا توڑا ہے

باتوں میں معصوم مہک تھی آنکھوں میں بے چین لپک
خاموشی کے وقفے یوں جیسے اس نے کچھ دیکھا تھا
پیڑ بہت جھیل تھی اس نے اتنی بات تو ظاہر تھی
لہجے میں شوخی تھی ایسے راکھ میں جیسے انگارا
سنگم کے پانی پہ میں نے دیکھی تھی کیسی تصویر
اُڑا ایک کراک جُل پنچھی کھینچ گیا پانی پہ لکیر
جمنا کی نیلی گہرائی بھید بھری چُپ سے بوجھل
گنگا کے دھارے کی جنبش اُجلی، طاقتور، بیکل
اس پانی میں عکس ڈالتا آسمان کا اک ٹکڑا
مٹی کے بُت، ہرے ناریل، چندن لگا کوئی مکھڑا
دو دھاروں پہ ناؤ کھیتا سوکھا پنجر مانجھی کا
دان کے پیسے گنتا پنڈت تانبا سورج سانجھی کا
جمنا پر مینار کھڑے تھے، گنبد کا ترچھا سایہ
پاکستان سے آئے مہاجر گنبد کے کی گنتی مالا!
ان میں چیتو کی شپ شپ اور باتوں کے ٹوٹے ٹکڑے
یہیں کہیں پہ ہم سے اوجھل سرسوتی بھی بہتی ہے
جو سمجھیں جو آگے سمجھوں چھلک رہا ہے دل کا جام
وہ منظر جو خود سے بڑا تھا اس کا جھیل تمہارے نام
درد ہے آج بہت پہلو میں اب تم سب سے اوجھل ہو
لیکن ہر زندہ آہٹ کچھ کہتی ہے وشواس کرو
پورا حال نہیں بتلاتا گونگے آنسو رو دینا
تیری دھرتی سہہ نہ سکے گی اتنے حسن کو کھو دینا
تنہا اور اپاہج بوڑھے، تجھے نہ مرنے دیں گے لوگ
ابھی تو جیون بانجھ نہیں ہے پھر تجھ کو جنمیں گے لوگ

جوشؔ ملیح آبادی

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اُکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جُنبش ہے، دَم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سُرخی ہے، بے نُور ہے چہرہ سُلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو رُوحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی، سینوں سے جو خُون چرایا کرتے تھے
اِک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اِک روز اِسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو، کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

جوش ملیح آبادی

فتنۂ خانقاہ

اِک دن جو بہرِ فاتحہ اِک بنتِ مہر و ماہ
پہنچی نظر جھکائے ہوئے سوئے خانقاہ
زُہّاد نے اُٹھائی جھجکتے ہوئے نگاہ
ہونٹوں میں دب کے ٹوٹ گئی ضربِ لا اِلٰہ
برپا ضمیرِ زُہد میں کہرام ہو گیا
ایماں، دلوں میں لرزہ بر اندام ہو گیا

یُوں آئی ہر نگاہ سے آوازِ الاماں
جیسے کوئی پہاڑ پہ آندھی میں دے اذاں
دھڑکے وہ دِل کہ رُوح سے اُٹھنے لگا دُھواں
جلنے لگیں شیوخ کے سینوں پہ داڑھیاں
پرتو فگن جو جلوۂ جانانہ ہو گیا
ہر مرغِ خلد، حُسن کا پروانہ ہو گیا

اُس آفتِ زمانہ کی سرشاریاں، نہ پوچھ
نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ
رُخ پر ہوائے شام کی گُل باریاں، نہ پوچھ
کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں، نہ پوچھ
عالم تھا وہ خرام میں اُس گلعذار کا
گویا نزول رحمتِ پروردگار کا

گردن کے لوچ میں خمِ چوگاں لیے ہوئے
چوگاں کے خم میں گردشِ دل و جاں لیے ہوئے
رُخ پر لٹوں کا ابرِ پریشاں لیے ہوئے
کافر گھٹا کی چھاؤں میں قرآں لیے ہوئے
آہستہ چل رہی تھی عقیدت کی راہ سے
یا تو نکل رہی تھی دلِ خانقاہ سے

آنکھوں میں آگ، عشوۂ آہن گداز کی
لہریں، ہر ایک سانس میں سیلابِ ناز کی
بلّٹیں ہوا کے دوش پہ زلفِ دراز کی
آئینے میں دمک رُخِ آئینہ ساز کی
آغوشِ مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر، کاکلِ شبگوں کے دام میں — موجیں شرابِ سُرخ کی آنکھوں کے جام میں
رنگِ طلوعِ صُبح، رُخِ لالہ فام میں — چلتا ہُوا شباب کا جادو خرام میں
انساں تو کیا، یہ بات پری کو ملی نہیں
ایسی تو چال کبکِ دری کو ملی نہیں

ڈولی ہوئی تھی جُنبشِ مژگاں شباب میں — یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق کہ نمی تھی گلاب میں — یا اوس موتیے پہ شبِ ماہتاب میں
آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

ہات اُس نے فاتحہ کو اُٹھائے جو ناز سے — آنچل ڈھلک کے رہ گیا زُلفِ دراز سے
جادو ٹپک پڑا نگہِ دل نواز سے — دِل ہل گئے جمال کی شانِ نیاز سے
پڑھتے ہی فاتحہ جو وہ اِک سمت پھر گئی
اِک پیر کے تو ہات سے تسبیح گر گئی!

فارغ ہوئی دُعا سے جو وہ شمعِ حرم — کانپا لبوں پہ سازِ عقیدت کا زیر و بم
ہونے لگی روانہ بہ اندازِ موجِ یم — انگڑائی آ چلی تو بہکنے لگے قدم
انگڑائی فرطِ شرم سے یوں ٹوٹنے لگی
گویا صنم کدے میں کرن پھوٹنے لگی

ہر چہرہ چیخ اٹھا کہ تیرے ساتھ جائیں گے — اے حُسن، تیری راہ میں دھُونی رمائیں گے
اب اِس جگہ سے اپنا مُصلّا اٹھائیں گے — قربان گاہِ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تری بارگاہ میں

سُورج کی طرح، زُہد کا ڈھلنے لگا غرُور — پہلوئے عاجزی میں مچلنے لگا غرُور
رہ رہ کے کروٹیں سی بدلنے لگا غرُور — رُخ کی جوان لَو سے پگھلنے لگا غرُور
ایماں کی شان عشق کے سانچے میں ڈھل گئی
زنجیرِ زُہد سرخ ہوئی، اور گل گئی!

پل بھر میں زُلفِ لیلیٰ تمکیں بگڑ گئی ۔۔۔ دَم بھر میں پارسائی کی بستی اُجڑ گئی
جس نے نظر اُٹھائی، نظر رُخ پہ گڑ گئی ۔۔۔ گویا ہر اِک نگاہ میں زنجیر پڑ گئی

طُوفانِ آب و رنگ میں زُہّاد کھو گئے
سارے کبوترانِ حرم ذبح ہو گئے

زاہد حدودِ عشقِ خُدا سے نکل گئے ۔۔۔ انسان کا جمال جو دیکھا پھسل گئے
ٹھنڈے تھے لاکھ حُسن کی گرمی سے جل گئے ۔۔۔ کرنیں پڑیں تو برف کے تودے پگھل گئے

القصّہ دین، کفر کا دیوانہ ہو گیا
کعبہ ذرا سی دیر میں بُت خانہ ہو گیا

جوش ملیح آبادی

نظامِ نو

کھیل، ہاں اے نوعِ انساں ان سیہ راتوں سے کھیل
آج اگر تو ظلمتوں میں پا بجولاں ہے تو کیا؟

مسکرانے کے لیے بے چین ہے صبحِ وطن
اور چندے ظلمتِ شامِ غریباں ہے تو کیا؟

چل چکی ہے پیشوائی کو نسیمِ باغِ مصر
آج یوسف مبتلائے چاہِ کنعاں ہے تو کیا؟

اب کھلا ہی چاہتا ہے پرچمِ بادِ مراد
آج ہستی کا سفینہ وقفِ طوفاں ہے تو کیا؟

اٹھنے والی ہے نگارِ صبح داماں کی نقاب
آخرِ شب زحمتِ دردِ فراواں ہے تو کیا؟

ختم ہو جائے گا کل یہ ناروا پست و بلند
آج ناہموار سطحِ بزمِ امکاں ہے تو کیا؟

کھل رہی ہے خندۂ گیتی کی زلفِ خم بہ خم
اس کرے پر آج دامِ چشمِ گریاں ہے تو کیا؟

آ گئیں دل سے تبسم کی شعاعیں تا بہ لب
اشکِ خوں آلود اگر عنوانِ مژگاں ہے تو کیا؟

کل اسی موجِ نفس پر رقص فرمائے گا لحن
آج آہوں سے اگر یہ تار لرزاں ہے تو کیا؟

مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
ابرِ غم زلفِ جہاں پر بال جنباں ہے تو کیا؟

بلبلِ دانش پر افشاں ہے چہکنے کے لیے
آج مرغِ وہم ذہنوں پر غزل خواں ہے تو کیا؟

کل بفیضِ عقل بن جائے گا خالص آدمی
آج ہندو ہے تو کیا پردا مسلماں ہے تو کیا؟

راہ میں ہے کارواں تشکیک اور تحقیق کا — آج اگر نادانیٔ اوہام وایقاں ہے تو کیا؟
ختم ہونے پر ہے تبلیغِ روایات و رسوم — آج اگر تفسیرِ حکمت، جرم و عصیاں ہے تو کیا؟
نصب ہونے ہی پہ ہے میزانِ دیدار و دلیل — حکمراں اس وقت اگر بالغیب ایماں ہے تو کیا؟
کل عجائب خانہ ہوگا اور یہ پیرِ مُردہ سر — آج اگر منبر پہ شیخ "پاک داماں" ہے تو کیا؟
منزلیں طے کر چکا ہے آفتابِ فکرِ نَو — آج اگر رُوحِ قدامت ظلمت افشاں ہے تو کیا؟
کل یہی بندہ الُوہیت سے ہوگا شادکام — آج اگر بیتابِ عبدیت پہ نازاں ہے تو کیا؟
ناز کی محراب میں جلنے پہ ہے شمعِ نیاز — بر سرِ جنگ آج اگر لیلائے دوراں ہے تو کیا؟
جانور کا جانور بھی کل نہ ہوگا مدعی — آج اگر انساں کا انساں دشمنِ جاں ہے تو کیا؟
کل جواہر سے گراں ہوگی لہو کی بُوند بُوند — آج اپنا خُون پانی سے بھی ارزاں ہے تو کیا؟
کُھل رہا ہے وحدتِ اقوامِ عالم کا عَلَم — آج اِنساں مُنکرِ توحیدِ انساں ہے تو کیا؟
سایہ افگن ہے ہیولیٰ برقِ ایواں سوز کا — آج صرفِ کشتِ سلطاں خُونِ دہقاں ہے، تو کیا؟
آسماں کو روندنے والی ہے رقصندہ زمیں — آسماں آج اس زمیں پر آتش افشاں ہے تو کیا؟
آ رہی ہے آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی — آج راون کا محل سیتا کا زنداں ہے تو کیا؟
دستِ غم خواری میں ہوگی کل زمامِ آب و ناں — آج اگر نامہربانی میرِ ساماں ہے تو کیا؟
بن رہا ہے صرصرِ سیلابِ خونِ ہاشمی — آج ابو سفیان کے گھر میں چراغاں ہے تو کیا؟
ہو رہا ہے طبعِ فرمانِ حیاتِ جاوداں — موت اگر اب تک رگِ جاں پر خراماں ہے تو کیا؟
سینۂ خیاطِ عالم میں ہے طرحِ رختِ نَو — آج اگر سلمائے ہستی چاک داماں ہے تو کیا؟

جوشؔ کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رُسوا یہ مردِ نامسلماں ہے تو کیا؟

✶ ✶ ✶

فراقؔ گورکھپوری

کچھ ایسی بات نہ تھی تیرا دور ہو جانا
یہ اور بات کہ رہ رہ کے درد اُٹھتا تھا

نہ پوچھ سود و زیاں کاروبارِ اُلفت کے
وگرنہ یوں تو نہ پانا تھا کچھ نہ کھونا تھا

نہ پوچھ رمز و کنایات چشمِ ساقی کے
بس ایک حشرِ خموش انجمن میں برپا تھا

چمن چمن تھی گُلِ داغِ عشق کی ہستی
اسی کی نکہتِ برباد کل زمانہ تھا

اُمید یاس بنی یاس پھر اُمید بنی
اس اک نظر میں فریبِ نگاہ کتنا تھا

یہ سوز و سازِ نہاں تھا وہ سوز و سازِ عیاں
وصال و ہجر میں بس فرق تھا تو اتنا تھا

فراقؔ گورکھپوری

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات
یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

مایوسیوں کی گود میں دم توڑتا ہے عشق
اب بھی کوئی بنا لے تو بگڑی نہیں ہے بات

اک عمر کٹ گئی ہے ترے انتظار میں
ایسے بھی ہیں کہ کٹ نہ سکی جن سے ایک رات

ہم اہلِ انتظار کے آہٹ پہ کان تھے
ٹھنڈی ہوا تھی، غم تھا ترا، ڈھل چلی تھی رات

یوں تو بچی بچی سی اُٹھی وہ نگاہِ ناز
دنیائے دل میں ہو ہی گئی کوئی واردات

اُس جا تری نگاہ مجھے لے گئی جہاں
لیتی ہو جیسے سانس یہ بے جان کائنات

ہم اہلِ غم نے رنگِ زمانہ بدل دیا
کوشش تو کی سبھی نے مگر بن پڑی نہ بات

فراق گورکھپوری

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گذر آئی

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن !
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی
اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

عجب نہیں کہ چمن در چمن بنے ہر پھول
کلی کلی کی صبا جا کے گود بھر آئی

شبِ فراقؔ اُٹھے دل میں اور بھی کچھ درد
کہوں یہ کیسے تری یاد رات بھر آئی

احسان دانشؔ

دیہات کی شام

سرخ مے برسا رہا تھا شام کا رنگیں شباب
جھک رہا تھا دور کھیتوں کے کنارے آفتاب

سرنگوں تھیں ٹہنیاں شرمارہے تھے سبزہ زار
آرہی تھیں نیند کی پریاں ہواؤں پر سوار

دامن شب میں چھپی جاتی تھی فطرت کی اُمنگ
چھڑ رہی تھی آبشاروں میں سہانی جل ترنگ

آچکی تھیں گاگریں بھر کر حسیں پنہاریاں
اُٹھ رہا تھا گاؤں کے کچے مکانوں سے دھواں

بند کیں ذرّوں نے آنکھیں اور لہریں رُک گئیں
رفتہ رفتہ شام کی دیوی کی آنکھیں جھک گئیں

راستوں میں ظلمتوں کے سانپ بل کھانے لگے
پست چرواہے چراگاہوں سے گھر آنے لگے

آسماں کے سرخ جلوؤں پر سیاہی آ گئی
جھٹپٹا سا ہو کے عالم پر اداسی چھا گئی

اوڑھ کر اک قیرگوں چادر بیاباں سو گیا
سبز کھیتوں پر خنک سایہ مُسلط ہو گیا

خامشی پر رنگ آیا شورشِ عالم گئی
آسماں پر انجمِ تاباں کی محفل جم گئی

شام کے اندھیر میں دن کا اجالا کھو گیا
آگ کے چوگرد دہقانوں کا جمگھٹ ہو گیا

ہالیوں کو مل گیا دن بھر کی محنت سے فراغ
ٹمٹمایا گاؤں کی چوپال میں دھندلا چراغ

مشورے ہونے لگے نشو و نما کے باب میں
سادہ خاطر بہ چلے تقریر کے سیلاب میں

یہ ہیں وہ جن پر تغافل کارگر ہوتا نہیں
جن کے دل میں کبر و نخوت کا گزر ہوتا نہیں

جن کی گردِ رہ گزر ہے غازۂ روئے بہار
جن کا شانہ روز سلجھاتا ہے زلفِ روزگار

جن کی فطرت سے ہوس ناکی ہے فرسنگوں پرے
شہریوں سے جن کے کھوٹے بھی نکلتے ہیں کھرے

بازوؤں پر جن کے نازاں فطرتِ گلشن طراز
کاوشوں سے جن کی حسنِ انجمن مائل بہ ناز

واہ رے دیہات کی سادہ تمدن کی بہار
سادگی میں بھی ہے کیا کیا تیرا دامن زر نگار

دل یہ کہتا ہے فراقِ انجمن سہنے لگوں
شہر کی رنگینیاں چھوڑوں یہیں رہنے لگوں

حسن عابدی
کراچی

غلام عباس۔ ایک تاثر

عباس صاحب کو میں نے پہلے پہل یہیں کراچی میں دیکھا، ادبی محفلوں میں اور وہ بھی دور سے دیکھا اور اب رنج ہوتا ہے کہ دیر سے دیکھا۔ وہ حکومتِ پاکستان کے نشریاتی ادارے کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے۔ اور ایک ریٹائرڈ سرکاری ملازم عام طور پر جس وضع کا پابند اور جس طرزِ زندگی کا عادی ہوتا ہے اور جیسے خیالات رکھتا ہے، اسے قیاس کرنا زیادہ مشکل نہیں، اور عباس صاحب تو ویسے بھی ادبی محفلوں میں صفِ اولین کی شخصیت تھے۔ میرے لیے ان سے قریب ہونا اس طور بھی ممکن نہ تھا۔ لیکن جب میں انہیں اپنی چھوٹی سی موٹر سائیکل پہ نرسری سے گذرتے ہوئے دیکھتا یا کبھی ڈاکخانے میں، کبھی بنک کے کاؤنٹر پہ، کبھی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کی ریڑھی کے سامنے یا پرانی کتابیں کھنگالنے کے لیے فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھے ہوئے پاتا تو وہ مجھے اپنے تصوّر کے برعکس ایک مختلف آدمی لگتے۔ عباس صاحب کے ساتھ یہ میرا ایک طرفہ تعارف تھا۔ اور زمانہ یہی کوئی سنہ ۱۹۶۹ء کے لگ بھگ کا۔

انہی دنوں کچھ دوستوں نے جن میں ناٹک کے علی احمد صاحب پیش پیش تھے، شاہراہ فیصل پر ایوانِ دوستی کے بالمقابل جہاں پہلے ناٹک کا دفتر تھا، ادبی نشستوں کا اہتمام کیا تو ایک اجلاس میں عباس صاحب نے افسانہ پڑھا۔ ٹھہر ٹھہر کر دھیمے لہجے میں وہ افسانہ پڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وقت گذرنے کا احساس جاتا رہا۔ دراصل وہ تھے ہی دھیمے لہجے کے آدمی۔ افسانہ ختم ہوا تو یوں لگا جیسے

اچانک ختم ہوا ہے، پھر سر اٹھایا تو یوں لگا جیسے سورج بھی اچانک ہی غروب ہوا ہے، ورنہ ذرا دیر پہلے برآمدے میں اچھی خاصی دھوپ تھی۔

افسانے کا موضوع امرتسر میں کرفیو کا نفاذ اور انگریز حاکموں کے استبداد کے باوجود سرپھرے نوجوانوں کی شوریدہ سری تھی۔ ظالموں نے گلی کوچوں میں پہرے بٹھا رکھے تھے، پھر بات کچھ یوں ہوئی کہ چند نوجوانوں میں ٹھن گئی اور انہوں نے حاکموں کی دی ہوئی سزا کو ایک چیلنج بلکہ انعام سمجھ کر قبول کیا اور گلی کا ناہموار راستہ زمین پر رینگ کر طے کیا۔ پوری کہانی تو یاد نہیں اور نہ اب اس کا عنوان یاد ہے، لیکن اس افسانے کے حوالے سے عباس صاحب مجھے اور بھی اچھے لگے۔ استبداد کے خلاف نوجوانوں کی رندانہ سرکشی اور آزادی سے ان کی والہانہ شیفتگی اور کچھ کر گذرنے کے ولولے، ان ساری باتوں نے مل کر مجھے عباس صاحب کو قریب سے دیکھنے پر آمادہ کیا۔ جس کا موقع تو نہ مل سکا کہ ان کی اپنی مصروفیات تھیں اور میری اپنی مجبوریاں، لیکن، اب وہ مجھے اچھے لگنے لگے تھے۔ ویسے سو مجبوریوں کی ایک مجبوری میری اپنی وضع احتیاط ہے۔ آپ سے کیا پردہ بڑے لوگوں سے قریب ہونے میں میرا اپنا انکسار اور حجاب ہمیشہ آڑے آجاتا ہے حالانکہ عباس صاحب میں اب ایسی کوئی "بڑے پن" والی بات بھی نہ تھی۔

سن و سال گذرنے کے ساتھ جب حافظہ کمزور اور قویٰ مضمحل ہوتے ہیں تو ادیب کی تخلیقی صلاحیت کا سوتا خشک ہونے لگتا ہے پھر وہ لکھنا کم کر دیتا ہے یا بسیار نویس ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دہراتا ہے لیکن عباس صاحب کو میں نے دیکھا کہ سن و سال کی رعایت سے وہ جیسے جیسے بوڑھے ہو رہے تھے ان کا فن جوان ہو رہا تھا۔ شاید یہ بات ہو کہ انہوں نے مطالعہ کے علاوہ زندگی کی سرگرمیوں سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا تھا۔ نوعمری اور نوجوانی کا زمانہ انہوں نے سخت کوشش میں گزارا۔ پہلے ریلوے میں ایک چھوٹی سی نوکری کی پھر ادبی رسائل سے منسلک رہے۔ اس عرصے میں مسلسل لکھا اور بے حساب ترجمہ کیا، اس سے جہاں انہیں مغرب کے فکشن سے استفادے کا موقع ملا، وہیں اپنا اسٹائل بنانے میں مدد ملی۔ ان کی نثر میں جو پختگی اور رچاؤ ہے وہ اسی ابتدائی مشق اور مسلسل کاوش کا نتیجہ ہے۔ زندگی اور فن سے اس قرب کی بدولت وہ مجھے کبھی بوڑھے نہیں لگے۔ جہاں تک میرے علم میں ہے انہوں نے احباب سے ضعف اور بیماری کی شکایت نہیں کی۔ یاد آتا ہے کہ اپنی وفات سے کچھ عرصہ پہلے موٹر سائیکل پر سوار، نرسری سے گذرتے ہوئے دکھائی دیئے تھے عباس صاحب نے بھرپور زندگی گذاری، یکسوئی سے مطالعہ کیا۔ ادبی محفلوں میں التزام سے شرکت کرتے رہے شطرنج کے رسیا تھے۔ اپنی پسند کے لوگوں کو گھر بلا کر خوش ہوتے۔ نہ بہت زیادہ محفل آرائی کے

شوقین تھے، نہ گوشہ گیر اور کم آمیز۔ جو اعتدال اور رکھ رکھاؤ اور ایک خاص طرح کی میانہ روی ان کے فن میں نظر آتی ہے، وہی ان کی زندگی میں تھی۔ ان کا افسانہ "آنندی" بہت پہلے پڑھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس نام کو غلام عباس کے نام سے بھی زیادہ شہرت مل گئی تھی۔ پھر ان کے دوسرے افسانے پڑھے۔ اوورکوٹ، بندر والا اور بھنور جن کا تاثر دل پر نقش ہو کر رہ جاتا ہے ان افسانوں سے ظاہر ہے کہ عباس صاحب، انسانوں سے ان کے تمام عیب و ہنر سمیت محبت کرتے تھے۔ وہ افراد کی کوتاہیوں پہ کڑھنے اور ان کی مجبوریوں پر طنز کرنے یا معاشرے کی ناہمواریوں پر دشنام کے کوڑے برسانے کے بجائے نہایت چابکدستی اور سادگی سے وہ حالات بیان کر دیتے جن میں انسان اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود خود کو بے دست و پا پاتا ہے اس لیے کہ ہمارے معاشرے کی بنیادی ساخت ہی ایسی ہے مثلاً "بھنور" کے ریٹائرڈ ہیڈ کلرک کی کہانی ہے جو بڑی دل سوزی اور دردمندی سے اصلاحِ معاشرہ پر تلے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ طوائفوں کے کوچے میں جا پہنچے اور بالآخر ایک طوائف کو راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسے بیٹی بنا کر گھر میں رکھا پھر بڑے چاؤ سے اس کے ہاتھ پیلے کیے، لیکن زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ بیٹی کو اپنے منہ بولے باپ کے گھر آنا پڑا۔ اب کے انہوں نے دوسری جگہ شادی کی، لیکن بدقسمتی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، اور ابھی بڑے میاں مسلسل ناکامی کے صدموں سے بحال نہ ہوئے تھے کہ اس عورت کی بہن بھی تائب ہو کر کوٹھے سے اتری اور اس گھر میں آ گئی۔ کیسی کیسی بندشیں اور مجبوریاں ہیں جن میں انسان جکڑا ہوا ہے۔ خطبوں سے اور پند و نصائح سے اگر معاشرے کو بدلا جا سکتا تو پھر بات ہی کیا تھی لیکن افسوس کہ ایسا ممکن نہیں، کسی بنیادی اور بڑی تبدیلی کے بغیر ہم انسانوں کو ایسے مصائب سے نجات نہیں دلا سکتے جو بظاہر اس کا مقدر بن گئے ہیں۔

بھنور میں بھی مجھے عباس صاحب کا طرزِ فکر بڑا صحت مندانہ لگا۔ باقی رہا ان کا طرزِ بیان تو اس کی بات ہی اور تھی۔ وہ افسانہ شروع کرتے تو اس کے انجام کو جیسے ہاتھ کی مٹھی میں چھپائے رکھتے اور پھر اپنا بیان ختم کرتے کرتے اچانک مٹھی کھولتے تو آنکھیں چکاچوندھ ہو جاتیں۔

عباس صاحب سے ہماری آخری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔ یہ ان کی وفات سے چند ہی روز پہلے کی بات ہے۔ مشہور صحافی اور مرحومہ خدیجہ مستور کے شوہر ظہیر بابر صاحب اور ان کی بیٹی کرن کو انہوں نے بڑے چاؤ سے اپنے گھر پر بلایا تھا۔ دراصل ہم لوگ اردو مرکز لندن کے گوشۂ خدیجہ مستور کے لیے کتابیں جمع کر رہے تھے۔ افسانہ نگار کا نذر الور یہاں بھی ہمارے کانڈکٹر تھے۔ عباس صاحب تپاک سے ملے۔ انہوں نے ہمیں چائے پر بلایا تھا۔ اور جب ہم پانچ افراد چائے کی میز کے گرد بیٹھے اور نوکر

نے میز پر سامان سجایا تو عباس صاحب نے سموسے کا لفافہ اپنے ہاتھ سے کھولا اور چٹنی کے لیے پرچ منگوائی۔ یعنی وہ جو متوسط طبقے کے عزت دار لوگوں کا قرینہ ہوتا ہے کہ مہمان کی آمد سے پہلے یا اگر وہ نازل ہو ہی گیا ہے تو پردے کی آڑ میں کھانے کا سامان خوبصورت کراکری میں تکلّف سے سجاتے ہیں، تو یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ پیالیوں میں چائے سب کے لیے کرن نے بنائی۔ پھر ہم میز سے اٹھ کر صوفوں پر آ گئے۔ عباس صاحب کی اپنائیت اور خلوص کا اندازہ اس شام عجب تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سہ پہر انہوں نے صرف ہمارے انتظار میں گذاری ہو۔ کرن سے باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھیں وفور محبت سے بھیگ جاتیں۔ انہوں نے ہمیں اپنی تمام کتابیں دیں یہاں تک وہ کتاب بھی جس کا کوئی ایک نسخہ ان کے پاس بمشکل بچا تھا اور اپنی کہانیوں کا کیسٹ بھی دیا۔ یہ تحفہ خاص کرن کے لیے تھا۔

پھر چند ہی دن گذرے تھے جب ایک صبح ہم نے عباس صاحب کی وفات کی خبر سنی۔ کرن اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ مرحومہ خدیجہ مستور کی وفات کا زخم جو ابھی کچا تھا۔ پھر رسنے لگا تھا۔ یہ وہی عباس صاحب تھے۔ جو کراچی ائرپورٹ پر خدیجہ مستور کے تابوت کے آنے کی خبر سن کر بے اختیار وہاں جا پہنچے تھے لیکن اپنے جنازے میں شرکت کے لیے انہوں نے بہت تھوڑے سے لوگوں کو زحمت دی۔ رات ایک بجے انتقال کیا۔ خبر کہیں چھپی، کہیں نہیں چھپی اور بہت سے لوگ اس وقت پہنچے جب ادیبوں کی ایک مختصر سی ٹولی انہیں سپردِ خاک کر کے واپس آ رہی تھی۔ ★

غلام عبّاس

دو تماشے

مرزا برجیس قدر کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ ہر چند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا، پھر بھی ہم دوست تھے۔ مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا مگر اب اس کی حالت اس پرانے تناور درخت کی سی ہو گئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آ رہتا ہے۔

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا مگر اس کو روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا اس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لئے درشت مزاجی اور تحکم لازمی ہیں۔ اس خیال نے اسے سخت دل بنا دیا تھا، مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی۔ اندر سے مرزا بڑا نرم تھا اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور مرزا برجیس قدر انارکلی میں اس کی شاندار موٹر میں بیٹھے ایک مشہور جوتے والے کی دوکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے۔ مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لئے یہ ضروری سمجھا تھا کہ وہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دوکان کے مالک کو پکارے اور جوتے اپنی موٹر ہی میں ملاحظہ کرے۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی۔ اور دوکاندار عام طور پر اس کی ان اداؤں کو سہنے کے عادی تھے چنانچہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیئے۔

مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا، اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو سخت سست

کہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لئے ہے۔

میں اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ بڈھا اندھا تھا لڑکی کے بالوں میں تنکے الجھے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا جیسے مدت سے کنگھی نہیں کی گئی دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے۔

"اندھے پر ترس کھاؤ رے بابا" بڈھے نے ہانک لگائی۔

"بابو جی میں بھوکی ہوں پیسہ دو" لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا۔ اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا اس پر مرزا نے ایک غلط انداز نگاہ ان پر ڈالی اور کہا۔

"معاف کرو، معاف کرو"

بھکاری اب بھی نہ ٹلے۔

"بابو جی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے" اندھے نے کہا۔

بابو جی بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ پیٹ میں کچھ نہیں ہے۔ تو دیکھو"۔ بچی نے کہا اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھانے لگی لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جا سکتی تھیں "بس ایک پیسے کے چنے بابو جی"

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔

"توبہ توبہ" اس نے بیزاری کے لہجہ میں کہا۔ "بھیک مانگنے کے لئے کیا کیا ڈھونگ رچائے جاتے ہیں، جاؤ جاؤ خدا کے لئے معاف کرو"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے۔ قریب تھا کہ مرزا غصے سے بھنا جاتا مگر یہ تماشا اس طرح ختم ہو گیا کہ مرزا کو اس دکاندار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا اور وہ اپنی موٹر کو وہاں سے بڑھا لے گیا۔

اس واقعہ کے چند روز بعد میں اور مرزا برجیس قدر شہر کے ایک بڑے سینما گھر میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے فلم بہت گھٹیا تھی۔ اس میں بڑے نقص تھے مگر ہیروئن میں بڑی چنچل مٹک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا کہانی بڑی دقیانوسی تھی۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا ہے جو اپنی بوڑھی دادی کے

پاس رہتا ہے۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر یہ دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں ادھر کوٹھری کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انہیں گھر سے نکال دیتا ہے۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے۔ وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے۔

"بابو جی ہم بھوکے ہیں۔"

"ایک پیسے کے چنے لے دو بابو جی۔" لڑکا کہتا۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی تو مرزا ابر جس قدر سنے اندھیرے میں مجھ سے کہا۔

"بھیا ذرا اپنا رومال تو دینا نہ جانے میرا کہاں گیا۔"

میں نے اپنا رومال دے دیا۔

جب تک تماشہ ہوتا رہا میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا۔ اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

"ایں مرزا صاحب" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ رو رہے تھے۔؟"

"نہیں تو۔" مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

سگریٹ کے دھوئیں سے آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔۔۔۔۔ ابھی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسی دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔

خدیجہ مستور

بھورے

محمد بھورے ولد محمد بوٹے کے دماغ میں کوئی خلل پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب کا متفقہ فیصلہ تھا مگر مس لال خاں
ہاؤس سرجن کا خیال تھا کہ ان کے دماغ میں کوئی خلل نہیں ہے کیونکہ وہ بقائمی ہوش و حواس تمام کام انجام دیتا ہے۔
اگر گھنٹے کی آواز سے اس پر بے چینی طاری ہو جاتی ہے تو یہ کوئی جذباتی معاملہ ہے۔

محمد بھورے سے اس معاملے میں تقریباً سبھی نے پوچھ گچھ کی مگر جواب میں اس نے ہمیشہ دانت نکال دیئے
اور اس طرح ہنسا جیسے سب کو چڑا رہا ہو۔ مس لال خاں نے اس معاملے میں بھورے سے بڑی رازداری کے
ساتھ معلومات حاصل کرنی چاہیں مگر وہ ان کی ہمدردی اور خلوص کو بھی بڑی بے اعتنائی سے ٹال کر صرف تنہا
رہ گیا۔ آخر کار مس لال خاں کا بھی خیال بدل گیا اور انہیں بھی ماننا پڑا کہ یہ خلل ہے مگر محض لمحاتی، جو گھنٹے کی آواز
سے پیدا ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے اس لئے بھورے بے ضرر سا انسان ہے اور اسے اپنی ملازمت پر موجود
رہنا چاہیے۔

محمد بھورے اپنی ملازمت پر موجود رہا مگر یہ کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ یہ ایک کہانی ہے جو بھورے کسی کو نہیں
بتانا چاہتا اور وہ اس کہانی کے ایک حصے ہی مسرت انگیز انجام کا منتظر ہے۔ یہ کہانی اس طرح ہے کہ۔۔۔

سیتاپور کا مہاجر محمد بھورے اس زنانہ امراض کے اسپتال میں آٹھ سال سے کام کر رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی اسپتال
کے اس ٹیلی فون پر لگی ہوئی تھی جو ہاؤس سرجنوں اور ٹریننگ حاصل کرنے والی لڑکیوں کے لئے وقف تھا۔ دوسرا
ٹیلی فون جو دوسری طرف تھا، مریضوں اور ان کے سرپرستوں کے لئے وقف تھا۔ دونی ڈبے میں ڈال کر جس کا جی
چاہے فون کرلے۔ اس دوسری طرف ہر وقت بھڑ سا مچا رہتا۔ اس کے باوجود ٹیلی فون کا چپڑاسی پرائیویٹ
کمروں کے مریضوں کو پیغام بھی پہنچا دیتا اور مریض خوش ہو کر اسے انعام بھی دے دیا کرتے۔ اس طرح خاصی آمدنی
ہو جاتی مگر بھورے اس آمدنی اور اس ٹیلی فون، دونوں سے توبہ کرتا تھا۔ اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ اس

کی ڈیوٹی دوسرے ٹیلی فون پہ تبدیل کر دی جائے۔ وہاں پر قریبی لیبر روم سے آتی ہوئی چیخیں صاف سنائی دیتیں۔ سب بدحواس سے نظر آتے مگر یہاں اس طرف بڑی بڑی محرابوں والے برآمدے میں ہر طرف سکون طاری رہتا۔ سامنے وسیع لان کے درختوں پر چڑیاں چہکا کرتیں۔ گرمیوں میں لُو کے گرم جھونکے بھی برآمدے تک آتے آتے ٹھنڈے ہو جاتے۔ سردیوں میں چمکیلی دھوپ گھنٹہ دو گھنٹے برآمدے میں لوٹتی رہتی، اور برسات میں جب چھم چھم بارش ہوتی تو کبھی کبھی بوچھار برآمدے کی محرابوں سے داخل ہو کر بھورے کے قدموں کو بھگو جاتی۔ یہاں کے سناٹے کے اور بھی بہت سے فائدے تھے۔ یہاں وہ آزادی سے جواں آیاؤں اور بوڑھی آیاؤں کی لڑکیوں سے عشق لڑا لیتا تھا۔ اتوار اتوار فلموں کے میٹنی شو دیکھنے کی وجہ سے اس کو عشق کرنے کے ہزاروں طریقے معلوم ہو گئے تھے۔ تنخواہ کا آدھا حصہ تحفوں میں خرچ کرنے کے بعد بھی بھورے کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی اس کی زندگی میں صرف اس چیز کی کمی تھی کہ اس کی محبوبائیں فلمی ہیروئنوں کی طرح نہ تو اس سے محبت کرتی تھیں اور نہ باوفا تھیں بلکہ ویمپوں کی طرح بے وفا اور ہرجائی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور بہت سوں سے بھی تحفے وصول کر لیتی ہیں، وہ اپنی محبوباؤں کو جی جان سے بدمعاش سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس نے اب تک شادی نہ کی تھی اور نہ اسے شادی کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مہاجر بننے کے بعد شادی کا تصور اس کے ذہن میں دھندلا کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب بندر بارش میں بھیگتا ہے تو اسے گھر بنانے کا خیال آتا ہے مگر بھورے انسان تھا اور بارش سے سر بچا سکتا تھا اس لئے اسے گھر بنانے کی کیوں فکر ہوتی۔ ویسے بھورے کو شادی سے نفرت بھی نہ تھی البتہ شادی کرنے کے لئے جس قسم کی پاک دامن اور محبت کرنے والی بی بی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اب تک نظر نہ آئی تھی۔ اس لئے وہ زندگی سے خوش اور مطمئن تھا۔ مقدور بھر عیش کر رہا تھا۔ ملازمت میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی سارا دن میلی پرانی آرام کرسی پر پڑا فون ریسیو کرتا یا پھر گایا کرتا۔ جب وہ سیتا پور میں تھا تو راتوں کو اپنی ٹولی کے ساتھ تھالی بجا کر ماہیے گایا کرتا تھا۔ اس کے ساتھی اس کی سپاٹ آواز کی تعریف کرتے تھے۔ یہ وہی تعریف تھی جس نے آج تک اس کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ نئے فلمی گانوں سے اسے بڑی نفرت تھی وجہ یہ تھی کہ بڑی کوشش کے باوجود وہ ان ٹیڑھے میڑھے فلمی گانوں کی دھن نہ اتار سکا تھا۔ ان دھنوں کی نقل کرتے ہوئے اس کی آواز جواب دے جاتی اس لیے اسے اپنے وہی پرانے گانے جی جان سے پیارے تھے۔ سیتا پور چھوڑے دس سال ہو گئے تھے۔ مگر وہ ان گیتوں کا ایک آدھ بول ہی بھول سکا تھا۔

لاہور میں بھورے بالکل اکیلا تھا۔ ماں باپ سیتا پور ہی میں مر چکے تھے اور خالہ جس نے اسے پالا تھا سیتا پور

ہی میں رہ گئی تھی۔ خالہ نے اس کے صرف ایک خط کا جواب دیا تھا۔ اس کے بعد بھورے نے کئی خط لکھے مگر کوئی جواب نہ آیا تو اس نے سمجھ لیا کہ بیچاری بڑھیا بھی کھپ گئی ہوگی۔ ویسے پالو تو جوان ہو ہو کر ستاتے ہیں گرچہ اچھے ہی ہوں گم گشتہ ہو تو فرصت مل جاتی ہے۔ بھورے بھی کچھ اسی طبیعت کا آدمی تھا لیکن جب سے اس کو یہ محبت کا روگ لگا تو دنیا ہی بدل گئی۔ آیائیں اور اس کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا اس کے سامنے مٹک مٹک کر تھک گئیں پر بھورے نے ان کو کوئی تحفہ نہ دیا۔ ایسا ہی اچاٹ ہوا کہ پھر تفریحاً بھی ان پر محبت کی نظر نہ ڈالی۔ رات اس کے کوارٹر میں آنے کا شروع سُنا کر کہتیں تو وہ جیسے بہرہ بن جاتا۔ اس طرح چار مہینوں کے لئے آخر کون پیچھے پھرتا رہتا۔ وہ سب بھی اسے پاگل سمجھ کر چھوڑ گئیں۔

پہلی بار جب اس نے ظہیرن کو بے دردی سے دھتکارا تھا تو بظاہر اسے محسوس نہ ہوا تھا مگر جب وہ ٹھمک ٹھمک کے قدم ڈالتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ذرا ہی دیر بعد بھورے کو ایسا لگا کہ ایک پھانس ہے جو دل کے پاس کھٹک رہی ہے۔

بھورے نے جی بہلانے کے لئے الاپنا شروع کیا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے نہ جبر کھاتے
گلوں میں بیٹھتے گلنار کی ہوا کھاتے

ہُوں — ہُوں — ہُوں — ہُوں — ارے ہاں مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے۔ پھر وہ لمبی سانس لے کر میلی پرانی آرام کی کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ آج جانے ساری فون کرنے والیاں کہاں مر گئیں۔ اس نے اپنی سیکنڈ ہینڈ گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج گئے ابھی تو کلاسیں بھی نہ ختم ہوئی ہوں گی — تم کو تو مسٹر بھورے یوں ہی جلدی مچی رہتی ہے ابھی وقت ہی کیا ہے۔ وہ پاجیوں کی طرح مسکرایا۔ نیچی کرسی پر بیٹھ کر اونچے پر ہاتھ مارنا بھورے کے بس میں نہ تھا مگر نظروں پر کون اونچ نیچ کی چھاپ لگا سکتا ہے۔ فون کرنے والیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں مزے لوٹ لیا کرتا۔

فون کرنے والے بہت سے چہرے اس کے سامنے گھوم گئے۔ اس نے مسرت سے آنکھیں بند کر کے کرسی پر بیٹھنے کے انداز سے پاؤں پھیلا دئے مگر لمحے بعد پھر وہی اکتاہٹ اور افسردگی اس کے دل میں گھمسان کا رن ڈالنے لگیں۔ آج تو کسی خیال سے بھی اسے پہلی جیسی خوشی نہ مل رہی تھی۔ وہ پھر گانے لگا۔

ہوائیں کوچے سے ہر طرح کی ترے آئیں۔ سزائیں دل کے لگانے کی سینکڑوں پائیں

ہاں ہاں ــــــ ہوں ہوں ــــــ

مفت ہوئے بدنام سنوریا تیرے لئے

تیسرا مصرع بیتے ہوئے برسوں نے ذہن سے نکال پھینکا تھا۔

چلی گئی تو کیا ہوگیا؛ ایسی ایسی بہت پھرتی ہیں۔ مسٹر بھورے تم کو کیا کمی ہے؛ مایوسی کے دل میں اس نے مسرت کا جھنڈا لہرانا چاہا اور پھر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس سائڈ پر سالی کیسی خاموشی رہتی ہے۔ آج بھورے کو یہ جگہ بُری معلوم ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ ادھر ہوتا، اس طرف کے ٹیلی فون پر اس کی ڈیوٹی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ ہر وقت آنے جانے والوں کا شور، عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سالے سارے خیال دیال بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، دماغ میں تو حبس بھر جاتا ہے۔ انسان کی ذات سے نفرت ہو جاتی ہے اور یہ عورت ذات کیسی ڈھیٹ ہوتی ہے۔ بچہ جنتے ہوئے کتنا شور مچاتی ہے۔ چیخ چیخ کر کان کھا لیتی ہے جنم جنم کے لئے بچہ پیدا کرنے سے توبہ کرتی ہے اور پھر سال کے اندر پیٹ پھلائے اسی اسپتال میں آتی نظر پڑتی ہے۔ کیسا عجب سا لگتا ہے۔

اور پھر جانے کہاں سے ایک خیال بھورے کے دماغ میں آگھسا۔ جو میں نے ظہوریا سے شادی کر لی ہوتی تو ایک وہ بھی یہاں آتی۔ میں ساری رات لیبر روم کے دروازے پر کھڑا اس کی چیخیں سنتا رہتا۔ چیخ سنتا کر بھاگ کھڑا ہوتا؛ چیخوں سے تو دل دُکھتا ہے۔ بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری۔ جانے کہاں چلی گئی ہو۔ اس عورت ذات کا دل تو دیکھو، اتنی بڑی دُنیا بنا دی اور اس کی کوئی عزت نہیں، کیسا دھتکار دیا تم نے بھورے۔

زور سے گھنٹہ بجنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی اور مریضہ آگئی ہے پہلی طرف کے گیٹ کا چوکیدار سامنے کے لان سے ہوتا اس کی طرف آرہا تھا۔ بھورے اُچک کر کھڑا ہو گیا۔ "کہئے سے آرہے ہو بادشاہو" اس نے ہنس کر ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے وقت بے وقت کے لئے پنجابی کے تھوڑے سے لفظ سیکھ لئے تھے جو وہ اپنی زبان کے ساتھ ملا کر استعمال کر لیا کرتا۔ "آؤ دو سوٹے ہو جائیں۔ سگرٹ کے" بھورے نے جیب سے بگلا سگریٹ کی ڈبیا نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔

"یار تیرے تو مزے ہیں، ٹھاٹھ سے بیٹھا رہتا ہے" چوکیدار نے سگریٹ کا دُھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ "میرے پھاٹک سے ابھی ایک عورت کی لاش گئی ہے۔ بس جی خراب ہو گیا۔ ادھر وہ گئی ادھر دوسری آگئی بچہ جننے"

"ہاں" بھورے نے بجھی سی آواز میں کہا، اسے ایک دم خیال آیا کہ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں بھی مر گئی

تھی۔ یہ بات اس کی خالہ نے اسے بتائی تھی۔

یار یہ عورت ذات کیسی جیالو ہوتی ہے؟ بھورے نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری "لوگ تو یونہی بھی اس عورت ذات کے پیٹ میں بچہ ڈال دیتے ہیں۔ کتنا دکھ جھیلتی ہے یہ عورت" بھورے کا جی بھر رہا تھا۔ اسے پھر ظہوراں یاد آ رہی تھی۔

"جیالو، اُونہہ رہنے دے، یہ عورت ذات بچہ نہ پیدا کرے تو جانو اس پہ ساری دُنیا کا دُکھ پھٹ پڑتا ہے اپنی خوشی سے کرتی ہے، بہر اتنی گندی ہوتی ہے یہ عورت ذات" جو کیلار نے نفرت سے شانے سکوڑے اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر سرگوشی کے انداز سے بولا "بہڑی پوری بوتل لے آیا ہوں۔ دل کرے تو رات میرے کوارٹر میں آ جا، تجھے بھی چاند ستارے دکھا دوں۔

بھورے صرف ہنس کر رہ گیا۔ اس وقت اسے جو کیلار کی کوئی بات اچھی نہ لگی تھی۔ اس وقت تو اسے اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ بھلا ماں کس طرح گندی ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ پینے پلانے کی بات۔ اس نے ایک دن پی تو تھی مگر ذرا سی پی کر گھوم گیا تھا۔ اسی وقت مس زیدی آ گئی تھیں۔ وہ کرسی سے بھی نہ کھڑا ہوا اور بیٹھا گا رہا تھا "کیسے تیار زار ہو سیدھا نوکر لو تیر کو" مس زیدی نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا تھا "تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری رپورٹ ہو گی"

"دارو پلا نے دی اپنے یار نے ماہی وے، مس صاحب" نشے کی حالت میں وہ اردو انگریزی اور پنجابی کے سارے الفاظ بھول گیا تھا اور صرف اپنی مادری زبان یاد رہ گئی تھی۔ مس زیدی کو ایک دم ہنسی آ گئی تھی تو وہ گڑ گڑا کر رونے لگا تھا۔

"آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا، تم تو بہت اچھے ہو بھورے" مس زیدی فون کر کے چلی گئیں تو بھورے اس فکر میں دم بخود بیٹھا رہا تھا کہ کہیں اس کی شکایت نہ ہو جائے مگر مس زیدی نے شکایت کرنے کے بجائے خوب قہقہے لگائے تھے اور سب کو بتایا کہ بھورے پی کر ان کے تیر سیدھے کر رہا تھا۔

ادھر اُدھر کی باتوں کو یاد کرتے کرتے بھورے نے تھک کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔ اوپر کی سیڑھیوں پہ کھٹ کھٹ ہو رہی تھی وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس آواز سے وہ سمجھ جاتا کہ کوئی فون کرنے آ رہا ہے۔ بڑآمدے کے اوپر والی منزل پہ بہت سے کمرے تھے جہاں طالب علم اور ماڈرن مرجن لڑکیاں رہتی تھیں۔ وہ ان سب کے نام اور ہسٹریاں تک جانتا تھا۔ کون کسے فون کرتا ہے۔ کون کس کا دوست ہے۔ کون محبت میں کامیاب ہو گیا ہے اور کون ناکام۔ رات کس نے آنسو بہائے تھے۔ کس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، کون سکون سے سویا تھا۔ کس کا ملنے والا آیا تھا، کون سی

فلم دیکھی تھی۔ شادی کا کب ارادہ ہے۔

مس لال خاں مسکراتی ہوئی فون کے پاس آئیں تو بھورے کھڑا ہو گیا۔ "ہلو، ناصر لعل رہے ہو، بھول جول نہیں بھئی، ہائے ہیں مر گئی تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ اچھا کل ضرور آنا، خدا حافظ۔"

مس لال خاں کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں آپ ہی آپ مندی جا رہی تھیں۔

مس لال خاں کے جانے کے بعد بھورے نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سب یہی کرتے ہیں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں بھورے۔ ظہورِیا کب آئے گی؟ وہ آئے گی تو وہ اسے سینے سے لگا لے گا —— ارے! وہ اپنے اس خیال پر چونک پڑا۔ بھلا اسے یہ خیال آیا ہی کیوں وہ تو خواہ مخواہ اسے یاد کر رہا ہے۔

دکھی آپا کی لڑکی بڑے پھٹے سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ بھورے نے شوق سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ لجاتی ہوئی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بھورے نے ادھر اُدھر دیکھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

"ابھی بازار نہیں گئے، کب لاؤ گے میرا کپڑا؟" وہ اترا رہی تھی۔

بھورے نے اس کے بھرے بھرے جسم پر کئی چٹکیاں لے لیں —— "لا دوں گا ڈیئر۔"

برآمدے کے پرلی طرف کوئی آ رہا تھا۔ لڑکی جیسے بڑی مصروفیت کے ساتھ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور بھورے کو محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت ذرا کھل گئی ہے۔

سکون کی ایک سانس لے کر وہ کرسی پہ پھیل کر لیٹ گیا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل آپا کی لونڈیا کو کچھ نہ کچھ ضرور لا دے گا۔ اسے اپنی انگلیوں میں چٹکیوں کی لذت محسوس ہو رہی تھی۔

ایک بار پھر گھنٹے کی تیز آواز گونجی تو اتنی مشکل سے پیدا کی ہوئی لذت ایکدم رفو چکر ہو گئی۔ اس کا جی دُکھ گیا۔ اسی طرح تو ظہورِیا بھی آتی ہو گی۔ اکیلی پڑی رہتی ہو گی اور کوئی دور دور پوچھنے والا نہ ہوتا ہو گا۔

اس کی نظر برآمدے کے اس ستون کی طرف اُٹھ گئی جو اس کے ٹیلی فون سے تھوڑی دُور تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس وقت بھی ظہورن وہاں لیٹی ہے ——

وہ برسات کی ایک دوپہر تھی۔ اس دن ہوا بند تھی اور سارے اسپتال کے جی گھٹا جا رہا تھا۔ بھورے اپنی کرسی پر بیزار پڑا اونگھ رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ کوئی دبے قدموں اس کے پاس سے گزر گیا ہے۔ اس نے آنکھ کھول دی۔ چوڑی چوڑی نیلی دھاری کی قمیض اور مردانہ سا پاجامہ پہنے جنرل وارڈ کی کوئی مریضہ ستون کے پاس دری کا ٹکڑا بچھا رہی تھی۔ وہ تو سمجھا تھا کہ کوئی اس کی اپنی ہو گی اور ذرا وقت مزے سے گزر جائے گا۔ اس نے بڑی

بے اعتنائی سے مُنہ پھیر کر دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ جنرل وارڈ کی زچائیں گرمی سے گھبرا کر ادھر آجاتیں۔ کمل فضا اور سناٹے میں تھوڑی دیر غفلت کی نیند سو کر چلی جاتیں۔

بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے آسمان پر اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے راہ میں دُھول اڑ رہی ہو۔ سامنے لان میں برسی ہوئی گھاس پر ایک بد بد جانے کیا چگ رہا تھا اور ٹبے اونچے پر کوئی چیل پر پھیلائے اُڑتی جا رہی تھی۔ اسی وقت بھورے نے اُکتا کر آنکھ کھول دی۔ ساری قمیض پسینے سے تر ہو رہی تھی اور وہ عورت بھی اب اُٹھ کر برآمدے کے ستون سے سر ٹکائے بیٹھی جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ بادلوں کے دو چار چھوٹے چھوٹے سیاہ ٹکڑے کہیں دُھوپ سے سرکتے ہوئے سامنے آ گئے تھے۔

عورت ہولے ہولے گانے لگی :-

بنا تیلے ڈولا رکھ دے مسافر آئی ساون کی بہار رے

بھورے نے چونک کر ادھر دیکھا اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ عورت اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔

اپنے محل میں گڑیاں کھیلت تھی سیاں نے بھیجے کہار رے۔

عورت کی آواز ذرا سی اونچی ہو گئی مگر اس کا سر اسی طرح برآمدے کے ستون سے ٹکا ہوا تھا۔ ویسے تو بھورے کو اسپتال میں آ کر بچہ پیدا کرنے والی عورتوں سے ذرا دلچسپی نہ تھی مگر آج جانے کیوں اس عورت کا وجود اس کے لئے کشش کا باعث ہو رہا تھا اس نے سوچا کہ عورت ہوگی مزے دار مگر اس سے اُچک اُچک کر دیکھنے کے باوجود اسے اس کا چہرہ نظر نہ پڑا۔ ستون اس کے چہرے کی آڑ کر رہا تھا۔

بھورے شرارت سے کھنکارا اس وقت وہ بھول گیا تھا کہ اس حرکت پر اس کی شکایت بھی ہو سکتی ہے اسے یقین تھا کہ عورت صرف اسے سنانے کے لئے گا رہی ہے۔ آخر اور بھی تو عورتیں تھیں کمانتی کراہتی آتیں اور لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیتیں۔ گانے کوئی نہ بیٹھتا۔

کھنکارنے کی آواز پر عورت یوں چُپ ہو گئی جیسے سچ مچ ڈولے میں سوار ہو کر سیاں کے گھر چلی گئی ہو۔ چند منٹ تک وہ یوں ہی سر ٹکائے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دری کا ٹکڑا سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بھورے کے پاس سے گذرنے لگی تو اس نے بڑی نفرت سے بھورے کی طرف دیکھا اور پھر ٹھٹک کر کھڑی رہ گئی۔ "ارے تو ستیا پور کا بھورے نا ہیں ہے ؟

" اور تو ٹلیمہ ہے نا ؟"

دونوں کی نظروں میں اضطراب تھا۔ عورت نے شرما کر دوپٹہ ماتھے تک کھینچ لیا اور نظریں جھکا لیں۔ بھورے کرسی سے اُچھلا اور پھر بیٹھ گیا۔ کلیجے پر چوٹ سی لگی۔

وقت نے پلٹ کر دیکھا۔ بھورے کی خالہ نے ظہورن کی پیدائش پر ٹھیکرے میں پیسہ ڈال کر دیا تھا۔ اس طرح ظہورن ساری برادری کی نظروں میں بھورے کی ہو گئی تھی اور جب ظہورن بارہ سال کی ہوئی تھی تو بھورے کو دیکھ کر شرمانے لگی تھی۔ وہ اپنی بھیگتی ہوئی مسوں پر ہاتھ پھیر کر سخت احمقوں کی طرح ہنستا تھا۔ پھر جب ظہورن چودہ پندرہ برس کی ہو گئی تھی تو اپنے ساتھ کھیلنے والی لڑکیوں سے پیغام بھجواتی تھی کہ ظہورن تیرا انتظار کر رہی ہے۔ ڈولا لے کر کب آئے گا۔ بھورے محنت مزدوری کر کر کے کوڑی کوڑی بچا رہا تھا کہ گھر آباد کر لے۔ خالہ کے لئے خدمت کرنے کو کوئی آ جائے اور پھر یہ کہ ظہورن اسے اچھی بھی لگنے لگی تھی۔ اسی زمانے میں ملک آزاد ہو گیا۔ بھورے لاکھوں کمانے کے لئے لاہور آ گیا اور کئی سال دھکے کھانے کے بعد اسپتال میں نوکر ہو گیا۔ باہر کی رنگینیوں اور تنہا شخص ظہورن تو خواب کی طرح یاد رہ گئی تھی اور سیتاپور ـــــ بھلا کیا رکھا تھا۔ سیتاپور میں سارا دن سڑکوں پر دھول اُڑا کرتی۔ راہ گیر درختوں تلے گٹھڑیاں سرہانے رکھ کر سوتے رہتے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے بندر اس تاک میں دیدے گھماتے رہتے کہ کیا اُچک لے جائیں۔ بابو لوگوں کے تھوڑے سے بنگلے، پرانی وضع کے دو چار مندر، لڑکیوں کا ایک کالج جہاں رات گئے تک کیرتن کی آواز آتی رہتی۔ بھلا کون یاد رکھتا ہے اس سیتاپور کو؟

مگر اب جبکہ ظہورن اس کے سامنے کھڑی تھی تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ ظہورن کسی دوسرے کی ہو گئی۔ وہ جیسے بھورے کی خالہ نے ایک آدھ ٹھیکرے میں ڈال کر بھورے کے لئے خرید لیا تھا اور اب اُس کے ایک آنے کے بدلے میں اس سے وفاداری نہ پا کر دکھ سے تلملا اُٹھا تھا۔ اس اسپتال میں آنے کے بھلا کیا مطلب ہیں۔ یہی نا کہ بچہ پیدا کرنا ہوتا ہے یا پھر کسی زنانے مرض کا علاج۔

"کیسے آنا ہوا اسپتال میں؟" بھورے نے تصدیق کرنی چاہی۔

مگر ظہورن کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے ساکت کھڑی رہی، پھر نظریں اُٹھا کر بھورے کو بڑی دکھی دکھی نظروں سے دیکھ کر لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں ایک پیاسی ٹیٹری شور مچاتی اُڑی جا رہی تھی۔

"مینہ برسے گا، ٹیٹری چہک رہی ہے۔" ظہورن نے دھیرے سے کہا۔

"ہوں!" بھورے کو اپنے دکھ میں اچانک کمی کا احساس ہونے لگا۔ کیا کہتی تھی خالہ۔ جیسے کی ہنڈیا گئی، کتے کی ذات پہچانی۔

"چاچا چاچی کہاں ہیں؟ سب کیسے ہیں؟ بھورے نے دُنیا کی باتیں کرنا شروع کر دیں مگر ظہورن کی پیلی پیلی آنکھوں میں ایک دم آنسو آ گئے۔ وہ بھورے کے قدموں کے پاس نیچے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ایسی تھکی اور نڈھال نظر آ رہی تھی جیسے کوسوں دور سے چل کر آ رہی ہو، بھوکی پیاسی، پیروں میں چھالے ——— "اماں آتے ہی بیٹھے میں مر گئی۔ دو سال ہوئے کہ بابو بھی ٹرک تلے آ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس دوسرے بڑے اسپتال میں تین دن پڑا رہا تھا۔" اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو خشک کر لیئے

بھورے نے نظریں جھکا لیں۔ ظہورن کو اس حال میں دیکھ کر اسے بھی افسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔

صدیاں گزر گئیں مگر ان دائمی جدائیوں کے دکھوں کو ہلکا کرنے کے لئے آج تک کوئی لفظ ایجاد نہ ہو سکا۔

زینوں پر لوہے کی ہیل کھٹ کھٹ کر رہی تھی۔ بھورے سنبھل کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

مس رضیہ فون کرنے آ رہی تھیں۔ وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ظہورن سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

"کون ہے یہ؟" مس رضیہ نے رسیور اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے سیتاپور کی ہے مس صاحب" بھورے نے کہا۔ ظہورن نے نظریں جھکا لیں۔ "یہ شہر کی جندگی کچھ نہیں ہوتی، اپنے سیتاپور میں سارے لوگ جانتے تھے کہ ظہورن بھورے کی کیا لگتی ہے" ظہورن نے ٹھنڈی سانس بھری۔

مس رضیہ فون کر کے چلی گئیں تو بھورے پھر بیٹھ گیا۔ اس نے ظہورن کی طرف دیکھا جو بڑی معصومیت سے چہرہ اُٹھائے جانے کس طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگی "جب سے کھالہ کے پاس تیرا لکھا آیا تھا بس اسی روز سے میں بابو سے کہنے لگی تھی کہ تو بھی لاہور چل۔ تیرے بنا سیتاپور جنگل لگتا تھا۔ تو بہت یاد آتا تھا۔ اماں نے شادی کے جو کپڑے بنوائے تھے وہ اب تک کلیجے سے لگا کر رکھ چھوڑے ہیں۔ کبھی تن کو نہیں لگائے، بابو نے تجھے اس لاہور میں سب جگہ تلاش کیا پر تو نہ ملا۔ بڑے شہروں میں کتنا آدمی بستا ہے پر اماں کو اللہ جنت دے کہا کرتی تھی کہ جی سے ڈھونڈو تو کھدا بھی مل جاتا ہے۔ سچ کہتی تھی اماں" وہ مسکرانے لگی۔

"چھوڑ ان باتوں کو اب، پرائی ہو کر ایسی باتیں کیوں کرتی ہے؟" بھورے جھلا اُٹھا۔ یہ عورت ذات بھی بڑی چترباز ہوتی ہے۔ اب نخرے کر رہی ہے۔

"یہ تو کہہ رہا ہے؟" ظہورن نے جانے کیسی سرشاری سے آنکھیں بند کر لیں۔ "میں تو جی جان سے تیری ہوں بھورے" وہ ساری جان سے کانپنے لگی۔ پیلے بیمار چہرے پر ہلکی سی سُرخی رینگ گئی اور بھورے نے اپنے سیتاپور میں دیکھا کہ ایک

چمپئی رنگ کی لڑکی سرخ اوڑھنی اوڑھے کواڑوں کی اوٹ سے اس کو تاک رہی ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔

اس نے پوری آنکھیں کھول کر ظہورن کو دیکھا۔ یہ جی جان کو لے کر کیا کرنا ہے۔ اب ایسی باتیں یاد کرنے سے کیا فائدہ ہوگا — "تم اسپتال کیوں آئی ہو؟" اس نے پھر اچانک سوال کیا۔

ظہورن نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی — "دیکھ اب تو بادل گھر کر آ گئے ہیں۔"

"اصلی بات کیوں چھپاتی ہے۔ کہہ دے نا کہ جب میں نہیں تھا تو تیرے باپ نے دوسرے کے ہاتھ پکڑا دیا، ایکڑ سوں والے نخرے نہ مار اب۔" اسے غصہ آ گیا تھا۔

"واہ رے" — اس نے غرور سے سر اونچا کر لیا — "جہورن ایسی نہیں کہ ایک کے بعد دوسرا خصم کر لے۔ میری شادی تو تیرے ساتھ ہو چکی تھی۔ تیری کھاطر اپنا دیس چھوڑا، ماں باپ چھوٹے، ماں یہاں نہ آتی تو بیچہ کیوں ہوتا، بابو طرک تلے کیوں آتا" — وہ رو پڑی — "یہ سب تو جبر دستی ہے، بابو کے بعد کون دیتا روٹی، کوٹھیوں میں کام کر کے پیٹ بھرتی تھی، پر مجھ سے یہ سہرو بابو بڑے کھراب ہوتے ہیں۔ ہر سال اس اسپتال میں آکر بچے جنتی ہوں۔ مر مر کر جیتی ہوں۔ بابو صاحب اپنے کسی بیرے کھانسامے کو میرا سوہر لکھا جاتے ہیں۔ اس باری وہ کھانساما کہتا تھا کہ جہورن ایسے کب تک چلے گا میرے ساتھ دو بول پڑھا لے۔ تجھے لے کر دور بھاگ جاؤں گا۔ پر میں ایسا کر سکتی تھی؟" — وہ سسکیاں بھرنے لگی اور پھر ڈوبتی ہوئی آواز میں بولنے لگی — "اب تو مل گیا ہے مجورے اب میں کہیں نہ جاؤں گی، دیکھ برتن مانجھ مانجھ کر ہاتھ گھس گئے۔" اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اس کی ہتھیلیوں میں مشقت کے گھٹے پڑے ہوئے تھے اس نے اپنا سر گھٹنے پر ٹیک لیا اور گھٹی گھٹی سسکیاں بھرنے لگی۔

مجورے چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ جیسے وہ کوئی راہ چلتا اجنبی تھا۔ ساری لگاوٹ اور حسد رفوچکر ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ظہورن سے اب اس کا کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ یہاں تو جانے کتنی اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔ اس کی کون سی خواہش ہے جو پوری نہیں ہو جاتی۔ اس نے تو یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی ایسی ویسی عورت اس کی بیوی بن جانے مگر اب یہ ظہورن جانے کہاں سے حرامی بچے جن کر اسے بیتی باتیں یاد دلانے آئی ہے۔

روتے روتے ظہورن نے خود ہی چپ ہو کر آنسو پونچھ لیے۔ شاید وہ انتظار کر رہی ہوگی کہ اب مجورے اسے چپ کرائے گا۔ اب اپنے ریشمیں رومال سے آنسو پونچھے گا، اب اسے تسلی دے گا۔

آنسو پونچھ کر وہ اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی اور مجورے اس سے نظریں بچا رہا تھا۔ بھلا ظہورن مجورے کی بیوی

بن سکتی ہے! بھورے جس کی اس برآمدے اور ٹیلی فون پر حکمرانی ہے۔ ذرا کبھی ظہورن دیکھتی تو، وہ کس شان سے سینہ اُٹھاکر چلتا ہے اور کتنی لڑکیاں اس کے پیچھے پھرتی ہیں۔

"تو پھر تو اسی خانساماں سے شادی کر لے ظہورن" بھورے نے بڑی ہمدردی سے مشورہ دیا۔ "میں نے تجھ سے شادی کی تو لوگ کیا کہیں گے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ارے یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھورے کو دیکھا اور پھر کھڑی ہوگئی "جا رے میرا نام جھورن ہے۔

میری ساری جو ہونی تھی سو ہوگئی۔ میں تیری جیسی نہیں ہوں۔ یا وہ لے لے جو دوسری ساری کروں ـــــ"

اس نے بڑے غرور سے سر جھٹکا ـــــ "جھورن جندگی بھر تیرے نام پر بیٹھی رہے گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آکر پیدا کرے گی۔ یہ سب کسمت کے کھیل ہیں رے۔"

وہ ایک بار پھر تڑپ کر رو دی مگر جلدی سے آنسو پونچھ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کا کمزور جسم کانپ رہا تھا۔ "اماں کو اللہ جنت نصیب کرے، کہتی تھی کہ جھورن ڈھونڈے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ جانے لوگ ایسی کہاوتیں کیوں بناتے ہیں" اس نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔ ایک لمحے تک یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے بھورے کو ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے اپنا کلیجہ ہلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مگر جب وہ کچھ کہنا چاہتا تھا تو ظہورن بڑی تیزی سے اپنے جھانکڑ جیسے جسم کو لہراتی برآمدے کے اس سرے پر جا چکی تھی۔

بھورے دیر تک برآمدے کے اس موڑ کو دیکھتا رہا جہاں ظہورن کھو گئی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو جیسے چونک پڑا۔

"مس زیدی آج چھٹی پر ہیں، جی کہیں گئی ہیں۔ یہاں نہیں ہیں" بھورے نے پہلی بار اپنی ڈیوٹی سے بے ایمانی کی۔

پھر وہ ظہورن کو ٹھکرانے والا پہلا دن یوں ہی اچاٹ سا گزر گیا۔ وہ لاکھ گنگاتا رہا۔

نہ تم سے دل کو لگاتے، نہ غیر کہلاتے

گلوں میں بیٹھتے، گلزار کی ہوا کھاتے

پھر بھی اس کا دل بجھا بجھا رہا۔ شام ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ جیسے خود بخود کھنچتا ہوا جنرل وارڈ کی طرف چلا گیا۔ آیا نصا سے بتایا کہ اس نام کی عورت تو گھنٹہ پہلے چھٹی لے کر چلی گئی۔

"چلی گئی تو کیا ہوگیا؟ وہ بھلا اسے پوچھنے آیا ہی کیوں تھا!" بھورے نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر واپس ہوتے

ہونے اس نے لہک کر گانا چاہا مگر گا نہ سکا۔ اس پر ایک دم مایوسی کا دورہ سا پڑنے لگا۔ اِدھر اُدھر پھرنے کے بجائے اپنی کوٹھری میں جا کر بے سدھ سا پڑ رہا۔

جب اندھیرا پڑنے لگا تو سیتا پھر کی ظہیرن مرغ اور مرغی اوڑھ کر کوٹھری کے ادھ کھلے دروازے سے تانک جھانک کرنے لگی۔ بھورے بپھر کر اٹھا اور بجبر جھڑکا کر اپنے حساب ایک بار پھر ظہیرن کو دھتکار دیا۔

باہر بڑے زور سے بارش ہو رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ بھورے کو یہ بھی وہم لگا اس نے اپنے آپ کو دو چار موٹی موٹی گالیاں دیں اور کروٹ لے کر منہ چھپا لیا۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ کچھ دن پہلے اس نے جمادارنی کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی کو اپنی کوٹھری میں آنے کی دعوت دی تھی اور اب وہ باہر کھڑی اپنے اکلوتے بوسیدہ جوڑے کو نچوڑ نچوڑ کر تیا بار دروازے پیٹ رہی تھی۔ ظالم بارش کا ایک ایک قطرہ روپے کی طرح کھنک کر اسے چڑا رہا تھا۔

بھیگتے بھیگتے تھک کر جب ساتویں بیٹی واپس لوٹ رہی تھی تو مارے دکھ کے رو رو کر بھورے کو کوس رہی تھی ——— مر جائے لاش اٹھے ایک روپیہ دینے کا وعدہ کر کے مکر گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ پہلے دن اور پہلی رات والی کیفیت بھورے کے دل و دماغ پر نقش ہوتی چلی گئی۔ اس نے ظہیرن کو جھنجھلا جھنجھلا کر لاکھوں بار دھتکارا۔ جمادارنی کی ساتویں بیٹی کو ایک کے بدلے ہی تین روپے دے ڈالے۔ کالی لوکٹ نرس کی لونڈیا کو جمپر کا ایک کپڑا بھی لا دیا۔ فرصت کے وقت خوب لہک لہک کر اپنے محبوب گانے بھی گاتا رہا مگر کہتے ہیں کہ پتھر کا لکھا ہوا نہیں مٹتا۔ ظہیرن کی محبت پتھر کی تحریر بنتی گئی ——— بھورے میں تیری ہوں، یا وہ لے لے جو دوسری ساری کروں، تیرے نام پر بیٹھی رہوں گی اور دوسروں کے بچے اسی اسپتال میں آ کر پیدا کرتی رہوں گی

پھر ——— برسات بیت گئی۔ سردیاں آ کر گزر گئیں۔ بہار منہ موڑ گئی اور جب گرمیاں آگئیں تو بھورے نے انگلیوں پر پورے مہینے گنے۔

اس دن جب گیٹ کے چوکیدار نے کسی حاملہ عورت کی آمد پر گھنٹہ بجایا تو بھورے بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کے قریب موڑ کو کاٹ کر وہ ادھر پہنچ گیا جہاں آیائیں پہیوں والے اسٹریچر کو گھسیٹتی ہوئی آتیں اور مریضہ کو اس پر ڈال کر لے جاتیں۔

دن میں کئی بار گھنٹہ بجتا۔ جانے کون کون آتا مگر ظہیرن نہ آئی۔ بھورے نے سوچا، ایسے کاموں میں دیر دیر

تو ہی جاتی ہے ۔ واپس آ کر وہ بڑی امنگ سے گاتا ۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا

مئی جون کی گرمیاں گزر گئیں مگر بھورے کے انتظار میں کوئی فرق نہ آیا مس لال خاں اپنے عاشق سے بے وفائی کر کے، کسی دوسرے سے شادی رچا کر اسپتال چھوڑ گئی تھیں مس زیدی کو دوسرے اسپتال میں زیادہ بہتر جگہ مل گئی تھی ۔ بہت سی پرانی لڑکیاں چلی گئیں، بہت سی نئی آ گئیں جنرل وارڈ کی مہتکن کی سب سے چھوٹی ساتویں بیٹی جانے کس کے ساتھ بھاگ گئی تھی مگر بھورے کو ان باتوں سے کوئی مطلب نہ تھا ۔ اس نے جانے کتنی بہت سی چیزیں ظہورن کے لئے کوٹھری میں جمع کر رکھی تھیں جن میں ایک سرخ جوڑا بھی تھا ۔

آج بادل چھا رہے تھے ۔ پیاسی ٹیٹری چیختی ہوئی اُڑی جا رہی تھی ظہورن دری کا ٹکڑا اٹھائے بھورے کے سامنے سے گزر کر ستون کے پاس جا رہی تھی بھورے نے آنکھیں ملیں ـــــ کب آئے گی ظہوریا ؟ کب آئے گی ـــــ اس نے ایک بار پھر انگلیوں پر دن گنے ۔ پورے بارہ مہینے ہو رہے تھے ۔

بھلا بھورے کو کیسے معلوم ہوتا کہ ایک مہینے پہلے سرخ کھدر کی چادر سے منہ چھپائے جو عورت تانگے پر آئی تھی اور جسے آیاؤں نے بڑی مشکل سے لاد کر اسٹریچر پر ڈالا تھا، وہ ظہورن ہی تھی جس نے اپنا نام تمیزن لکھایا تھا اور جو خون کی انتہائی کمی کی وجہ سے مر گئی تھی اور صاحب کا نامزد شوہر ظہورن کی لاش کو طالب علم لڑکوں کے لئے چھوڑ کر چلا گیا تھا ۔

پورے بارہ مہینے ۔ بھورے نے سوچا کہ اب وہ ضرور آتی ہوگی ـــــ آج نہیں تو کل آ جائے گی ۔ اس نے بڑے سکون سے پاؤں پھیلا دیئے اور لہک کر گانے لگا ۔

بچھڑے ہوئے ملیں گے پھر خالق نے گر ملا دیا ★

فیض احمد فیض

پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی

ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے رہن سہن کے طریقے اس کے آداب اور اس کے اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ معاشرہ جن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے یا جن کو مقدس یا مستحسن سمجھتا ہے اس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور جب اس معاشرے کی صورت اور اس کے حالات بدلتے ہیں تو یہ اقدار بھی اس کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور پھر انہی عقائد اور احساسات کا اظہار مختلف فنون کرتے ہیں لیکن ان فنون سے بھی لوگوں کے جذبات اور احساسات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ تینوں عوامل ایسے ہیں جو ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور آپس میں منسلک بھی رہتے ہیں۔ جب آپ قومی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں، تو پھر آپ کلچر یا تہذیب کے خصائص پر بعض عمومی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ کہ اس قوم کی تاریخ اور جغرافیہ کیا ہے اور اس قوم کی معاشرت کا انداز کیا ہے ایک قوم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی تہذیب دوسری قوموں کی تہذیب سے جدا ہوتی ہے۔ جس طریقے سے کلچر کے تین پہلو ایک دوسرے سے منسلک ہیں اسی طرح قوم اور کلچر یا قومیت اور تہذیب بھی لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے کہ آپ کسی ایسی قوم کا تصور نہیں کر سکتے جس کی کوئی تہذیب نہ ہو اور نہ ہی آپ کسی تہذیب کا تصور کر سکتے ہیں جو کسی نہ کسی قوم یا گروہ سے وابستہ نہ ہو۔ اب یہ ساری باتیں ذہن میں رکھیے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ پاکستان کی قومی تہذیب کی ماہیت اس کی موجودہ صورت اور اس کے اجزاء کیا ہیں؟

ایک بات واضح ہے کہ پاکستان کی قومی تہذیب پاکستان کی تہذیب ہے، یعنی اس قوم کے امتیازی نشانات کیا ہیں جو اس کو دوسری قوموں سے ممیز کرتے ہیں۔ ایک تمیز تو اس کے نام سے ہی

ظاہر ہے پاکستانی قوم کی دو امتیازی خصوصیات ہیں، ایک یہ کہ وہ پاکستانی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی اکثریت مسلمان ہے۔ تو گویا دو ترکیبی عناصر ہوئے آپ کی قومیت کے، جس میں سے ایک کو تو پاکستانیت کہیے اور دوسرے کو اسلامیت یا مسلمیت۔ اب سوال یہ ہے کہ قوموں کی تہذیب کے جو تین پہلو ہم نے متعین کئے تھے یعنی تاریخ، جغرافیہ اور معاشرتی نفوذ، ان کی کیفیت پاکستانی قوم میں کیا ہے؟

یہاں سے ہماری مشکلات شروع ہوتی ہیں اس لئے کہ سیاسی اعتبار سے اس گروہ کی عمر صرف ۲۹ برس ہے۔ جس کو قوم کہتے ہیں آج سے ۲۹ برس پہلے جب کوئی پاکستان ہی نہ تھا تو ظاہر ہے کوئی پاکستانی قوم بھی نہیں تھی، لیکن وہ خطہ جسے ہم پاکستان کہتے ہیں اس کی تاریخی عمر پانچ ہزار سال ہے جو کہ ہم موہنجوڈارو سے شروع کرتے ہیں۔ اب پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو یعنی دس ہزار برس کی عمر کو ہم ایک دوسرے سے کیسے مطابق کریں اور اس میں کس قسم کی مطابقت پیدا کرنی چاہیئے سب سے پہلے ہم یہی پوچھ سکتے ہیں کہ ۲۹ برس پہلے جب پاکستانی قوم نہیں تھی، تو ہم کیا تھے؟ اس کے پہلے بھی تو آخر کوئی ہماری تعریف ہو گی۔ کوئی ہمارا نام ہوگا تو وہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ اس سے پہلے ہمارے نام دو طرح کے تھے اور دو طرح سے ہمیں پہچانا جاتا تھا۔ تہذیبی اعتبار سے ہمارے نام مختلف علاقوں کے نام تھے، یعنی ہم پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور بنگالی تھے، لیکن ہم پاکستانی نہیں تھے اور سیاسی اعتبار سے ہم ہندوستانی مسلمان تھے تو اس طرح بھی پاکستانی مسلمان نہیں تھے۔ ویسے جو ہمارے علاقائی اعتبار سے پہلی جو تعریف تھی اس کا حلقہ پاکستان سے چھوٹا تھا اور جو دوسری تعریف تھی یعنی ہندوستانی مسلمان کے اعتبار سے تو اس کا حلقہ پاکستان کی موجودہ قوم سے زیادہ وسیع تھا۔ چنانچہ پہلی مشکل جو ہمیں درپیش ہے وہ بہت سی قوموں کو درپیش نہیں ہے یعنی ۲۹ برس میں ایک مخصوص تہذیب کے خدوخال کو بیان کرنا دوسرے ملکوں کو یہ مشکل اس لئے درپیش نہیں ہے کہ دنیا کی بیشتر قومیں جیسے جیسے پروان چڑھتی گئیں ان کا نشوونما ہوتا گیا۔ ویسے ہی ان کی تہذیب بھی ترقی کرتی گئی اور پروان چڑھتی گئی حتیٰ کہ ایک خاص وقفے کے بعد اس کی قومیت اور تہذیب کی شخصیت اور انفرادیت مخصوص ہو گئی؟ چنانچہ ایرانی، مصری، سوڈانی یا عراقی لوگوں کو ہماری جیسی مشکل درپیش نہیں۔

ہمیں یہ مشکل کیوں درپیش آئی؟ اس لئے کہ قوم کا تصور دنیا بھر میں نسبتاً نیا ہے اور یہ تصور اس وقت پیدا ہوا جبکہ پہلی دفعہ جمہوریت کا تصور پیدا ہوا۔ یہ دونوں تصورات قریب قریب دو سو برس پرانے ہیں۔ اس سے پہلے ساری دنیا میں جاگیرداری FEUDAL یا نوابی نظام رائج تھا اس وقت قوموں کا تصور نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت یا تو حسب و نسب کا تصور تھا یا نسل کا تصور تھا یا قبیلے کا تصور تھا، لیکن کلی طور پر کسی ایک قوم میں قومیت کا تصور نہیں تھا اور قوم کا تصور اس لیے نہیں تھا کہ اس وقت معاشرہ اس کے عوام خواص، امراء اور ان کی رعایا میں بٹا ہوا تھا اور ان دو طبقوں کی تہذیبیں الگ الگ تھیں، ان کے معاشرتی آداب بھی الگ الگ تھے۔ ان کا آپس میں ربط سیاسی نوعیت کا تھا، سماجی ربط بہت کم تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں جتنے بھی ملک اور ان میں جتنی بھی تہذیبیں تھیں وہ یا نسل کے نام پر تھیں یا خاندانوں یا بادشاہوں کے نام پر تھیں پہلی دفعہ کسی معاشرے کے مجموعی طور پر ایک قوم سمجھنے کا تصور اس وقت پیدا ہوا جب کہ مجموعی طور پر سب لوگ نظریاتی اعتبار سے برابر اور ان کے حقوق ایک طریقے سے مساوی سمجھے جانے لگے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ جاگیردارانہ نظام ختم اور اس کی بجائے جمہوری نظام یا صنعتی نظام رائج ہوا۔

ہمارے ہاں یہ اس لئے نہ ہو سکا کہ پیشتر اس کے کہ ہمارے ہاں جاگیرداری یا بادشاہی نظام ترقی یافتہ صورت اختیار کرتا، ہم غلام ہو گئے اور غیر ملکی حکمران یعنی انگریز ہم پر قابض ہو گئے اور انہوں نے اپنے معاشرتی یا سیاسی تصور کے مطابق ہم پر حکمرانی شروع کر دی۔ یہ عمل کوئی ابھی سے نہیں ہوا بلکہ سولہویں صدی کے بعد جبکہ یورپی ممالک طاقتور ہوئے اور انہوں نے امپیریلزم یا سامراجیت کی بنا ڈالی اور جہاں جہاں بھی وہ پہنچے انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ ملک، معاشرتی ترقی کی جس سطح پر پہنچا ہے اس سے آگے نہ بڑھنے پائے اور اس کا نظام، جو بھی اس وقت کا نظام ہے وہ وہیں کا وہیں منجمد ہو جائے اور اس میں آگے حرکت نہ ہو سکے۔ چنانچہ اگر وہ کسی قبائلی علاقے میں پہنچے جہاں بہت ہی پرانا قبائلی نظام رائج تھا تو وہاں وہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ نظام وہاں پر قائم ہے اگر وہ کسی ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں پر جاگیرداری یا نوابی نظام رائج تھا تو انہوں نے کوشش کی کہ اس نظام کو وہیں منجمد

کردیا جائے اور اس کی معاشرتی اور سیاسی ترقی یافتہ صورتیں پیدا نہ ہوں یہی نہیں بلکہ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے اور جس نظام پر انہوں نے قبضہ جمایا۔ اس کی جو بُری باتیں تھیں، جو پیچھے لے جانے والی باتیں تھیں جو پسماندہ رکھنے والی باتیں تھیں ان کو قائم رکھا اور اس کی جو خوبیاں تھیں اس میں جو محاسن تھے ان کو زائل کر دیا۔ چنانچہ ہمارے ہاں بھی یہی ہوا کہ جب انگریز یہاں آئے تو اس وقت جو ہمارا کافی ترقی یافتہ جاگیرداری نظام یہاں رائج تھا۔ اس کی خوبیاں مثال کے طور پر آپس میں وضع داری، رکھ رکھاؤ، مروت، نفاست پسندی، علم پروری، ہنرو دستی یہ ہمارے خصائص اس نظام کے انہوں نے ختم کر دیئے اور اس کی بُری باتیں مثلاً دربارداری، خوشامد پسندی، تملق، تقدیر پرستی، توہم پرستی، تکبر، دوسروں میں ایک خاص طرح کا ہیچ مقداری کا جذبہ۔ ان سب برائیوں کو مستقل کر دیا۔ ان کو جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قوم ترقی کر کے اس مقام تک نہ پہنچ سکی جس کے بعد قومیت اور قومی تہذیب کے خدوخال صحیح طریقے سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک مشکل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انگریز یہاں سے رخصت ہوئے تو جو ہم کو ورثے میں ملا وہ پوری طرح تشکیل شدہ اور تراشیدہ اور بالغ قومیت نہیں تھی پوری طرح سے پختہ اور مخصوص تہذیب نہیں تھی، بلکہ اس کی بجائے جو ہم کو ملا وہ قومیت کے لئے RAW MATERIAL تھا۔ خام مسالہ تھا اور اسی طرح قومی تہذیب کے بھی بکھرے ہوئے اجزا تھے اور اس کا بھی خام مسالہ تھا اور اس کو تشکیل کرنے کا کام اور اس کی ذمہ داری ہم پر ڈال دی گئی جو کہ اس وقت بھی ہماری ذمہ داری ہے جسے ہمیں کسی نہ کسی طریقے سے سرانجام دینا ہے۔ اب یہ مشکل آپ ذہن میں رکھیے اور پھر یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کیجیئے کہ ہم ان خصائص کا جو میں نے قومی تہذیب کے بیان کیے ہیں، اپنے آپ پر کیسے اطلاق کرتے ہیں۔

پہلی بات تاریخ کی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کہاں سے شروع کریں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہماری عمر ۲۹ برس ہے اور تاریخی اعتبار سے ہماری سرزمین کی عمر پانچ ہزار برس ہے اب یا تو ہم اپنی تاریخ ۵۰۰۰ برس سے شروع کریں یعنی موہنجوڈارو سے۔ اب تک جتنا زمانہ گزرا ہے، وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ اس لیے کہ ہمارے خطے کی تاریخ وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے

چند قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اگر آپ موہنجوڈارو کو اپناتے ہیں تو موہنجوڈارو کے بعد جتنے دور گذرے ہیں وہ سب آپ کو اپنی تاریخ کا حصہ ماننے پڑیں گے۔ ان ادوار میں برہمن تہذیب کا دور بھی ہے، بدھ تہذیب کا دور بھی ہے، یونانی تہذیب کا دور بھی ہے۔ اگر ان تمام تاریخی ادوار کو آپ اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کا جزو مانتے ہیں، تو پھر آپ کو اس زمانے کے جو بڑے بڑے ہیرو ہو گذرے ہیں، مفکر گذرے ہیں، فنکار ہوئے ہیں، ان کو بھی اپنے تہذیبی مورثوں میں شمار کرنا پڑے گا، مثلاً اشوک، چندر گپت، سکندر اعظم، پورس، راجہ رسالو وغیرہ۔ اگر آپ ہیرو مانتے ہیں، تو پھر آپ کو اپنے سیاسی نظریات میں تھوڑی بہت ترمیم بھی کرنا پڑے گی، کیونکہ تاریخ کا یہ جزو آپ کا ہندوستان کے ساتھ اور موجودہ بھارت کے ساتھ مشترک ہے اور پھر یہ غلط فہمی پیدا ہونے کی گنجائش ہے کہ اصل میں تو تاریخ کا تھوڑا سا حصہ ہی مختلف ہے، باقی تاریخ وہی ہے جو ان کی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ یہ نہیں کرتے، آپ اس قباحت سے نپٹنے کے لئے دوسری صورت اختیار کرتے ہیں اور اپنی تاریخ ورودِ اسلام سے شروع کرتے ہیں۔ محمد بن قاسم سے یعنی بجائے پانچ ہزار سال قبل مسیح سے شروع کرنے سے آٹھ سو سال بعد مسیح اپنی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ اس میں بھی مختلف قسم کی الجھنیں ہیں۔ بڑی الجھن تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو مسلمان باہر سے اس خطے میں آئے، وہ ایک تہذیب سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کا تعلق مختلف تہذیبوں سے تھا۔ پہلے عرب آئے، پھر محمود غزنوی کے ساتھ غزنہ اور ہرات کے ترک غلام آئے اور تغلق، خلجی، غوری پٹھان آئے اور مغل آئے۔ بیچ میں ایرانی بھی آئے۔

اب یہ جتنی تہذیبیں ہیں ان کی اپنی اپنی تاریخ ہے، یعنی اگر آپ عربوں سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں، تو ان کی تاریخ امراالقیس اور متنبی تک پہنچتی ہے۔ اگر آپ غوریوں سے، تغلقوں اور خلجیوں سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں، تو ان کی تاریخ چنگیز خاں وغیرہ سے ملتی ہے تو سوال یہ ہے کہ ہم ان تہذیبوں میں سے جو کہ ایک تہذیب نہیں تھی (اگرچہ دین ان سب کا ایک تھا) کس قومی تہذیب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں تو ظاہر ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو فوقیت نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ مسلمان کی حیثیت سے تو وہ سب برابر ہیں اور ان کی تہذیبیں اپنی اپنی جگہ بڑی تہذیبیں ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی تاریخ اسلام سے شروع کرتی ہے

ان میں جتنی بھی مسلمان قومیں ہیں، جن میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں وارد ہوئیں۔ ان میں سب ہی اپنی تہذیب کو تاریخ اسلام سے پہلے سے شروع کرتے ہیں جو زیادہ ... اور زیادہ دیندار لوگ ہیں، وہ تو حضرت آدمؑ سے شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے جس کی نظر جہاں تک بعض کی یقطان اور قحطان تک پہنچی کسی کی ملکہ سبا تک پہنچی۔ بہرصورت وہ جسے اپنی تاریخ کا عمدہ دور سمجھتے ہیں، وہ دور سیستان اور حیلہ کی بادشاہتوں کا امرا القیس اور متنبی کی شاعری کا زمانہ ہے جو کہ اسلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اسی طرح ایرانی ہیں جو کہ اپنی تاریخ درفش کاویانی سے شروع کرتے ہیں۔ عراقی ہیں تو بابل کی تہذیب سے اپنا سلسلہ ملاتے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جو کہ اپنی تہذیبی تاریخ ورودِ اسلام کی بجائے اپنے تاریخی ماخذ اور اپنے ابتدائی زمانہ سے شروع نہ کرے، تو اس لئے اگر ہم ورودِ اسلام سے شروع کریں۔ تو دینی طور پر تو ہم اس کا جواز پیش کر سکتے ہیں، لیکن تہذیبی طور پر یہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہماری بہت سی چیزیں ہیں جن کا کوئی تعلق عرب سے نہیں ہے نہ کوئی تعلق اسلام سے ہے۔

چنانچہ وہ مشکلیں ہیں اگر آپ پاکستانیت پر زور دیں یعنی خطۂ زمین کی تاریخ پر زور تو پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان سے مل جاتی ہیں اور اس صورت میں آپ کی تہذیب میں اسلام کا عنصر دب جاتا ہے۔ اگر اسلامیت کو واحد بنیاد قرار دیں تو پھر پاکستانیت کا عنصر دب جاتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی تہذیب اگر محض اسلامی تہذیب ہے، تو پھر ایرانی، تورانی، سوڈانی اور انڈونیشیا والوں سے کس طرح مختلف ہے؟ اس مشکل کو تو یہاں چھوڑیئے اور آگے چلیے۔ دوسرا پہلو لیجیے یعنی جغرافیائی پہلو۔ ہماری تہذیب کی حدود کیا ہیں، کیونکہ یہ مشکل جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے، اس کی طرف ہم بعد میں لوٹ آئیں گے۔

جغرافیائی اعتبار سے ہماری تہذیب کا مرکز کیا ہے اور اس کے دائرے کے حدود کیا ہیں؟ یہاں بھی اس قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں یعنی اگر آپ شروع سے اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں یعنی اس خطے کی تاریخ پر جسے ہم پاکستان کہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں کئی طرح کی تہذیبیں نمودار ہوئیں، کئی طرح کی تہذیبوں نے فروغ پایا۔ سب سے پہلے جسے آپ یہاں

کی خالص تہذیب کہہ سکتے ہیں جس کا یہیں پہ نشو ونما ہوا اور ولادت بھی یہیں ہوئی تو وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے یا موہنجوڈارو کی تہذیب ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے اس تہذیب کی ولادت یہیں ہوئی۔ لیکن اس کے حدود پاکستان کے حدود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ تہذیب جنوب میں خلیج کمبے تک جو کہ ہندوستان کا حصہ ہے اور مغرب میں سارے راجپوتانے تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے حدود وہ حدود نہیں تھے جو کہ موجودہ پاکستانی سندھ کے حدود میں یہ وہ تہذیب تھی جسے اس خطے کی پہلی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اس کے کوئی ایک ہزار سال بعد آریہ یہاں وارد ہوئے اور آریائی تہذیب پیدا ہوئی۔ اس آریائی تہذیب کا مرکز یہاں نہیں تھا نہ اس کی ولادت یہاں ہوئی۔ اس کا مرکز وادیٔ گنگ و جمن میں تھا اور وہاں جب راجپوتوں کی بادشاہیاں قائم ہوئیں اور بڑے بڑے تہذیبی مرکز قائم ہوئے تو یہ اُدھر سے اِدھر آئی اور اپنے چھوٹے مرکز اس علاقے میں قائم کیے جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ اس تہذیب نے بہت سی چیزیں پیدا کیں اور یہ تہذیب اپنی پیش رو تہذیب پر غالب آگئی۔ اس کے بعد تیسری تہذیب یعنی بدھ تہذیب پیدا ہوئی۔ بلکہ بدھ سے پہلے پانچسو سال قبل مسیح ایرانی تہذیب یہاں پہ آئی اور دوسو برس تک یہاں مسلط رہی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی صنعتیں اور فنون لائے۔ رسم الخط لائے۔ یہاں پہ سکہ بھی لائے اور یہ سب چیزیں یہاں کی مقامی تہذیب میں شامل ہوگئیں۔ اس کے بعد تین سو قبل مسیح یونانی یہاں آئے وہ اپنے ساتھ اپنا لباس، اپنے فنکار، اپنی آرائش کا سامان لائے اور یہ بھی یہاں کی تہذیب میں شامل ہوگئے۔ پھر کوئی دوسو سال قبل مسیح بدھ تہذیب کا عروج ہوا۔ اس زمانے میں چین اور وسطِ ایشیا کی جانب سے کُشن یہاں پہ آئے اور گندھارا تہذیب پیدا ہوئی۔ اس گندھارا تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ اس خطۂ زمین نے رومن تہذیب کے ساتھ رشتہ جوڑا اور بہت سے رومی اثرات یہاں پہ پیدا ہوئے۔ پھر ایک مختصر زمانہ ایرانیوں کا آیا۔ پھر سفید ہن آئے جنہوں نے اس تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس کے بعد بدھ مذہب کا زوال ہوا اور پھر ہندو ریاستیں مثلاً راجپوتانہ کی ریاستیں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد اسلام کا ورود ہوا۔ پھر مختلف ملک کے مسلمان یہاں پہ آتے رہے۔ اب ان تہذیبوں میں سے کوئی سی ایک تہذیب

بھی ایسی نہیں جسے ہم کہہ سکیں کہ پاکستان کی موجودہ حدود کے اندر قید تھی یا جسے ہم کلیتہً اپنی تہذیب کہہ سکیں۔ اب آخری دور لیجئے جس میں کہ ہماری تہذیب پیدا ہوئی یعنی ہندی مسلمانوں کی تو اس میں بھی کسی فن کو لے لیجئے۔ ہندوستان کی موسیقی جو مسلمانوں نے ایجاد کی۔ اس کے موجد سلطان حسن شرقی اور امیر خسرؔو اور تان سین بھی پاکستان سے باہر ہیں۔ فن تعمیر لے لیجئے۔ ان کے بڑے مراکز مثلاً تاج محل، لال قلعہ وغیرہ بھی پاکستان سے باہر ہیں۔

کیا ہم اس فن کو پاکستانی کہیں جو پاکستان میں پیدا ہوا؟ اگر ہم یوں کریں تو پھر تاج محل، لال قلعہ اور غالب، میر، امیر خسرو، تان سین ان سب کو اپنی تہذیب سے خارج کرنا پڑتا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ان سب کو اپنی تہذیب میں شامل کرتے ہیں تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری تہذیب پاکستان کی حدود میں محدود نہیں ہے یا نہیں تھی یعنی اس کی حدود موجودہ سے متجاوز ہیں، یہ دوسری مشکل ہے۔ اس مشکل کو بھی یہاں چھوڑ دیجئے۔

تیسری طرف چلئے جسے میں نے گہرائی کہا تھا۔ کسی کلچر یا تہذیب کی کسی معاشرہ یا کسی سماج میں رسائی کہاں تک ہے اور کن طبقوں تک وہ پہنچتی ہے؟ اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھیے، تو پھر بھی کافی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں۔ سب سے بڑی پیچیدگی تو یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں موہنجوڈارو کو چھوڑ کر یہاں ہمیشہ دو تہذیبیں ہر دور میں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ ایک وہ تہذیب جس کو کہ آپ کلاسیکی تہذیب کہہ لیجئے یا درباری تہذیب یا اُمراء کی تہذیب یا انگریزی زبان میں جس کو METROPOLITAN یا مرکزی تہذیب کہتے ہیں۔ یعنی جو بھی بادشاہتیں یہاں پہ قائم ہوئیں ان میں جو اُمراء تھے، جو درباری تھے اور جو ان درباریوں کا طبقہ تھا، ان سب کی ایک تہذیب ہوتی تھی۔ ان کی ایک زبان ہوتی تھی۔ ان کا خاص قسم کا لباس ہوتا تھا۔ خاص اخلاق ہوتے تھے، آداب ہوتے تھے، ان کی ایک خاص تہذیب تھی جو کہ اوپر کے طبقے کی تہذیب تھی۔ اب اس تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبیں تھیں جو کہ عوامی یا FOLK تہذیبیں تھیں وہ مقامی تھیں۔ بلوچ الگ۔ سندھی الگ۔ پنجابی الگ۔ پٹھان الگ اور بنگالی الگ۔ چنانچہ ایک اختلاف درباری اور عوامی تہذیب میں تھا۔ دوسرے اختلاف یہ تھے۔ مختلف مقامی عوامی تہذیبوں میں۔ یعنی جو پنجابیوں کی تہذیب تھی اس کی اپنی تاریخ تھی، اپنے خصائص تھے جو کہ سندھیوں، پٹھانوں اور بنگالیوں سے مختلف تھے۔ چنانچہ ہماری تہذیبی روایت میں دو طرح کی

تفرقات تھیں۔ ایک درباری اور عوامی تہذیب کی تفریق اور دوسرے عوامی، مقامی یا علاقائی تفریق۔ چنانچہ اس میں سے کسی ایک تہذیب کو ہم پاکستانی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ نہ پنجابی، نہ بلوچی، نہ پشتو، نہ بنگالی کیونکہ یہ مقامی ہیں اور دوسری جو درباری تہذیبیں تھیں۔ ان میں سے بھی کسی ایک کو ہم اپنی پاکستانی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ یہ تہذیب ہر دور میں مختلف ہوتی رہی ہے اور اب ان سب پر مستزاد ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی جو کہ انگریز یہاں لائے۔ جب انگریز یہاں پہنچے، تو انہوں نے اپنے انتظامی امور کے لئے اپنی حکومت چلانے کے لئے یہاں کے نظام میں ترمیم کی اور اپنا ایک افسر شاہی یا نوکر شاہی نظام پیدا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا۔ ان طبقوں کے علاوہ جو یہاں پہلے موجود تھے۔ ایک اُمرا کا طبقہ تھا جس کی تہذیب موجود تھی۔ دیہاتی عوام کی مختلف تہذیبیں موجود تھیں۔ اب اس پر ایک نئے طبقے کا اضافہ ہوا جو ہم لوگ ہیں یعنی شہر کا سفید پوش طبقہ۔ جو کہ پہلے موجود نہیں تھا۔ اب اس طبقے کے ساتھ کیا ہوا۔ کیونکہ یہ اُمرا میں شامل نہیں تھے اس لئے اس تہذیب کا حصہ نہیں تھے نہ یہ دیہات کے عوام میں شامل تھے کیونکہ اس کی تہذیب سے بھی کٹ گئے تھے۔ چنانچہ یہ جو ہمارا طبقہ پیدا ہوا۔ اس کو نہ اس تہذیب سے تعلق تھا نہ اس تہذیب سے اور ان بیچاروں کو لازماً مغربی تہذیب کا سہارا لینا پڑا اور انہوں نے کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تہذیب کی نقالی کریں۔ اسی طرح کا لباس پہنیں۔ اسی طرح کے گھر بنائیں اور اسی طرح کے رسم و رواج اور آداب و اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ ایک تیسری چیز پیدا ہوئی۔ اس وقت جو ہمارے معاشرے کا تہذیبی ڈھانچہ ہے اس میں یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ اس میں آپ کی پرانی درباری تہذیب بھی شامل ہے۔ اس میں مختلف عوامی تہذیبیں بھی شامل ہیں اور اس میں ایک سفید پوش طبقہ کی نیم مغربی نیم مشرقی تہذیب بھی شامل ہے۔ اب یہ صورت حال ہے اور یہ مسائل ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان سے نپٹنا کیسے جائے؟

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ پاکستانی تہذیب کو ایک طرف ہندوستان سے اور دوسری طرف باقی اسلامی ممالک سے ممیز کیسے کریں؟ یعنی اس تہذیب کو جس کو آپ پاکستانی تہذیب کہتے ہیں۔ اس کی شخصیت IDENTITY اور اس کی انفرادیت کا کیسے تعین کریں؟ اس پر ذاتی

رائے تو دی جا سکتی ہے لیکن اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہماری تہذیب میں یہ دونوں عناصر شامل ہیں یعنی ایک طرف ہماری وطنیت اور دوسری طرف ہمارا دین۔ اس لئے ہماری تاریخ ۵ ہزار سال پرانی ٹھہرے گی۔ ہر چند کہ اس میں تین یا چار ہزار سال کی تہذیب ہندوستان کے ساتھ مشترک ہے اور اس کی تہذیبی روایات ہندوستان کے ساتھ منسلک ہیں، لیکن اس میں ایک حصہ ایسا ہے جو کہ ہندوستان کے ساتھ مشترک نہیں ہے یا ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مشترک نہیں ہے۔ وہ ایک ہزار سال کا حصہ ہے جو کہ اسلامی دَور کا حصہ ہے اور اس دور کی جو تہذیبی روایات ہیں اس کا فن، اس کے عقائد، اس کے رہنے سہنے کے طریقے، اس کے رسم و رواج وہ غیر مسلموں کے اور ہندوستانیوں کی تہذیبی روایتوں سے قطعی مختلف ہیں چنانچہ یہ چیز ہم کو ہندوستان سے ممیز کرتی ہے۔ دوسری طرف ہماری پہلی چار ہزار سال کی تاریخ ہے۔ یہ ہم میں اور باقی اسلامی ممالک میں مشترک نہیں ہے۔ ایک ہزار سال کی اسلامی روایات دوسرے اسلامی ممالک سے مشترک ہیں۔ لیکن چار ہزار سال کی ہماری مقامی روایات ہیں اور پاکستانی روایات ہیں یعنی وطنی روایات جو کسی دوسرے اسلامی ملک کے ساتھ مشترک نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارا وطن ہم کو باقی اسلامی ممالک سے الگ کرتا ہے اور ہمارے دین کی روایات ہم کو غیر مسلم ہمسائیوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ دونوں چیزیں مل کے ایک مخصوص چیز پیدا ہوتی ہے۔ ایک انفرادی چیز پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاکستان کی تہذیبی شخصیت کہتے ہیں۔ یہ تو رہی پہلی بات۔

دوسری بات حدود کی ہے۔ اس کا بھی میرا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز اور اچھی چیز جو کہ ہمارے اس چار ہزار سال کی پیداوار ہے، وہ بھی ہماری ہے اور ہر وہ چیز جو پچھلے ایک ہزار سال کی روائتوں کا نتیجہ ہے، خواہ اس کا جغرافیائی مرکز کہیں ہے وہ بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہے چنانچہ حافظ اور خیام بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہیں۔ اس لئے کہ وہ اسلامی روایات سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے غرناطہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے، کیونکہ وہ اسلامی تہذیب سے متعلق ہیں۔ اس وجہ سے کاشی کاری اور وسط ایشیا کے دوسرے فنون بھی ہماری تہذیب سے متعلق ہیں۔ اس لئے کہ ان کا تعلق بھی براہ راست اسلام کی تہذیبی روایت سے ہے۔ اسی وجہ سے تاج محل، لال قلعہ،

غالب۔ میر۔ تان سین، خسرو اور شرقی وسدا رنگ یہ سب ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہیں اگر ہم جغرافیائی طور پران کو پاکستانی حدود میں مقید نہیں کر سکتے اور یہی ایک صورت ہے جس میں کہ آپ اپنی تہذیب کو ایک طرف بہت محدود ہونے سے بچا سکتے ہیں اور دوسری طرف بہت ہی CONFUSED اور پراگندہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

تیسرا سوال رہا آپ کے معاشرتی مسائل کا کہ ہمارے ہاں جو مختلف علاقائی تہذیبیں رائج ہیں یا پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگالی ان کو یکجا کر کے ہم قومی تہذیب کیسے بنا سکتے ہیں۔ ایک مسئلہ۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ دو سو برس ہم نے جو غلامی میں گذارے ہیں جس کی وجہ سے ہماری تہذیبی سطح دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت بہت نیچے رہ گئی ہے اس کمی کو کیسے پورا کرنا ہے اور اپنی تہذیب کو اس سطح تک کیسے پہنچانا ہے کہ ہم دنیا کے سب سے مہذب ملکوں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں۔ یہ رہا دوسرا مسئلہ تیسرا مسئلہ یہ کہ ہم اپنے معاشرتی نظام کو کس طریقے سے تشکیل دیں یا کس طریقہ سے تشکیل دینا چاہیئے تاکہ پُرانا فرق جو اُمرا اور عوام کی تہذیبوں میں تھا، وہ دُور کیا جا سکے اور یہاں پر جو بھی تہذیب ہم تشکیل کریں، اس میں سب عوام کو یکساں حصّہ ملے۔ چنانچہ یہ تین طرح کی ذمّہ داریاں تین طرح کے کام اور تین طرح کے مسائل ہیں جن سے ہمیں نبٹنا ہے۔

پہلا مسئلہ ارتباط کا ہے یعنی ہمارے ہاں جو مختلف علاقے ہیں یا مختلف تہذیبیں ہیں، ان کا ارتباط کیسے کرنا ہے اور ان میں اتحاد کیسے پیدا کریں۔ یہ رہا پہلا مسئلہ جو کہ مستقبل میں ہمیں حل کرنا ہے۔

دوسرا مسئلہ ارتفاع کا ہے کہ ہم اپنی تہذیب کی سطح کو بلند کیسے کریں؟ اور اس کی پسماندگی کو دُور کیسے کریں؟

تیسرا مسئلہ انضباط کا ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کی تشکیل کس طرح کرنی ہے تاکہ ہمارے معاشرتی انضباط کے ساتھ ہماری تہذیبی زندگی میں ایک وسعت اور ملک گیری پیدا ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں کل بات کریں گے۔

سوال، غالباً سوال کیا گیا تھا کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہیں؟۔

جواب: جس ملک میں اسلام پہنچا اسلام کی بدولت ہاں چند ایک باتیں، چند ایک خوبیاں یا اوصاف

پیدا ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں مقامی تہذیب تباہ نہیں ہوئی، بلکہ اس کی ترمیم ہوئی نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جتنے اسلامی ممالک ہیں ان کی اپنی اپنی تہذیب الگ ہے۔ اگرچہ ان میں اسلامی خصائص مشترک ہیں چنانچہ ہم اپنی تہذیب کو ایرانی تہذیب اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ہماری زبان ایرانیوں کی سی نہیں ہے۔ ہماری مصوری، ہمارے ادب کا ایرانیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف چند ایک چیزیں مشترک ہیں۔ چنانچہ ہم کلی طور پر کسی ایک قوم کی تہذیب کو کسی دوسری قوم کی تہذیب کے ساتھ منطبق نہیں کر سکتے۔ خواہ ان کا دین اور بہت سی خصائص مشترک ہوں۔ اس وجہ سے یا تو ہم پاکستانی کو پاکستانی نہ کہیں اور اگر پاکستانی کو پاکستانی کہتے ہیں اور اگر ہم پاکستانی قومیت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ اس قومیت کے لیے آپ کو ایک الگ تہذیب بھی وضع کرنی پڑے گی وہ اگر موجود نہیں ہے۔ اور اگر موجود ہے تو اس کو اپنانا پڑے گا۔ پاکستان تو اسلام نہیں ہے۔ پاکستان تو جغرافیہ ہے۔ ملک کا نام ہے۔ دین کا نام نہیں ہے اگر آپ اپنے کو پاکستانی نہ کہیں اور اپنی قومیت سے انکار کر دیں تو پھر یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ قومیت پر مُصر ہیں تو پھر آپ کو قومی تہذیب پر بھی مُصر ہونا پڑے گا پھر آپ اس قومی تہذیب کو کسی دوسری قومی تہذیب کا حصّہ نہیں سمجھ سکتے۔

سوال: غالباً یہ سوال کیا گیا تھا کہ اگر ہم اپنی تہذیب کو پاکستانی تہذیب کہیں، تو کیا یہ اسلام سے بُعد کا باعث نہ ہوگا؟

جواب: کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے ساتھ کوئی قومی تہذیب مطابقت نہ رکھے جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ دین یا مذہب آپ کے عقائد اور اخلاق اور ایک حد تک آپ کے آداب کی تشکیل کرتا ہے۔ دین آپ کی زبان، لباس، خوراک اور رہن سہن کے طریقے متعین نہیں کرتا اور خاص طور پر دینِ اسلام سوائے حلال و حرام کے کسی خوراک کی وضاحت نہیں کرتا کہ چاول کھائیں یا روٹی کھائیں یا کس قسم کے ظروف استعمال کریں یا آپ کے ادب کی کیا صورت ہوگی؟ یا یہ کہ آپ کی تعمیر کی کیا صورت ہوگی تو میں نے جو تہذیب کی تعریف کی تھی۔ اس میں عرض کیا تھا کہ باطنی قدروں کے علاوہ اور علاوہ ان اخلاق کے جو براہِ راست دین سے متعلق ہیں، زندگی کا جملہ روزمرہ شامل ہوتا ہے اور وہ روزمرّہ ہمیشہ حالات سے متعین ہوتا ہے جو مقامی تاریخی اور جغرافیائی حالات

کے علاوہ کسی اور طریقے سے متعین نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ عام مغالطہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو قومی تہذیب بنایا جا سکتا ہے یا اس میں بند کیا جا سکتا۔

سوالات: (۱) تہذیبی جھنجھٹ کی گوناگونی سے بچنے کے لئے اسلامی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور اسی پر پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ کیا اس بات میں حقیقت نہیں ہے؟ یا پاکستانی تہذیب ناقابلِ عمل ہے؟

(۲) ے تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک شاخسار ایم

تہذیب کو اس رنگ میں پیش کریں جس میں علامہ اقبال نے پیش کیا ہے؟

جواب: میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اسلام، اسلامی تہذیب اور قومی تہذیب میں کوئی فرق یا تضاد نہیں ہے۔ ہر قومی تہذیب اسلامی تہذیب ہے بشرطیکہ اس کے اخلاق و عقائد وہی ہوں جن کی کہ مذہب اسلام تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ جب سے اسلام پیدا ہوا ہے۔ بیسیوں اسلامی ملک، ایران، توران، سوڈان اور مصر وغیرہ سارے ملکوں کی تہذیب اسلامی ہے لیکن اسلامی تہذیب کے علاوہ ہر ملک کی اپنی تہذیب بھی ہے ان کی قومی اور اسلامی تہذیب سے مل کے جو تہذیب پیدا ہوتی ہے، اس کو ہم مجموعی طور پر ان کی تہذیبی خصوصیت گردانتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح پاکستانی تہذیب اپنے مقامی فنون، رسوم، رہن سہن، اپنے ادب زبان اور مقامی اجزا کو اپناتی ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ اپنے عقائد اور اپنے اخلاق اسلامی رکھیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان باقی اجزا کو آپ قومی کیوں نہ سمجھیں یا ان کو قومی کیوں نہ قرار دیں اور اس طریقے سے جو پاکستانی تہذیب بنے گی یا موجود ہے وہ پاکستانی بھی ہے اور اسلامی بھی ہے اگر ہم اپنی قومیت کو مانتے ہیں (اور اگر اس سے انکار ہے۔ تو دوسری بات ہے) تو لازماً ہماری تہذیب کے دو عناصر ہوں گے، ایک اسلام اور ایک پاکستانیت میں جس چیز کی وضاحت کر رہا تھا وہ پاکستانیت کا عنصر تھا، اس لئے کہ اسلام کے بارے میں نہ کسی بحث کی ضرورت ہی ہے اور نہ ہی وضاحت کی۔ وضاحت طلب چیز کے

کرنے کی تھی وہ قومی اور مقامی خصوصیات ہیں کہ پاکستانیت سے کیا مراد ہے۔ جب علامہ اقبالؔ نے یہ کہا تھا کہ ؎

ما پروردۂ یک شاخسار ایم

اور اس لئے رنگ و بُو کی ہمیں تمیز نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ دنیا کے اسلامی ممالک اپنی تہذیب سے روکش ہو جائیں یا اپنی تہذیب کو بھول جائیں یا سب کے سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ان کی مراد بھی یہی تھی کہ جو ہمارے عقائد، اخلاق اور روایتیں یکساں ہیں، ان میں ایک دوسرے میں تمیز نہ کریں اور ان کی بنیاد پہ عالم اسلام میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں، لیکن اقبالؔ کی مُراد یہ نہیں تھی کہ ایرانی عرب ہو جائیں یا ترک ہو جائیں۔ یہ اتحادؔ تو دینی و ملی اتحاد تھا۔ یہ میرے نزدیک قومی تہذیبوں کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر آپ اس کی نفی کریں گے تو لازماً اُس کی قسم کے جھگڑے پیدا ہوں گے جیسے کہ پُرانے زمانے میں عربوں اور تُرکوں میں پیدا ہوئے۔ جب تک عربوں میں اسلامی جذبہ قائم رہا اس وقت تک عالم اسلام نے انھیں مانا۔ لیکن اس کے بعد جیسے کہ آپ جانتے ہیں ترکوں نے بغاوت کی۔ کبھی ایرانیوں نے بغاوت کی۔ کیونکہ کوئی قوم بھی اپنے قومی خصائص کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب کریں گے یا مسلّط کریں گے تو بجائے اس کے کہ اس سے اتحاد پیدا ہو، اس سے لازماً افتراق پیدا ہو گا۔ اتحاد اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کو داخلی طور پر اپنی زندگی، اپنے مزاج اور روایتوں کے مطابق بسر کرنے کی آزادی ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ جو چیزیں اور رشتے دینِ اسلام کی وجہ سے دوسرے ممالک کے ساتھ ہیں ان رشتوں کو استوار کر کے آپس میں اتحاد کریں۔

سوال، اگر زبان کا تعلق تہذیب سے ہے تو اردو زبان کا تعلق پاکستان سے کب سے جب یہ دکن سے چلی اور دلی آئی ؟

جواب : یہ سوال اس لئے ضروری ہے کہ زبان کا مسئلہ ہمارے ہاں بہت اہم ہے چنانچہ اس کے بارے میں چند باتیں ذہن میں رکھیے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اردو زبان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ پیدا کہاں ہوئی

لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ زبان پہلے وہیں پیدا ہوئی ہوگی جہاں مسلمان پہلے وارد ہوئے ہوں گے اور جہاں پہلے ترکی، فارسی اور عربی زبانوں کا مقامی زبانوں سے اختلاط ہوا ہوگا اور وہ علاقہ تو یہی علاقہ ہے جو پاکستان کا ہے۔ چنانچہ آپ نے حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے بارے میں سُنا ہوگا جنہوں نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں یہ کہا کہ "اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور دکن میں بعد میں پہنچی"۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو زبان ہماری تہذیب کا حصّہ نہیں ہے۔ اگر یہ نظریہ قابلِ قبول نہ ہو تو یہ ظاہر ہے کہ اگر درباری زبان فارسی تھی خاص طور پر مغلیہ زمانے میں تو اُمرا اور عام بول چال کی زبان اردو تھی یا اردو کی ایک صورت تھی اور اس مغلیہ تہذیب اور سلطنت میں اس علاقہ کو جسے ہم پاکستان کہتے ہیں، بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہاں دو سو برس پہلے اردو کے بہت سے ادیب پیدا ہوئے جن کی تحریریں کچھ دستیاب ہوتی ہیں اور کچھ دستیاب نہیں ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ چونکہ دربار دلّی میں تھا اس لئے زیادہ نامور ادیب اور شعرا دلّی میں پیدا ہوئے، لیکن درباری شعرا اور ادیبوں کے علاوہ صوفیا، علما، مورّخوں، فقیہوں اور مبلغوں نے جو دینی اور دنیوی کتابیں گمنامی میں رہ کر لکھیں وہ اردو میں تھیں اور یہ سب لوگ اسی خطے میں پیدا ہوئے اور اسی خطے میں انہوں نے زبان کو فروغ دیا۔ اس کے بعد جب انگریز آئے، تو اردو کو اس کے اپنے وطن میں زوال ہوا۔ اردو زبان کا صحیح فروغ اور ترقی اسی علاقہ میں ہوئی جس کو ہم آج پاکستان کہتے ہیں۔ اس لئے اردو زبان ہماری تہذیبی روایت سے الگ چیز نہیں ہے، بلکہ اس کا اہم جزو ہے۔

اگرچہ اس زبان کے ساتھ ساتھ ہماری مقامی زبانیں بھی ہیں اور ان زبانوں کی اپنی تاریخ ہے، ان کا اپنا ادب ہے اور ان کی اپنی تہذیبی اہمیت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اردو اور مقامی زبانوں میں اس قسم کا ارتباط پیدا کریں اور ایسا رشتہ پیدا کریں کہ یہ زبانیں بھی اور اردو بھی ہمارے ہاں فروغ پا سکیں۔

سوال: غالباً یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا مختلف ثقافتی نمائشیں جو آجکل وقتاً فوقتاً کی جاری ہیں، ہماری اسلامی تہذیب کا حصّہ ہیں؟"

جواب: مَیں سمجھتا ہوں کہ فن اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی۔ اور اگر کوئی فن پاکیزہ ہے

تھا اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اچھے فن کار بھی ہیں جو کہ اسلامی تہذیب یا ہماری تہذیب کے مطابق ہیں۔ کچھ بُرے، لوچ پوچ اور لچر فنکار بھی ہیں جن کا عمل اسلام سے صریحاً متصادم ہے۔ مثلاً موسیقی کو لے لیجئے، اسلامی تاریخ کے ہر دَور میں چاہے وہ اُمیہ یا عباسی ہوں ہمیں موسیقی کے سرپرست ملتے ہیں۔ اسحاق موصلی اور خلیفہ معتضد باللہ اور ایسے کئی بڑے بڑے نام ہیں جو اسلامی روایت کا حصہ ہیں، لیکن اس زمانے میں گھٹیا اور فحش موسیقار بھی ہوں گے جن کا نام آج ہم نہیں جانتے۔ چنانچہ وہ ہماری تہذیب کا حصہ نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جو فن پاکیزہ، شائستہ اور بلند اخلاق کی طرف ترغیب دینے والا ہے، وہ اسلامی ہے۔ جو فن فحش ہے اور جس سے لوگوں کا اخلاق بگڑتا ہے، وہ اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔

محمد علی صدیقی

کراچی

قومی تشخص اور ثقافت

ایک ایسے زمانہ میں جب قومی تشکیلِ نو کا کام انتہائی اہم مسئلہ کی صورت اختیار کر چکا ہے "قومی تشخص اور ثقافت" کا موضوع کچھ اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند و پاک کی بقا اس کلیہ پر رکھی گئی تھی کہ "بحیثیت ایک کلچرل قوت ہندی مسلمانوں کی بقا کا انحصار ایک مخصوص علاقہ میں اپنی مرکزیت قائم کرنے پر ہے۔ لیکن جوں ہی اگست ۱۹۴۷ء میں یہ مرکزیت قائم ہو گئی تو ایک مرکزی یا روحانی کلچرل قوت کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح تر ہوتی چلی گئی کہ پاکستانی قوم کا غالب حصہ مذہبی عقیدہ کی یک رنگی کے ساتھ ساتھ مختلف اللسان اور مختلف النسل علاقوں پر مشتمل ایک ایسی وحدت کا نام ہے جس کی معلومہ تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ ہر چند کہ موجودہ پاکستان پر اسلامی شعائر کی گہری چھاپ موجود ہے۔ لیکن یہ چھاپ صرف پاکستان ہی کی حد تک محدود نہیں ہے۔ دنیا کے دیگر ۴۲ ممالک کے علاوہ جہاں مسلم اکثریت ہے سو سے زائد ممالک میں بھی اسلام ایک زندہ حقیقت کے روپ میں موجود ہے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیا ہم قومی تشخص کے حوالہ سے ثقافت تک پہنچنے کی کوشش کریں یا ثقافت کے ذریعہ قومی تشخص کی منزل سر کریں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی

بات تو یہ ہے کہ ہمیں قومی تشخص پر غور کرتے ہوئے پاکستانی وفاق میں شامل صوبوں کی بابت ایک ضروری نکتہ پر واضح ہو کر اپنا قدم آگے بڑھانا پڑے گا۔ وہ حتمی بات غالباً یہ ہے کہ یہ علاقہ قبل از پاکستان بھی دراوڑی عہد سے لے کر آریائی، یورپی آریائی اور بعد میں سامی النسل حکمرانوں کے غلبہ سے گذرتا ہوا وسطی ایشیائی حکمراں خاندانوں کے سیاسی غلبہ کا شکار ہوا۔ اس کے بعد انگریز حکمرانوں کا نمبر آیا اور اس طرح اس علاقہ میں مسلم حکمرانوں اور ان کے عمال کی ثقافت اور عوامی ثقافت ردّ و قبول کے شعوری اور غیر شعوری عمل سے گذرتی ہوئی ایک ایسے موڑ پر پہنچی جسے ہم ثقافتی سنگم کا نام دے سکتے ہیں۔ ہم نے مسلم قوم کی سیاسی تاریخ اور علاقائی ثقافتوں کی تاریخ میں مماثلتیں تلاش کرنے کے بجائے انہیں ایک دوسرے کا نعم البدل سمجھنے کی ایک ایسی خواہش پال رکھی ہے کہ بعض حضرات کے لیے ہمارا لوک ورثہ اور تاریخ دو متوازی دھارے بن کر رہ گئے ہیں حالانکہ دونوں ہی ایک بڑے تناظر کے دو اہم رخ سمجھے جا سکتے تھے۔

پاکستان کی تہذیبی تاریخ اس قدر طویل عرصہ پر محیط ہے کہ پاکستانی ثقافت کے بارے میں اس وقت تک معنی خیز گفتگو ناممکن ہے جب تک اس حقیقت کا اثبات نہ کیا جائے کہ مملکتِ پاکستان پر مشتمل علاقوں کا ایک شاندار ماضی بھی تھا شاندار ماضی پر اصرار سے سب سے زیادہ فائدہ اس روحانی قوت ہی کو میسر آتا ہے جس نے اس ماضی کے تہذیبی اثاثوں پر اپنی عمارت کھڑی کی۔ لیکن ہم زمانۂ حال کے ساتھ ساتھ زمانۂ ماضی کے تناظر میں بھی حقیقت پسند ہوتے ہوئے خوف کھاتے ہیں اور اس طرح خواہ مخواہ ایک ایسا سودا کر بیٹھتے ہیں جس میں سراسر خسارہ ہوتا ہے۔ اسلام کی عدل و احسان پر قائم ثقافتی روح کے ساتھ اس وقت تک انصاف ممکن نہیں ہے جب تک ہم ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل سے بھی آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ کریں۔ سرِدست یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم اپنی تہذیب کی مثبت اور متحرک طاقتوں سے روگردانی کرنے میں ایک خاص تلذذ بھی حاصل کرنے لگے ہوں۔ یہ صرف ماضی ہی کے ساتھ مذاق نہیں ہے بلکہ مستقبل کے ساتھ بھی مذاق ہے۔ ثقافت مجموعہ ہے تاریخی تسلسل کی تاریخ اخذ و اکتساب اور استرداد کا۔ صرف استرداد کی روئیداد بیان کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہمارے حال میں کتنا ماضی پوشیدہ ہے اور کتنا مستقبل۔ آخر اس سادہ سی حقیقت میں کیا پیچیدگی ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے کہ ہم حقیقت پسندی کے رویہ سے کچھ خائف نظر آتے ہیں۔ حقیقت پسندی سے آخر کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ ہاں ایک فائدہ ضرور پہنچ سکتا ہے کہ ہم زیادہ استقامت

کے ساتھ اپنی تاریخ کے مطالعہ کی منزل سے گذر کر اپنے عروج و زوال سے کچھ سبق بھی حاصل کر پائیں گے۔ پاکستان بلا شک وشبہ ایک ثقافتی گلدستہ ہے۔ اس گلدستہ میں تمام موسموں کے تمام علاقوں اور تمام مزاجوں کے پھول ہیں۔ مجھے پاکستان کی رنگا رنگی بے حد پسند ہے بلکہ یہ رنگا رنگی اس درجہ مرغوب ہے کہ میں اس رنگا رنگی کے بدلے یک رنگی قبول کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ اس طرح ہم کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوں گے۔ ہاں اس گلدستہ کا ایک سیاسی آدرش، ایک سیاسی پیغام ضرور ہو سکتا ہے۔ اور وحدتِ پاکستان کا بنیادی فلسفہ ہی یہ ہے کہ یہ وہ وطن ہے جہاں رنگا رنگی کے ساتھ عدل و احسان کی حکمرانی کے ذریعہ ایک ایسا سماج پروان چڑھے گا جو نہ اپنی تاریخ کا منکر ہو گا اور نہ اپنے مستقبل کا۔ میری ناچیز رائے میں اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے کہ پاکستان کا حال ماضی کے بطن سے پھوٹتا ہے اور اس کا مستقبل زمانۂ حال کی کوکھ سے جنم لے گا، تو ہمارے یہاں بہت سا الجھاؤ (CONFUSION) ختم ہو سکتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا مستقبل تابناک ہو اور ہم ایک ہم آہنگ قوم کی حیثیت سے آگے بڑھتے ہوئے پائے جائیں تو ہمیں اپنے وفاق کی اکائیوں کی ثقافتی تاریخ کا احترام کرنا پڑے گا، اور جس قدر یہ رضاکارانہ جذبۂ تعظیم فزوں تر ہو گا، اسی قدر ہماری مشترکہ اقدار کے اثبات میں اضافہ ہو گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ قوموں کی یگانگت اور تحرّک میں کارفرما سب سے طاقتور محرکات عدل اور احسان کے منارہ ہائے روشنی سے پھوٹتے ہیں اور ہم خوش قسمت ہیں کہ عدل اور احسان اور شرفِ انسانیت ہماری تہذیب کے لازمی عناصر میں شامل ہیں۔ ہماری ثقافت کے وہ تمام عناصر مآل کار پسپا ہو کر رہیں گے جن پر ملوکیت کی چھاپ ہے۔ ہمیں دوبارہ تجرباتی سائنس اور استقرائی منطق کی جانب سفر کرنا پڑے گا۔ جنہیں مغرب نے اس درجہ اپنا لیا ہے کہ اب یہ مغربی تہذیب کا وصفِ خاص بن کر رہ گئے ہیں۔ ان اوصاف اور عدل و احسان پر قائم سماج کی ثقافت از منہ وسطیٰ کی ملوکیت اور مغرب کی کھُردری نقّالی پر قائم ثقافت سے یکسر مختلف ہو گی۔ اس لیے قومی تشخص کا مسئلہ محض "ہم کیا ہیں؟" سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کا تعلق اس بنیادی سوال سے بھی ہے کہ "ہم کیا ہونا چاہتے ہیں"، یہ بڑی حد تک NORMATIVE بحث ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ وہ پہلو ہے جسے نظر انداز نہ کیا جا سکے گا ہمیں "قومی تشخص"، کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے دیکھنا ہو گا کہ پاکستان کے مختلف علاقوں کی ثقافتی تاریخ نے کس طور سفر کیا ہے اور کس تہذیبی زاویہ سے سفر کیا ہے؟ وہ کون کون سے پہلو تھے جو نوع بہ نوع دباؤ کے تحت غائب یا تبدیل ہوتے چلے گئے۔ اور وہ کون سے پہلو ہیں جو اب تک جوں کے توں چلے آرہے ہیں۔ ہمیں ہر علاقہ کے ثقافتی مطالعہ کے اجزائے ترکیبی کے سائنسی مطالعہ اور اس

علاقے کے اہم FEATURES کے بارے میں بھی واضح ہونا پڑے گا۔ اور اس کے بعد ہی ہم مشترک تاریخ کے بعض ایسے پہلوؤں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے جو دوسرے علاقوں کے مشترک روحانی اثاثہ سے میل کھاتے ہوئے بھی باعتبار ہیئت، قدرے مختلف ہیں۔

ثقافت دراصل، اس ہمہ جہتی اسلوبِ حیات کا نام ہے جو تجربی علم اور معتقدات کے خوبصورت رچاؤ سے جنم لیتا ہے۔ تجربہ کیا ہے، تاریخی عمل سے مستنبط روایت کا پیکر ہے۔ علم کیا ہے؟ یہ دُرونِ ذات سے بیرونِ ذات دیکھنے کا عمل ہے تاکہ وہ سب کچھ جو ہماری ثقافتی زندگی سے باہر حاصل کیا جا رہا ہے، ہمارے دائرۂ علم میں آ جائے۔ معتقدات کیا ہیں؟ ۔ ایک ایسا آفاقی نقطۂ نظر جو دین اور دنیا پر مبنی ہو۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل ہے وہ اعلیٰ انسانی تہذیب کے گہوارہ رہے ہیں۔ اور ہر وہ تہذیب جو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی نقطہ پر اعلیٰ اور ارفع سطح کو چھو لیتی ہے وہ دوسری تہذیبوں کے مثبت پہلوؤں سے ترک و انقطاع کا رشتہ نہیں بناتی بلکہ زیادہ سے زیادہ اخذ و اختیار کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ بقول خلیفہ عبدالحکیم مرحوم "اسلام نے عبرانیت کی وہ تمام چیزیں برقرار رکھیں جو اخلاقی و روحانی زندگی کو سہارنے کی صلاحیت رکھتی تھیں، لیکن عبرانیوں کی تنگ نظری اور سخت گیری ترک کر دی گئی۔ اس طرح اسلام نے بے لوث عیسائیت کے ہمیشہ قائم رہنے والے قابلِ قدر عناصر کو برقرار رکھا، لیکن اس کی حد سے متجاوز رہبانیت اور آخرت پرستی کو رد کر دیا۔ اس طرح مسلمان یونانیوں کے ذہنی کارناموں کے بھی وارث بنے، انہیں پروان چڑھایا اور آخر میں اپنا یہ سارا سرمایہ مغرب کو عطا کر دیا۔ جب ہم اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں کی تہذیبی لطافتوں کا جائزہ لیتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کی غیر معمولی ذہانت نے تمام تہذیبوں کے بہترین عناصر کو باہم آمیز کیا اور اس امتزاج کو ایک تخلیقی صورت عطا کی"۔

پاکستان میں "قومی تشخص اور ثقافت" کا مسئلہ بنیادی طور پر قومی تشکیلِ نو کے پروگرام میں صحیح ترجیحات کے تعین کا مسئلہ ہے۔ قومی تشخص اسی وقت ممکن ہے جب سماجی، سیاسی اور معاشی میدانوں میں عدل اور احسان کے اصولوں پر عمل ہو رہا ہو علاوہ ازیں علاقائی اور قومی مفادات کے مابین جو دوئی فی الوقت پائی جاتی ہے۔ اسے دور بھی اس وقت کیا جا سکتا ہے۔ جب عدل اور احسان کے جذبہ کے تحت ملوکیت اور نوآبادیاتی دور کی جگہ ناانصافیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ یہ شرط بذاتِ خود اس قدر بنیادی اہمیت اختیار کر چکی ہے کہ ہمارے معترضین اسے یوٹوپیائی صورتحال سے تعبیر کرنے لگے ہیں یعنی وہ انکار کرتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ آزادی اور اجتماعی کنٹرول کے علاوہ کسی تیسرے سیاسی و معاشی

"ماڈل"، کے لیے گنجائش نکل سکتی ہے؟ حقیقت غالباً یہ ہے کہ فی زمانہ صرف وہی ثقافت ترقی پا سکتی ہے جو "علم"، کے حق میں کشادہ نظری کا رویہ اختیار کر سکتی ہو۔

ثقافت میری ناچیز رائے میں دتجربہ، علم اور معتقدات پر مشتمل دھنک رنگ ایک ایسی کلیت کا نام ہے جو تجربہ اور علم کے بارے میں ہمارے نظریات سے متاثر ہوتی رہتی ہے، ثقافت مذہبی عقائد کے برخلاف، تبدیلی کے اٹل قانون کے تابع ہے۔ اِن دنوں ہمارے ملک میں قومی تشکیل نو کے سلسلہ میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں وہ ہمیں حرکت و عمل کی ضرورت سے بے نیاز نہیں رکھ سکتیں اگر عدل اور استحسان کے سائے تلے حرکت و عمل کا سلسلہ جاری رکھا جا سکا تو پھر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ پاکستان ان چند ممالک میں سے ایک ہے جن کے مختلف علاقوں کے درمیان ہزارہا سال کے تاریخی اشتراک کی مماثلتیں علاقائی ثقافتوں پر محیط ہیں۔ ان علاقوں کے مابین اس قدر خلقی اشتراک موجود ہے کہ قومی تشخص کی راہ میں کوئی سنگ گراں نظر نہیں آتا ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمیں عدل اور احسان کی غیر مشروط حکمرانی کے لیے راہ ہموار کرنا پڑے گی کہ یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو حصولِ علم تقسیم دولت اور ترویجِ فنون کے لیے ازبس ضروری ہے۔

کسی ملک کی ثقافت کے بارے میں گفتگو کرتے وقت مستقبل کے بارے میں اس کے نظریات بھی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ شاید ہمارے مستقبل کی کوئی جھلک ہمارے حال میں بھی موجود ہو۔ کیا اس پر اظہارِ اطمینان کیا جا سکتا ہے؟ نہیں بالکل نہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ قومی تشخص کی بنیادی بحث میں ہم مستقبل پر نظر رکھیں۔ بقول اقبالؔ

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

آیئے اس موقع پر ہم خود سے یہ سوال کریں کہ ہم قومی تشخص کے اہم مقصد کے حصول کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں؟ شاید ہمیں آگاہ کیا جائے۔ کہ ثقافتی ہم آہنگی کے لیے موثر کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کاش ہم ان دعووں پر یقین کر سکتے جذباتی ہم آہنگی اگر مقصد اولیٰ ہے تو ثقافتی رنگا رنگی ایک ایسی حقیقت بن جاتی ہے جسے دل و جان سے تسلیم کر کے ہی آگے کی سمت قدم بڑھایا جا سکتا ہے ۔

مسعود اشعر

لاہور

ثقافت اور قومی تشخص

آندرے کاردا کی ایک کہانی ہے "میپ"۔ دراصل میپ اس بچی کا نام ہے جو کہانی سنا رہی ہے۔ کہانی ہے ایک ایسے ملک کی جہاں بچوں کو ان کی پسند کی تمام چیزیں ملتی ہیں۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتے ہیں وہ مل جاتی ہے۔ وہ بچی اس ملک کی خوبیاں گناتے ہوئے جب اپنی خواہش کی انتہا کو پہنچتی ہے تو کہتی ہے۔

"اس ملک کے بچوں کا جب بھی جی چاہتا ہے وہ بازار جاتے ہیں اور اپنی پسند کے ماں باپ خرید لاتے ہیں۔"

یہ کہانی مجھے ہمیشہ اس وقت یاد آتی ہے جب ہم سال دو سال کسی (HIBERNATION) کے بعد اچانک ہڑبڑا کر اٹھتے ہیں اور اپنی ثقافت اور اپنے تشخص کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ تلاش اندھیرے کمرے میں کالی بلی کی تلاش ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ کمرے میں اندھیرا ہم نے خود کیا ہے ہم اپنے آس پاس دیکھنے کے بجائے کہیں دور دیکھنے کی کوشش میں اپنی بینائی بھی ضائع کر رہے ہیں اور دوسروں کی سمجھ بوجھ بھی۔

کہتے ہیں تلاش اُس چیز کی کی جاتی ہے جو موجود نہیں ہوتی یا اگر موجود ہوتی ہے تو آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتی یا پھر وہ چیز جو پہلے موجود تھی اور اب کہیں کھو گئی ہے لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں ہے۔ یہاں جس چیز کو ہم تلاش کرنے کا اعلان کر رہے ہیں وہ موجود بھی ہے اور ہمارے سامنے بھی ہے۔ لیکن ہم جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ بعض چیزوں سے ہمیں الرجی ہے۔ ہم انہیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتے۔ انہیں دیکھنے سے ہمارے نازک جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور چونکہ ہم خود ان کی طرف نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے دوسروں کو بھی ان کی جانب دیکھنے سے روکتے ہیں۔

الرجی کی بات میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بات پروفیسر کرار حسین نے کہی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہم کلچر کے بارے میں "حسِّ شدید"، کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

"ایک مرتبہ انہیں نزلہ زکام ہوا اور ان کا سر جس کی موجودگی کا انہیں پہلے احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا اس لیے "حسّ شدید"، میں کلچر بھی ہمارا مسئلہ بن گیا ہے۔"

تو گویا ہم حاصل کی تحصیل میں لگے ہوئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تحصیل حاصل کیا ہوتا ہے۔

اپنی ثقافت اور قومی تشخص کا مسئلہ محمد حسن عسکری کو بھی پیش آیا تھا جب ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر تاثیر نے کہہ دیا تھا کہ سید امیر علی پاکستانی نہیں ہیں۔ عسکری صاحب کو اس بات پر شدید صدمہ ہوا تھا اور انہوں نے لکھا تھا کہ اگر سید امیر علی پاکستانی نہیں ہیں تو پھر میں بھی پاکستانی نہیں ہوں۔ میں جو ایک عقیدے کے تحت اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آگیا ہوں۔

۱۹۴۸ء کا زمانہ ایسا تھا جب اس قسم کی جذباتی باتیں ہمیں اپیل کرتی تھیں، ہم اپنے تمام محبوب اور پسندیدہ لوگوں کو پاکستانی بنانے میں ہی خوشی محسوس کرتے تھے خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں۔ اس وقت ہم جغرافیائی حدود میں نئے نئے بندھے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کائناتی تصور تھا جس میں ساری کائنات نہیں تو پورا برصغیر ضرور شامل تھا۔ لیکن آج اگر کوئی ایسی بات کہے گا تو یقیناً حیرت سے اس کا منہ دیکھا جائے گا۔ اگر سید امیر علی پاکستانی نہیں ہیں تو خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، اور خواجہ گیسو دراز کے مزار بھی پاکستان میں نہیں ہیں اور تاج محل، لال قلعہ اور دہلی کی جامع مسجد بھی پاکستان میں نہیں ہے۔ اس طرح جس طرح حافظ، سعدی، اور مولانا روم کے مزار بھی پاکستان میں نہیں ہیں۔ اور میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت کروں گا کہ خانۂ کعبہ، مسجد نبوی اور بیت المقدس بھی تو پاکستان میں نہیں ہیں۔ لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس طرح ان سے ہمارا رشتہ اور ہمارا

تعلق ٹوٹ جاتا ہے ۔ وہ تو ہمارے خمیر میں شامل ہیں ۔ ہمارے دل و جان کا حصّہ ہیں ہماری شناخت ہماری پہچان ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس حقیقت کو بھی کیسے جھٹلا سکتے ہیں کہ وہ پاکستان کے اندر نہیں ہیں ۔

اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی تاریخ اور اپنا ماضی سمجھنا پڑے گا اور انہیں اپنانے کے لیے اپنے ماضی کو اس انداز میں قبول کرنا پڑے گا جیسا کہ وہ ہے ۔

ایک تو ہم وہ ہیں جو ایک جغرافیائی حد بندی میں موجود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مسلمانوں بالخصوص جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشترکہ تاریخ کے حوالے سے ایک وسیع تر تناظر میں اپنا وجود رکھتے ہیں ۔ اس کے حوالے سے ہمارے ماضی کے بھی دو حصے ہیں ۔ ایک ماضی وہ ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہزار ڈیڑھ ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے اور ایک ماضی وہ ہے جو چھ سات ہزار سال کی تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ۔ بظاہر یہ پانچ چھ ہزار سال ہمیں اجنبی اور بیگانہ سے نظر آتے ہیں لیکن وہ ہمارے اجتماعی لاشعور کا ایک ایسا حصہ ہیں جو ہماری روز مرہ زندگی میں اٹھتے بیٹھتے اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں ۔ انہیں دیکھنے کے لیے بہت زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے ۔ بچّے کی پیدائش شادی بیاہ اور موت کی رسموں اور فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے موقع پر منائے جانے والے میلے ٹھیلوں میں اس کی مختلف شکلیں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ ہمارا یہ ماضی بھی مردہ نہیں ہے وہ بھی ہمارے ارد گرد زندہ اور جیتا جاگتا موجود ہے ۔

سلیم احمد بھی اس تقسیم کے قائل ہیں لیکن اجتماعی لاشعور پر آکر وہ ٹھٹھک جاتے ہیں چونکہ خود کھلنے سے گھبراتے ہیں اس لیے اپنی بندوق دوسروں کے کندھے پر رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

" ایک گروہ کہتا ہے کہ اسلامی تاریخ ہماری زندہ تاریخ اور ہمارا زندہ شعور ہے ۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسلامی تاریخ صرف شعور ہی تو ہے ، وہ لاشعور کہاں جائے گا جو موئن جودڑو، ٹیکسلا اور گندھارا وغیرہ میں دفن ہے ۔ تب شمیم احمد اور انتظار حسین پوچھتے ہیں کہ وہ لاشعور کس کام کا جس کو ہم خوابوں میں نہ دیکھتے ہوں "

شمیم احمد کا تو پتہ نہیں البتہ انتظار حسین کے لاشعور میں یہ پانچ چھ ہزار سالہ ماضی جس طرح رچا بسا ہے اس نے اپنا اظہار کرنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگائی ۔ بہت جلد وہ انتظار حسین کے افسانوں میں نمودار ہو گیا ۔ اگر انتظار حسین کے خوابوں میں یہ سب کچھ نہیں آتا تھا ۔ تو بزرگانِ دین مسلمان فقیروں اور صوفیوں کے ملفوظات اور حکایات سے مہاتما بدھ کی جاتکوں اور مہابھارت تک وہ کیسے پہنچ گئے ؟

مسے ایک انفرادی مثال نہ جانئے۔ انتظار حسین تو ایک علامت اور ایک مظہر ہیں ان رویوں اور اس فکر کا جو پچیس تیس سال کی جذباتی آندھیوں کے بعد ایک ٹھہراؤ کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں انتظار حسین اور سلیم احمد کے ساتھ باقی سنجیدہ لکھنے والوں کی تحریروں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے آپ کو اس قسم کے بہت سے کرشمے نظر آئیں گے۔

سلیم احمد اور انتظار حسین کا ذکر خاص طور پر یہاں اس لیے کیا گیا ہے کہ پاکستانی ثقافت اور قومی تشخص کی پہچان کے سلسلے میں یہ دو ایسے نام ہیں جو عسکری صاحب کی روایت کے پیروکار مانے جاتے ہیں۔ خیر، انتظار حسین تو شروع سے کربلا کے ساتھ رام لیلا کا ذکر بھی کرتے رہتے ہیں لیکن سلیم احمد اس طرف نئے نئے آئے ہیں اور سلیم احمد وہ شخصیت ہیں جنہیں تمام حلقے قبول کرتے ہیں تاہم مشکل یہ ہے کہ سلیم احمد ادھر آئے تو ہیں لیکن ایک جھجک کے ساتھ بلکہ وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں ذہنی تحفظات کے ساتھ۔ ہماری ساری پریشانی یہ ہے کہ اگر موئن جو دوڑو اور گندھارا کو بھی اپنی ثقافت میں شامل کر لیتے ہیں تو ہم اور ہماری ثقافت ہندوستان سے کس طرح ممیز اور ممتاز ہوگی۔ اس پریشانی میں ہم آج اپنے بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں جو تاریخ پڑھا رہے ہیں وہ ایک طرفہ تماشہ ہے اس میں جہاں موئن جو دوڑو اور گندھارا وغیرہ سرے سے غائب ہوئے ہیں۔ وہاں بابر اور اکبر ایک وسیع پاکستان پر حکمرانی کرتے نظر آتے ہیں اور شہنشاہ اورنگ زیب پاکستان کی سرحدیں ایک طرف دکن اور دوسری طرف پشاور تک پھیلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ اگر وہ سب پاکستان تھا۔ تو پھر ہم نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ خطۂ زمین اور علیحدہ وطن طلب کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی اور ایک خاص خطے میں پاکستان کیوں قائم کیا۔

آخر ہم اپنے بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں؟ آخر ہم ان کے اندر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ان بچوں کو باہر کی ہوا نہیں لگے گی۔ اگر وہ باہر کی ہوا میں نکلیں گے اور انہیں دوسرے حقائق سے بھی سابقہ پڑے گا تو کیا ان کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جائے گی؟ ۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان کے لوگوں کا رہن سہن، رسوم و رواج اور اپنے تیوہار حتّیٰ کہ ذہنی اور فکری رویئے بھی عرب ایران اور ترکی سے مختلف ہیں اور کیا یہ اختلاف اس سرزمین پر دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ہزاروں سال زندگی گزارنے کا نتیجہ نہیں ہے؟ اور کیا یہی ہماری ثقافت نہیں ہے؟ اور کیا اس سے ہمارا تشخص نہیں بنتا؟۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جب یہ کہا تھا کہ پاکستان کا ایک کلچر نہیں ہے اور وہ کلچر ابھی بنے گا تو ایسا

غلط نہیں کہا تھا۔ ان کا مطلب تھا اس مشترک کلچر سے جس میں تمام علاقوں کے کلچرل اجزا شامل ہوں یہ ایک ایسا آمیزہ ہے جو بن رہا ہے اب آپ اپنے رہن سہن، بول چال لباس اور مجلسی آداب اور اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز پر غور کیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ صرف گذشتہ آٹھ دس سال کے اندر ان میں کتنی تبدیلی پیدا ہوئی ہے کیا یہ ایک مشترک کلچر کی طرف قدم نہیں ہے؟ سلیم احمد صحیح کہتے ہیں کہ ہمارے قومی احساس کی عمارت مشترک مستقبل کی بنیاد پر ہی کھڑی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہے؟۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے جو جاری ہے اور ہماری ضرورتیں اور ہمارا مشترک مستقبل ان کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔

دراصل ہم گھبرا اس لیے جاتے ہیں کہ یہ سب ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا ہے۔ ہم اس دریا پر بند باندھ کر اسے اپنے رخ پر چلانا چاہتے ہیں لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ اس طرح کی جکڑبندیوں سے آس پاس کی زمینوں میں سیم تو پیدا ہو جائے گا مگر آپ کے مطلب کا کلچر پیدا نہیں ہو سکے گا۔ پاکستانی ثقافت کثرت میں وحدت کا نمونہ ہے اور یہ وحدت ایک مشترک مستقبل کے حوالے سے آہستہ آہستہ کثرت کے بہت سے اجزا کم کرتی جا رہی ہے۔ ہاں اس کثرت میں آپ مغربی کلچر کے آمیزہ کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کر سکتے یہ جو ہمارے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پہنچ رہا ہے ہم اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے ہم اس کے اثرات سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ہماری ساری کوششیں اور ساری منصوبہ بندی معاشی ترقی کے لیے۔ معاشی ترقی کا مطلب ہے پُرآسائش زندگی اور پُرآسائش زندگی کے لیے ضرورت ہے۔ مشینوں کی اور آلات کی اور تمام مشینیں مغرب سے آتی ہیں۔ آپ نے اپنے ہاں فلموں پر سنسر سخت کیا تو لوگوں نے وی سی آر پہ باہر کی فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ آپ بچ کر کہاں جائیں گے؟ کسی انسان نے آج تک اپنے لیے ریشم کے کیڑے والا کویا تیار نہیں کیا۔

آئیے اب ہم اپنی بات ختم کریں اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا برملا اعلان کریں کہ پاکستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ اس سرزمین اور اس پر بسنے والوں کی ایک تاریخ ہے پھر اس سرزمین کا ایک ماضی ہے اور اس تاریخ اور اس ماضی نے ہمیں جو کچھ دیا ہے اور جس کا اظہار ہماری روزمرہ کی زندگی میں ہوتا ہے وہ ہماری ثقافت ہے۔ جو کثرت میں وحدت کا نمونہ ہے ایک مشترک مستقبل کے حوالے سے تاریخ کا عمل ایک مشترک ثقافت کی طرف ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ اس طرح ہماری سوچ ہماری فکر اور ہمارے جذبات و احساسات کی اساس یہ خطۂ ارض ہے اور اس زمین کی بوباس اور اس کا رنگ و روپ ہمارا جسم اور ہماری جان ہے۔ اور پاکستانی قوم پرستی ہمارا قومی تشخص ہے۔

قوم پرستی کے نام پر گھبرایئے نہیں ٹھیک ہے اسے بعض لوگ دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن اگر مشترک قومی احساس کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے مشترک مستقبل بنیاد دیتا ہے تو مشترک مستقبل کے لیے بھی قوم پرستی کی ضرورت ہے اور وہی ہمارا قومی تشخص ہے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہمیں اس کی تلاش کے لیے "میپ" کے بازار جانے اور وہاں سے اپنی پسند کے ماں باپ خرید کرلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماشاءاللہ ہمارے ماں باپ موجود ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔

نظمیں

افتخار عارف
لندن

ایک جھیل کے کنارے

سمندر کے کنارے سیپیاں چُنتی ہوئی لڑکی نے پوچھا
بتاؤ تو سہی اے افتخار عارف تمھیں کیا ہو گیا ہے
اپنی ہی آواز سے ڈرنے لگے ہو
اپنے ہی سائے سے گھبرانے لگے ہو
اپنے ہی چہرے سے شرمانے لگے ہو
بتاؤ تو سہی آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے
چلو ہم نے یہ مانا یہ زمانہ اب ہمارے اور تمہارے بس سے باہر ہو چکا ہے
ان دنوں میں، بے حِسی کے موسموں میں دل کا خوں ہونا مقدّر ہو چکا ہے
مگر اس قہرماں بستی میں دو آنکھیں تو ایسی ہیں کہ جن میں کوئی اندیشہ نہیں ہے
اور جن کے خواب یکساں ہیں
بہت مبہم سہی تعبیر کا امکان تو ہے
یہ شب گزرے نہ گزرے صبح پر ایمان تو ہے
تو پھر اے جانِ جاں! ویران کیوں ہو؟
اس قدر شاداب آنکھیں جب دعا گو ہیں تو اتنے بے سر و سامان کیوں ہو
بتاؤ تو سہی آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے
اپنی ہی آواز سے ڈرنے لگے ہو، اپنے ہی چہرے سے شرمانے لگے ہو، اپنے ہی سائے سے گھبرانے لگے ہو
سمندر کے کنارے سیپیاں چُنتی ہوئی لڑکی نے پوچھا
بتاؤ تو سہی اے جانِ جاں آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے

انور احسن صدیقی
کراچی

مظلومینِ بیروت کی درخواست
"مسلم" سربراہوں کے نام

گزارش ہے سوئے مقتل مرے سرکار آ جاؤ
شمارِ کشتگاں کرنے فقط اک بار آ جاؤ

لیے تسبیح ہاتھوں میں، دعائے مغفرت لب پر
سنبھالے اپنے اپنے جُبّہ و دستار آ جاؤ

بہت ممنون ہوگی موت اس مُردہ نوازی پر
کریں گے رقصِ مستی میں صلیب و دار آ جاؤ

قدم لیں گے پھٹے چہرے، بجھی آنکھیں کٹے بازو
گہر بکھرائے گی رہ میں لہو کی دھار آ جاؤ

تمہارے کنجِ عشرت سے ہمارے محشرستاں تک
ہیں استادہ سَروں کے ان گنت مینار آ جاؤ

شفق کی سرخیوں کو خاک میں پاؤ گے تم غلطاں
بہت گلرنگ ہوگی ساعتِ دیدار، آ جاؤ

نیا منظر کھلا ہے اک تماشہ گاہِ دہشت میں
تماشہ دیکھنے تم بھی سرِ بازار آ جاؤ

بصارت کا زیاں ہوتا ہو گر مُردہ نظاروں سے
سرِ شہرِ خموشاں بس پسِ دیوار آ جاؤ

قبائے اجنبیت پر نہ ہو داغِ وفا کوئی!
مٹا کر ہر تعلق صورتِ اغیار آ جاؤ

ستم گر نام پوچھیں گے نہ قاتل راہ روکیں گے
نہ ہوگا کوئی تم سے برسرِ پیکار آ جاؤ

بجز رنجِ خجالت عرضِ غم سے کیا ملا ہم کو
نہ دیں گے ہم تمہیں اب زحمتِ تکرار آ جاؤ

وہ ہم ہی ہیں جنہیں زہرِ اجل پی کر تڑپنا ہے
مبارک ہو تمہیں اہلِ جفا کا پیار آ جاؤ

حسن شاہ جلالی علیگ

سوازی لینڈ

کسی مسلمان ملک نے مجاہدینِ فلسطین کی مدد نہیں کی اس سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی گئی

بازار

سنائیں کسے ہم کہ بازارِ زر میں پرستانِ صدق وصفا بک گئے ہیں
یہاں پاسبانِ حرم بک گئے ہیں نقیبانِ نامِ خدا بک گئے ہیں

خطیبانِ بزمِ ہُدیٰ بک گئے ہیں، فقیہانِ دینِ مبیں بک گئے ہیں
جو کہتے تھے تفسیرِ حق کے سفینے غضب ہے وہی ناخدا بک گئے ہیں

رموزِ شریعت کے جو راز داں تھے حقوقِ شریعت کے جو پاسباں تھے
جبینوں پہ سجدوں کے جن کی نشاں تھے وہ اربابِ ذی اتّقا بک گئے ہیں

خلوص و محبت ہیں اسماءِ عنقا، قناعت کا ہے فلسفہ فکرِ باطل
ہوا و ہوس کی ہے جاگیرداری رئیسانِ صبر و رضا بک گئے ہیں

تمدن نے لوٹا ہے کچھ اس غضب سے کہ لیلائے انسانیت رو رہی ہے
شرافت کے سب ضابطے مٹ گئے ہیں اصول و رسومِ حیا بک گئے ہیں

جو آزادیٔ نوعِ انساں کے نعرے لگاتے ہوئے بہرِ پیکار نکلے
وہ دولت کی چوکھٹ پہ سرخم کیے ہیں وہ خوش نام شیرِ وغا بک گئے ہیں

حسنؔ حسنِ لیلائے دولت کی تابش سمجھیے کہ بس اس قدر پُرکشش ہے
جو کہتے تھے اپنے کو کوہِ بزرگی وہ خود دار و اہلِ انا بک گئے ہیں

واحد بشیر
کراچی

لمحۂ موجود

میں پلکوں پر دیئے سجائے
بھلے سمے کی آشاؤں کے
اندھیارے رستوں پر چل کر
اب اُس موڑ پہ آ پہنچا ہوں
جس کے ایک طرف کھائی ہے
دوسری جانب
لوہے کی دیوار کھڑی ہے۔
کھائی کنارے
ایک مہاجن
سونے کی زنجیریں تھامے
ڈول رہا ہے
لوہے کی دیوار کے پیچھے
بھلے سمے کا اُجیارا ہے۔
میرے پیچھے
مجھ ہی جیسے
لوگوں کا انبوہ کھڑا ہے
دیکھ رہا ہے
تیز ہواؤں کے جھونکوں سے
سونے کی زنجیر کی کڑیاں ٹوٹ رہی ہیں

اور مہاجن کے سواگت کو
بھوکی کھائی
اپنے جبڑے کھول رہی ہے۔
مجھ ہی جیسے لوگوں کا
انبوہ کھڑا یہ دیکھ رہا ہے
لوہے کی دیوار کی کوئی
نیو نہیں ہے۔
سوچ رہا ہے
سب مل کر اک دھکّا دیں تو
بھلے سمے کا رستہ روکے
جو اونچی دیوار کھڑی ہے
ڈھے جائے گی۔
لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں
سوچ عمل میں کب ڈھلتی ہے

پیٹر شیٹ
منیر الدین احمد۔ ہمبرگ

امن کا کھیل

جرمن سے ترجمہ

بچے صحن میں
جنگ کھیل رہے تھے
وہ اپنی جنگ
بے پناہ شور شرابے سے کھیل رہے تھے

میں نے انہیں کھڑکی میں سے
پکار کر کہا
امن کا کھیل کھیلو!
مجھے امید تھی کہ اس طرح
وہ کم شور مچائیں گے

بچے صحن میں
بے حد خوش ہوئے
آؤ ہم امن کا کھیل کھیلیں!
انہوں نے جیسے ایک منہ
سے پکار کر کہا

اور سوچنے لگے کہ
امن کا کھیل کیسے کھیلا جائے
سوچتے رہے اور پھر
ایک دوسرے کے گلے پڑنے لگے
تب ایک نے پکار کر کہا

تین بالشت قد والا
میری کھڑکی کی سمت چلّایا
چچا، امن کیسے کھیلا جاتا ہے؟

میں اعتراف کرتا ہوں کہ
مجھے بچے کے سوال پر کوئی
جواب نہ سوجھا، اس لیے
میں یہ سوال
آگے تم سے کر رہا ہوں
امن کیسے کھیلا جاتا ہے؟

انیس انصاری
جھانسی، بھارت

دن کا آخری قطرہ

خدا کا شکر کہ اس کی بتائی دنیا کا
یہ دن بھی خیر سے گزرا، سلامتی سے رہے
ہوئے نہ شہر بدر بے گناہیوں کے لیے
نہ فرض کوشش کے دوران کوئی داغ لگا

خدا کا شکر کہ ہم جیسے بے سہاروں کو
ایک اور روز ملا جس میں سربلند رہے
کسی بھی جہلِ مرکب، سیاسی حیواں کو
خیال آ نہ سکا بے سبب ذلیل کرے

خدا کا شکر پٹھاری زمیں کے بنجر میں
ہمارا حوصلہ تیشہ بکف رہا دن بھر
غلط روی کے لیے دل میں شرمسار ہوئے
کوئی عزیز سا غم جب گنا رہا دن بھر

خدا کا شکر کہ اس دن کا آخری قطرہ
وہ تلخ کام سہی، ہم نے خوب جی سے پیا

فاروق حسن
مانٹریال

دیر کی بات ہے اک خواب میں ہم
شہر سے دونوں چلے ایک گھنے جنگل کو
بیچ جنگل میں پہنچ کر آخر
تنگ کرنے کو، فقط چھیڑنے کو،
پیڑ سے میں نے اُسے باندھ دیا

باندھ کر پیڑ سے اُس کو خود میں
بے ضرر کاموں میں مشغول ہوا،
ٹہنیاں توڑیں، اکٹھے کیے سوکھے پتّے
راستہ صاف کیا، آگ جلائی میں نے
اور یونہی خواب کے الجھاؤ میں مصروف رہا

دکھ کی یہ بات ہوئی، شہر کو خود لوٹ آیا
اور اسے بھول گیا خواب سے واپس لانا
خواب سورج کے اُجالے میں فراموش ہوا

وہ وہیں اب بھی اسی پیڑ سے رسّی سے بندھی
منتظر ہوگی رہائی کے لیے
شیر اور بھیڑیے اور خون کے خواہاں چیتے
گھومتے ہوں گے اسی پیڑ کے گرد
مستعد اُس پہ لپکنے کے لیے
خواب ملتا ہی نہیں

علی عباس اُمید
بھوپال

دوپہر کے بربط پر ایک گیت

زندگی جائے کہاں!
زندگی ریت سے اور ریت سے بوجھل لمحے
جاں بلب، تشنگیٔ چشم لیے
کب کھنکتے ہوئے چشمے کے تعاقب میں ہنوز
کچے شیشوں کی طرح چھن سے بکھر جاتے ہیں
نہ کوئی حرفِ تسلّی،
نہ دوا ہے نہ دعا ـــــ

اس حسیں خاکہ پہ بکھرا ئے تعصّب کا غبار
تاکہ وہ نقطے جو بیدار بھی، ہُشیار بھی تھے
دلنشیں خاکہ کی آغوش میں بوجھل بوجھل
نیم خوابیدہ رہیں ـــ
رنگ کی حس کو فراموش کریں

زندگی جائے کہاں!
زندگی کس سے ملے، کس سے کہے
ابرِ خوں گشتہ ملا،
بادِ سرا فگار ملی
صبح بھی شام کی مانند گنہگار ملی . . . .

زندگی خواب تھی اور خواب کی رنگیں تعبیر
وقت کے ہاتھوں بکھرنے کو تھی لیکن اک روز
تاک کی شاخ جو برسوں سے ہلی تھی نہ ڈلی
اپنی خوشبو سے شرابور اُٹھی
سنسناتی ہوئی تیز ہواؤں سے ملی
ـــــ برق سی کوند گئی ـــــ

زندگی جائے کہاں!
ـــــ زندگی بھول گئی قصّۂ جاں!!

زندگی خواب تھی اور خواب کا دلکش خاکہ
مدتوں بعد کئی رنگوں سے سرشار ہوا
وقت کے کُھردرے ہاتھوں نے یہ چاہا اک بار

وقت کے کھردرے ہاتھوں سے تعصّب کا غبار
اس طرح بکھرا کہ خود وقت کی آنکھوں کی چمک
اپنی مژگاں کے سفیروں کے جلو میں نکلی
اور پھر
شب کے سمندر میں کہیں ڈوب گئی

زندگی بھول گئی قصۂ جاں —
تاک کی شاخ جو خوشبو سے شرابور اُٹھی تھی اس روز
وہ فقط شاخ نہیں
رنگوں کا پیغام بھی تھی
مٹتے خاکے کے لیے ذہن کا انعام بھی تھی
فکرِ امروز بھی تھی، قصۂ ایام بھی تھی
سنسناتی ہوئی حق بیز ہواؤں کا سرانجام بھی تھی
بے حسی لاتے ہوئے وقت کو دشنام بھی تھی
تاک کی شاخ بھی تھی
زیست کا الہام بھی تھی

زندگی بھول گئی قصۂ جاں —
زندگی جائے کہاں ؟

ابر خوں گشتہ سہی
باد سرافگار سہی
صبح بھی شام کی مانند گنہگار سہی
زندگی !   کاش کبھی
تجھ میں یہ احساس جگے
تاک کی شاخ ہے خوشبوؤں سے بوجھل اب بھی
—— شب کو آئینہ دکھاتی ہے مسلسل اب بھی

زندگی !
ریت نہ بن ——
کچے شیشوں کی طرح چھن سے بکھرنا کیسا
اک کھنکتے ہوئے چشمے کے تعاقب میں بھٹکنا کیسا
زندگی — چونک، مناسب نہیں اب خواب گراں
زندگی - اور وہی، اور وہی قصۂ جاں ○○

ابرارالحسن

آڑا

پرچھائیں

ننھے بالک
کس نے کہا تھا
اپنا کھلونا اپنے ساتھی کو دے کر
واپس لینے کی چاہت میں
آزردہ ہو؟

تیرا ساتھی
وقت کی ہر دم چلتی گاڑی سے
انجانے موڑ پہ
جانے کن کچی راہوں پر کیسے ہچکولے میں
تیرا کھلونا کھو بیٹھا ہے

میں مجبور ہوں ننھے بالک
وقت کی گاڑی ہر دم آگے بڑھتی جاتی ہے
تو کب تک نازک قدموں سے
اُٹھتے، بیکس ہاتھوں سے
آنکھوں کے اُمڈے دریا سے
ٹھوکر کھاتے، گرتے پڑتے،
اس گاڑی کا پیچھا کرتا آئے گا

ننھے بالک
میرا بڑھتا ہاتھ جھٹک دے
تیری بستی ماضی کی تاریک گپھائیں
جا، اس اگلے موڑ کے آگے
اب بڑھ کر آواز نہ دینا

ننھے بالک
آنسو پونچھ لے، ننھے بالک
میری چادر کا دامن مت کھینچ
جوانی رسوا ہو گی

شاھین بدر
کراچی

فصیلِ شب کا اسیر

دُور تک ظلمات کا پھیلا ہے بحرِ بیکراں
موت کے اُٹھتے ہیں اس میں مد و جزر
دوڑتے ہیں ڈسنے کو لہروں کے ناگ
صورِ اسرافیل کے مانند طوفانوں کا شور
(میرے دل میں جل رہا ہے سہما سہما سا تمنّا کا چراغ)
اور میں ساحل کی طرح
سہہ رہا ہوں اپنے سینے پر تھپیڑے وقت کے
پی رہا ہوں زہرِ غم
تشنگی بڑھتی ہے جس سے اور بھی۔!

اس فضا کی وسعتوں میں رات کا کالا پہاڑ
جب بکھرنے لگتا ہے روئی کے گالے کی طرح
مشرقی روزن سے انوارِ سحر
اپنے چہرے سے اٹھاتے ہیں نقاب
میری برسوں کی تمنّا کو وہ کرتے ہیں سلام
(وہ تمنّا۔ مدتوں سے جس کے ہونٹوں پر جمی ہیں پپڑیاں)
اور پھر۔
اک تھکے ماندے مسافر کی طرح
وقت کا سورج چلا جاتا ہے مغرب کی طرف
تیرگی کا دیو منہ پھاڑے ہوئے
چیختا چنگھاڑتا
دوڑتا ہے مجھ کو کھانے کے لیے۔!!

نزہت صدّیقی
ٹورنٹو

ہم عاجز و مجبور، ہم بے بال و پر

قافلہ در قافلہ، انجان لوگوں کا ہجوم
نقطۂ آغاز سے انجام تک
جس کو کہتے ہیں ازل
اس لمحۂ مشکوک سے لے کر ابد کی شام تک
کس طرف، کس کے لیئے اور کیوں رواں ہے
زندگی کیا ہے کہاں ہے؟

اس سفر کو زندگی کا نام کس نے دے دیا
اور اگر یہ زندگی ہے
وقت کے ہاتھوں میں پھر آخر
اجل کا دام کس نے دے دیا

رنگ، خوشبو، گیت، جذبے، خواب اک لاحاصلی
پھر زندگی کس کے لیے، پائندگی کس کے لیے
اور اگر یہ ہے نظامِ کائنات
ہم عاجز و مجبور ہم بے بال و پر
ہم بندہ ہائے کمتریں کو
درد کیوں سونپا گیا
آگہی کیوں دی گئی، احساس کیوں بخشا گیا

رنگ، خوشبو، گیت، جذبے، خواب اگر فانی تھے
پھر اُن کے لیے
دل کو تڑپ کیوں دی گئی
یہ سوال اور سلسلہ در سلسلہ کتنے سوال
کتنے صوفی، اولیاً و انبیاء کتنے رسول
آسمانوں سے کتابوں کا نزول.... اور تشنگی
ذہن میں طوفاں کا شور
دل میں سناٹا، لبوں پر سسکیاں
اے خدائے عزّ و جل، اے قادر و جبّار
کچھ تو ہی بتا
ہم عاجز و مجبور، ہم بے بال و پر

سلیمان سعید
لاہور

سفید جھوٹ

ٹرینکولائزرز، حشیش اور مارفیا کے سوا
اب زندہ رہنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا
اور انسان کی زندگی ڈرگز سٹورز کی الماریوں میں سمٹ آئی ہے
برگد کے کہنہ سال پیڑ پر سے
تھکے ہوئے زرد پتے
ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ
یوں گر رہے ہیں
جیسے خواب میں کوئی کسی انجانی راہ پر چل رہا ہو
ساحلوں کی ریت پر لکھی تمام حقیقتیں مِٹ چکی ہیں
جنگلوں میں پرندے گیت گانا بھول چکے ہیں
اور شہروں کی سڑکوں پر اپنے اندر انسانی بنجر سمیٹے
بھاگتی بسوں کے سیلنسروں میں سے نکلتے سیاہ دھوئیں میں لوگوں کے خواب اُڑ
چکے ہیں
اور جبر اور نفرت کے اس وائرس زدہ ماحول میں
ہونٹوں پر محبت کا کوئی بول لانا
سفید جھوٹ معلوم ہوتا ہے!

ظفر زیدی
نیو یارک

اور پھر یوں ہوا

اور پھر یوں ہوا
میں بہت دیر تک
اپنے احساس کے بند کمرے میں
دبکا رہا

مختلف قسم کی
کچھ ادھوری صداؤں کے
بے ربط جملوں کو
ترتیب دینے میں الجھا رہا
اور پھر یوں ہوا
ایک آواز نے مجھ کو چونکا دیا
یہ زمانہ تو اک کارخانہ سا ہے
سجتے رہتے ہیں چھوٹے بڑے ہر طرح کے
مسائل یہاں

پھر بھلا
ذہن کو اتنی فرصت کہاں
جو فقط
ان ادھوری صداؤں کے
بے ربط جملوں کو
ترتیب دینے میں الجھا رہے۔

اشفاق حسین
ٹورنٹو

جزیرۂ بے اماں

ہوا کے ہونٹوں پہ آندھیوں کا نیا ترانہ
ہماری آنکھوں کے دیپ سارے بجھا گیا ہے
ہماری آشاؤں کے بدن کا نکھار لے کر
ہمارے ہونٹوں کی خامشی کا سنگھار لے کر
ہمارے آنگن کے رتجگوں کا غبار لے کر
ہمارے مُردہ ضمیر کا اختیار لے کر
ہمارے سارے وجود میں زہر بھر گیا ہے
ہوا کے ہمراہ اب ہمیں بھی ہے گُنگنانا
وہی ترانہ

جزیرۂ بے اماں میں جس کو
حیات کے مُردہ استعارے کا رُوپ دے کر
ہر ایک چہرے، ہر اک بدن پر سجا دیا ہے
ہوا کے ہونٹوں پہ آندھیوں کا نیا ترانہ
ہماری آنکھوں کے دیپ سارے بجھا گیا ہے

افسانے

ڈاکٹر آغا سہیل

لاہور

افسانہ - ایک مختصر گفتگو

"افسانے" کی تشکیل ہمیشہ کہانی سے ہوتی ہے اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ کمہار جس طرح چاک پر گیلی مٹی کو رکھ کر گھماتا ہے اور اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو اپنی مرضی سے جن جن زاویوں کی طرف حرکت دیتا ہے ویسے ویسے حسب خواہش جو ظرف چاہتا ہے بن جاتا ہے مٹی کتنی گیلی ہو، مٹی کا مزاج کیسا ہو، اس میں ریت اور پانی کی مقدار کتنی ہو۔ یہ سب اسے پہلے سے معلوم ہوتا ہے باقی فن اسکی انگلیوں کی حرکت میں پوشیدہ ہوتا ہے، سو افسانہ نگار بھی ہر کہانی سے افسانہ نہیں بنا سکتا، کہانی کے مزاج اور کہانی میں واقعات کی رفتار اور موضوع کے حساب سے ہر شیئے کا تناسب متعین ہوتا ہے پھر اس کے بعد اس کے ذہن کے چاک پر کہانی کی مٹی گردش کرتی ہے اور اس میں سے افسانے کا ظرف مطلوبہ شکل اختیار کر لیتا ہے تو اتارا جاتا ہے۔

جس طرح صرف کمہار کی انگلیاں مٹی کے خدوخال کو تراش کر خوبصورت ظرف بنا سکتی ہیں اسی طرح ماہر افسانہ نگار بھی کہانی سے افسانہ تراش لیتا ہے جس طرح کمہار فالتو مٹی کو پھینک دیتا ہے اسی طرح افسانہ نگار بھی کہانی کے فالتو حصوں کو چھوڑ دیتا ہے لیکن اس بات کا طے کرنا کہ کون سے حصے فالتو ہیں اور انہیں تراش کر نکال دینا چاہیئے۔ یہ بات صرف ماہر افسانہ نگار ہی انجام دے سکتا ہے۔

یاد رہے کہ جو بات روایتی افسانے کے سلسلے میں تمثیلاً کہی گئی ہے بعینہ یہی مثال علامتی اور تجریدی افسانے کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ علامتی افسانہ ہو کہ تجریدی، یہ محض اسلوبِ بیان کا نام ہے افسانے کا نہیں کہ جس طرح ظروف کی شکلیں اور ظروف کے ڈیزائن زمانے کے مزاج اور مذاق کے لحاظ سے شکلیں بدل لیتے ہیں اسی طرح افسانے کی شکل و صورت بھی بدل سکتی ہے جس طرح ظرف کی افادیت بہر حال باقی رہتی ہے اسی طرح افسانے کی افادیت اور اس کی علتِ غائی بھی باقی رہتی ہے افسانے کا بنیادی نقطہ اپنی جگہ ہر حالت میں قائم رہتا ہے اور اسی بنیادی نقطے کے گرد کہانی کے واقعات و کردار کا پرکار گھومتا ہے۔ خواہ یہ افسانہ روایتی ہو کہ علامتی یا تجریدی جس طرح چائے کی پیالی کی مختلف النوع شکلیں ممکن ہیں اور اس کے باوجود اس کی افادیت اور علتِ

غائی نہیں بدلتی۔ یعنی افسانے کی جتنی شکلیں بدل جائیں اس کی علتِ غائی باقی رہتی ہے۔

جو اذہان روایتی افسانے کے علاوہ علامتی اور تجریدی افسانہ قبول نہیں کرتے وہ چائے کی پیالیوں کو بھی روایتی انداز میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور اس کے مختلف النوع ڈیزائن قبول نہیں کرتے۔ حالانکہ ان کے ڈیزائن میں تبدیلی وقت کا بدیہی تقاضا ہوتی ہے فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے وجوہ کو سمجھانے اور بتانے والا کوئی نہیں ہوتا، دوسرے لفظوں میں وقت کی تبدیلی کی تفہیم کرانے والا نقاد بیچ سے غائب ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھیئے کہ نقاد اپنا فرض یا تو بالکل پورا نہیں کرتا یا فرض پورا کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ یعنی اس گیپ فلنگ کے لیئے جن عمرانی سماجی معاشی اور تاریخی علوم پر اُسے دستگاہ ہونا چاہیئے وہ نہیں ہوتی۔ بہر حال اس جملہ معترضہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ روایتی افسانے علامتی اور تجریدی افسانے کے مابین جو بظاہر خلا نظر آتا ہے اسکی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بتایا جا سکے کہ یہ خلا ہے نہیں بلکہ جس کمی کو دیانتداری سے نقاد کو پورا کرنا چاہیئے تھا وہ کمی پوری نہیں ہوئی یعنی افسانے کا نقاد غائب ہو گیا۔ اور جو نقاد ہے وہ سوڈو ہے، افسانہ نگاروں کے فن کے سہارے اپنا قد بڑھانا چاہتا ہے جس طرح برتن بنانے والے فنکار کے فن کے سہارے کوئی دکاندار اپنی دکان سجاتا اور اس کے مول بڑھاتا ہے۔ اس طرح کا آج کا نقاد سوڈو افسانہ نگار کو پروجیکٹ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس کے فن کو پہچانتا ہی نہیں یا پہچاننے کی استعداد نہیں رکھتا۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ قاری اور افسانہ نگار کے درمیان صرف نقاد ہی نہیں، بلکہ سوڈو افسانہ نگار خود بھی حائل ہے یعنی علامت اور تجرید کو سمجھے بغیر اناپ شناپ لکھ کر بلا وجہ اس پر علامت یا تجرید کا لیبل چپکانا بھی ایک چلن بنتا جا رہا ہے اور ایسے نعنول افسانہ نگاروں کے فن میں جو ابہام یا Ambiguity نظر آتی ہے اُسے قارئین اور جنونی نقادوں کے سر تھوپنا یا قارئین کو کم استعداد بتانا بھی درست نہیں۔ علامت اگر روایت دیو مالا، تاریخ یا مابعد الطبعیات سے لی جائے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر خود گڑھی جائے تو ابہام لازمی ہے اسی طرح تجرید سے ناواقف اگر تجرید کے بونگے ہاتھ گھمائے گا تو ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہو گا جس میں کوتاہی بہر حال افسانہ نگار کی ہوگی۔

فرانز کافکا

منیر الدّین احمد۔ ہیمبرگ

مختصر داستان

(جرمن سے ترجمہ)

"ہائے ہائے"۔ چوہے نے کہا۔" دنیا دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ ابتدا میں وہ اس قدر وسیع تھی کہ مجھے ڈر لگتا تھا۔ میں چلتا گیا اور خوش ہوا جب میں نے بہت دُور دائیں اور بائیں دیواریں دیکھیں۔ مگر یہ طویل دیواریں اس قدر سُرعت کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب لپک رہی ہیں کہ اب میں آخری کمرے میں آن پہنچا ہوں اور وہاں پر ایک کونے میں پنجرہ دھرا ہے — جس کا میں نے رُخ کر رکھا ہے۔"

"تمہیں چاہیے کہ اپنی دوڑ کی سمت کو بدلو۔" بلّی نے کہا اور اسے ہڑپ کر گئی۔

★

رام لعل

لکھنؤ

ایک اور پاکستانی

میں ابھی ابھی پولیس اسٹیشن سے لوٹا ہوں آج میرا چھوٹا سا بنگلہ اچانک بہت چپ چپ سا لگ رہا ہے۔ میرے نوکر گھریلو ملازم میرا اشارہ پاکر ادِھر اُدھر ہو گئے ہیں، میں اپنے ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا ہوں ایک گہرے صوفے میں بالکل ڈوبا ہوا سا۔ میرے آس پاس کئی خوشنما چیزیں ہیں آبنوس کا ہاتھی۔ پیتل کا گھوڑا، چاندی کا منقش تھال اور دوسری دھاتوں و پتھر کی بنی ٹیگور اور گوتم کی مورتیاں اور۔ جنگلی جانوروں، شیر بھالو اور ہرن کے مڑھے ہوئے سر، فرنیچر، سنگاپور کا لیمپ

شیڈ اور آیات کے طغرے۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۝ اور نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِیْبٌ ۝ ایک بڑی سی تصویر ناہید کی ہے یہ میں نے خود اپنے جاپانی کیمرے سے اتاری تھی جب سولہ سال پہلے پہلی بار اس گھر میں اُس نے قدم رکھا تھا۔ اتفاق سے یہ تصویر اتنی پیاری اُتری تھی کہ میں نے اسے ہمیشہ ڈرائنگ روم میں سجائے رکھا ہے۔ ایک اور تصویر میں ناہید کے ساتھ میں بھی ہوں یہ ہمارے فیملی فرینڈ ڈاکٹر راج ملک نے ہماری شادی کے روز کھینچی تھی۔ اس کمرے کی ملکہ پورے گھر کی سجاوٹ میں ناہید کا ہی ہاتھ رہا ہے۔ اُس نے جو کچھ خریدنا چاہا اسے میں نے کبھی نہ روکا تھا کھلی ہوئی کھڑکی سے جو لان دکھائی دے رہا ہے اس کو بنوانے میں بھی اسی کی مرضی شامل رہی تھی اس کی پسند کے وہ سارے پھول اور بیلیں اور پیڑ پودے میں نے دور دور سے منگوا کر فراہم کردیے جنہیں ہر وقت دیکھتے رہنا وہ پسند کرتی تھی لیکن انہی چیزوں کو اب میں کتنی حسرت سے تک رہا ہوں! جی چاہتا ہے آنکھیں بند کرلوں کیونکہ مجھے معلوم ہے تھوڑی دیر کے بعد یہ سب میری نظروں سے اوجھل ہوجائے گا جس طرح ناہید اچانک اوجھل ہوگئی ہے۔

میں آنکھیں بند کرکے بھی ناہید ہی کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ میری زندگی۔ بلکہ روح میں اتنی گہرائی تک اتر چکی ہے کہ اسے بھول جانا کبھی ممکن نہیں ہوگا۔ ابھی تو اسے مجھ سے الگ ہوئے بہت تھوڑی سی دیر ہوئی ہے ابھی تو اس کے سارے خدوخال میرے ذہن پر واضح ہیں اور اس کا لمس اور خوشبو میرے اندر پوری طرح زندہ ہے۔

سولہ برس پہلے میں راولپنڈی سے اپنے بچپن کے لنگوٹیا یار ڈاکٹر راج ملک سے ملنے کے لیے ہندوستان آیا تھا آزادی کے بعد وہ پنڈی چھوڑ کر رانچی چلا آیا تھا ہمارے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ چلتا رہا جو ہماری اٹوٹ محبت کا غماز تھا۔ جنگ کے زمانے میں ٹوٹ گیا تو ہم دوسرے ملکوں۔ انگلینڈ اور جرمنی میں رہنے والے دوستوں کے ذریعے ایک دوسرے کی خیریت پوچھتے رہتے تھے پھر اس کے بیہم اصرار پر اور کچھ اپنے بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک روز میں پاسپورٹ بنوا کر اور ویزا لے کر اُس کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن اس بات کا مجھے پتہ نہ تھا کہ میں ایک طویل مدت تک اپنے گھر واپس نہ جاسکوں گا یہ واقعہ اس کی محبت سے وابستہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے دوسرے حالات تھے جو مجھے اچانک پیش آگئے تھے۔

میں ڈاکٹر راج کے پاس کئی روز تک رہتا رہا۔ وہ اسپتال سے چھٹی لے کر اپنی گاڑی میں مجھے کئی مقامات پر لے گیا۔ بدھ گیا، راجگیر، نالندہ، پٹنہ اور سہسرام بھی جہاں شیر شاہ سوری کا مقبرہ ہے

اس کے مقبرے کو دیکھنے کا مجھے بے حد اشتیاق تھا جس نے اپنے دورِ حکومت میں کلکتہ سے درّہ خیبر تک ایک جدید اور مضبوط شاہراہ عظیم تعمیر کرا کے مغرب و مشرق کے درمیان تجارتی قافلوں اور فوجوں کی نقل و حرکت کے لیے بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں اس شاہراہ کے سامنے سارے قدیم راستے بے وقعت ہو کر رہ گئے تھے۔ شیر شاہ سے اس قدر والہانہ عقیدت کا ایک اور سبب یہ بھی تھا کہ میرا تعلق بھی خاندانِ سور سے ہے جس پر میں ہمیشہ بڑا فخر کیا کرتا تھا لیکن ڈاکٹر راج ملک کے پاس پہنچ کر مجھے اس فخر سے بھی محروم ہو جانا پڑا۔

جب ہر طرف سے گھوم پھر کر ہم رانچی واپس آئے تو ایک روز وہ مجھے اپنے اسپتال لے گیا۔ جو درحقیقت ہزاروں پاگل انسانوں سے بسی ہوئی ایک عجیب و غریب دنیا تھی جب میں اس کے آفس میں گیا تو مجھے وہاں ایسے کئی انسان نظر آئے جو دماغی توازن سے محروم تھے۔ بعض لوگ حد درجہ خاموش اور قنوطی تھے اور ہر کسی کو بس خالی خالی نظروں سے ہی تاکتے تھے۔ لیکن کہتے کچھ نہیں تھے۔ کچھ پیڑوں اور دیواروں کے ساتھ چپکے ہوئے کھڑے تھے اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر بڑبڑا رہے تھے کچھ اپنے آپ لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ، کہتے ہوئے پریڈ کرتے پھرتے تھے ایک آدمی اپنے لیے کئی برسوں سے قبر کھودنے میں مصروف تھا۔ لیکن اس کے پاس کوئی اوزار نہیں تھا صرف اس کے ہاتھوں کے ناخن تھے جو گھس چکے تھے۔ ایک اور آدمی کئی پاگلوں کو سامنے بٹھا کر سوشیولوجی اور پولٹکس پر لیکچر دے رہا تھا کچھ سامعین تو اپنے اپنے گھٹنوں میں سر دیئے اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ بڑی بے چینی سے اپنے دانتوں سے ناخن بھی کاٹ رہے تھے اور ایسا لگتا تھا وہ انقلاب زندہ باد کا فلک شگاف نعرہ لگانے کے لیے اپنے لیڈر کے اشارے کے منتظر تھے لیکن جب میں نے ڈاکٹر راج ملک کے آفس کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں سے ایک بیرک میں آہنی جنگلے کے پار ننگ دھڑنگ عورتوں کے ایک بہت بڑے جھنڈ کو بندروں کی مانند چیختے اور اچھل اچھل کر جاتے ہوئے دیکھا تو میرے منہ سے بے اختیار یا اللہ نکل گیا میری گھبراہٹ کو دیکھ کر ڈاکٹر ملک کی ایک اسسٹنٹ ڈاکٹر میمونہ نے فوراً اٹھ کر کھڑکی بند کر دی لیکن میں کئی لمحوں تک دونوں آنکھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا اور میرا دل بری طرح دھڑکتا رہا۔ میں بند آنکھوں سے بھی انہی مادر زاد ننگی اور وحشی جانوروں کو دیکھ رہا تھا جو کسی جنگل کی ہی باسی معلوم ہوتی تھیں اُن کی خوفناک اور دردناک چیخیں میرے کانوں میں ابھی تک گونج رہی تھیں۔ ایسا بھی لگتا تھا میں نے کوئی بھیانک خواب ہی دیکھ لیا ہو، لیکن وہ خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ میں صرف اس کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔

ڈاکٹر راج ہنستا ہوا میرے پاس آکر کھڑا ہوا اور بولا:- آنکھیں کھولو سوری! تم تو یار بڑے بزدل نکلے! ہمارے ملک کے ساتھ ایک ہزار سال تک لڑتے رہنے کی بڑی ڈینگیں مارتے تھے! لعنت ہے تم پر ایک ہی بھیانک منظر دیکھنا برداشت نہ ہو سکا! بچو' جنگ کا نظارہ تو اس سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتا ہے جب کٹے ہوئے سروں، ٹانگوں، ہاتھوں اور پیٹوں میں سے پیپ کی طرح بہہ بہہ کر نکلتی ہوئی انتڑیوں کے درمیان لیٹے لیٹے گولیاں چلانی پڑتی ہیں! وہ سب کیونکر دیکھ پاؤ گے۔

میں نے اس کی طرف حیران حیران نظروں سے دیکھا تو وہ ایک دیوار کے ساتھ الماریوں کے سلسلے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ یہاں ایسے ہی کتنے مظلوم اور بے بس انسانوں کی کہانیاں بند ہیں جو کسی نہ کسی کارن دماغی سکون سے محروم ہو گئے اور پھر کبھی نہ ٹھیک ہو سکے۔ ہو بھی گئے تو پہلے جیسے کبھی نہ رہے۔ ہمیں دیکھو ہم ڈاکٹر اور دوسرے لوگ دن رات انہی کے درمیان رہتے ہیں۔ ان کا علاج کرتے ہیں۔ ان کی بے تکی باتیں سنتے ہیں۔ ان کی مار بھی سہتے ہیں۔ کبھی کبھی انہیں خود بھی بے دردی سے مارنے لگتے ہیں۔ پھر بھی ہم اس طرح تو کبھی نہیں گھبرائے جس طرح تم گھبرا اٹھے ہو!"

ڈاکٹر میمونہ نے اسی وقت کسی کو میرے لیے چائے لے آنے کا اشارہ کر دیا تھا اور کچھ ہی منٹ کے بعد ایک بہت ہی خوبصورت اور بھرپور جوان لڑکی چائے کی ٹرے لیتے ہوئے اندر آ گئی۔ اتنا بڑا دل ہلا دینے والا منظر دیکھ چکنے کے بعد اچانک ایک بے حد حسین لڑکی کو اپنے سامنے کھڑا پا کر میں اور بھی ہکا بکا رہ گیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ڈاکٹر راج اور کبھی ڈاکٹر میمونہ کی طرف دیکھتا کبھی اس دبلی پتلی اور لمبی لڑکی کی جانب جس نے اسپتال کا دیا ہوا کھلا کھلا کرتا اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔

اس لڑکی نے میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر پہلے تو تازہ دھلے ہوئے اور سوکھتے ہوئے اپنے لمبے بالوں کو آگے گرنے سے روکا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں جلدی جلدی گردن کے پیچھے باندھ لیا۔ پھر چائے بناتے ہوئے پوچھا: آپ کے لیے کتنی شکر ڈالوں؟"

جب اس نے شکر سے چمچ بھر کر میری طرف دیکھا تو میں نے اپنی محویت سے چونک کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا جو میری ہی جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا شاید اس نے میری بدلتی ہوئی کیفیت کو بھی بھانپ کر اس لڑکی سے کہا۔" ناہید' تم تھوڑی دیر میرے دوست کے پاس بیٹھ کر باتیں کرو اور انہیں چائے بھی پلاؤ تب تک میں اور ڈاکٹر میمونہ ایک وارڈ کا راؤنڈ کر آئیں۔

ناہید اور میں تنہا رہ گئے اور میں نے اس کی بنائی ہوئی چائے کی تعریف کی تو اس نے بڑی شستہ انگریزی میں میرا شکریہ ادا کیا اور خوش بھی دکھائی دی۔ میں نے اس کے لباس کا پھر جائزہ لیا جو اسپتال کے

معمولی کلرنڈوں جیسا ہرگز نہیں تھا۔ وہاں کے مریضوں کا جیسا ہلکے نیلے رنگ کے دھاریوں والے سوتی کپڑے کا بنا ہوا تھا اس کے جسم کے سارے ابھار اس کے لباس میں سے تاک جھانک کر رہے تھے لیکن وہ اپنے آپ سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتی تھی وہ میری للچائی ہوئی نگاہوں کو نظرانداز کر کے گھونٹ گھونٹ چائے پیتی رہی۔

میں خوش تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے ایک بہت ہی بھیانک منظر سے آناً فاناً نجات مل گئی تھی۔ اسی لیے اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا بھی رہا تھا۔ میرے مسکرانے پر وہ بھی کبھی کبھی وقت مسکرا دیتی تھی اور مجھے یک بیک یہ احساس ہو گیا کہ اس کی پرسنالٹی کا سب سے بڑا جادو اس کی اسی دلنشیں مسکراہٹ میں مضمر ہے اور میرا جی چاہا اس سے کہہ دوں۔ آپ کے پاس تو مسکرانے کا اتنا بڑا آرٹ ہے جو عام طور پر لاکھوں لڑکیوں میں ایک دو ہی کے حصّے میں آتا ہے لیکن میں نے بات چھیڑنے کے لیے کچھ اور ہی پوچھا۔ "آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے ؟"

وہ بڑی بے تکلفی سے بولی۔ "ایم اے کیا تھا۔"

"ایم اے کونسے سبجکٹ میں ۔ شاید انگلش میں ہی کیا ہوگا۔!" میں نے یہ اندازہ اُس کے انگریزی بولنے سے لگایا تھا۔

"جی نہیں بنگالی میں ۔ میری مادری زبان یہی تھی، فادر دوسرے صوبے کے تھے" اُنھوں نے پھر انگریزی میں جواب دیا۔ "انگلش تو میں نے بی اے تک ہی لے رکھی تھی۔"

میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اور کیا پوچھوں اس سے ! اس نے میرا پیالہ خالی دیکھ کر کہا۔ "ایک کپ اور بنا دوں ؟"

"ضرور۔ اس تکلیف کے لیے بہت شکریہ بھی۔"

"جی اس میں تکلیف کیسی !" وہ مسکرانے لگی۔ "یہ تو میرا فرض ہے اپنے ڈاکٹر صاحب کے مہمان کی پوری پوری خاطرداری کروں۔"

"اچھا، ڈاکٹر ملک نے آپ کا نام ناہید ہی تو بتایا تھا !"

"جی میرا نام ناہید ہے"

"بس ناہید ۔ یا اور بھی کچھ !"

"اور کچھ سے مطلب ؟" وہ کچھ حیران ہوئی پھر کچھ مسکرا کر بولی "اتنا ہی نام کافی نہیں ہو سکتا !"

"ہو سکتا ہے" میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی جیسا کہ ۔ عام طور پر نام کا کوئی نہ کوئی

دوسرا حصّہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی "

"آپ کا مطلب ہے ناہید منہاج یا ناہید سلطانہ یا ناہید فاروقی، ناہید مرتضےٰ علی وغیرہ وغیرہ !" یہ کہہ کر وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ میں نے بھی ہنس کر معذرت پیش کردی۔

"آئی ایم سوساری۔ مجھے ایسا بے سرو پیر کا سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ ویسے صرف ناہید بھی بہت پیارا نام ہے آپ کی مسکراہٹ کی طرح !"

"تھینک یو۔ معلوم ہوتا ہے آپ تعریف کرنے کا آرٹ خوب جانتے ہیں"

"جی ہاں، اتفاق سے لیکن میں جھوٹی تعریف نہیں کیا کرتا۔" یہ سن کر وہ بے اختیار ہنستی ہی چلی گئی۔ اس کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ گرتے گرتے بچا جسے میں نے ہی ہاتھ بڑھا کر تھام لیا، اس کی ہنسی رکی تو اس نے اپنی آستینوں سے ہی اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ خدارا مجھے اتنا بھی مت ہنسایئے ورنہ ہچکی ہوجائے گی۔ "اچھا یہ بتایئے آپ یہاں کیسے ہیں۔ یعنی اس ماحول میں ؟"

"کیوں ؟" وہ حیران ہوکر بولی۔ "میں یہیں تو رہتی ہوں۔"

"یہاں ! میرا مطلب ہے۔ اس پاگل خانے میں !"

"تو کیا ہوا ! اور بھی تو بہت لوگ رہتے ہیں یہاں۔ جن کو آپ پاگل کہہ رہے ہیں وہ بھی تو انسان ہی ہیں !"

"جی ہاں، واقعی وہ بھی انسان ہی ہیں مجھے آپ سے ایک مرتبہ پھر معافی مانگنی چاہیئے۔ میں ایک اور بیہودہ سوال کر بیٹھا لیکن میرا مطلب یہ تھا آپ جیسی تعلیم یافتہ، ذہین اور خوبصورت لڑکی کو تو کسی گھر بسانا چاہیئے تھا جس مقصد کے لیے خالق نے یقیناً اپنے ہاتھوں ہی سے آپ کی تخلیق کی ہوگی آپ کسی بہت ہی خوش قسمت آدمی کی بیوی بن سکتی تھیں جو آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا ؟" معاف کیجئے گا۔ میں پھر تعریف کرنے پر اتر آیا ہوں۔ اور اس بار بھی بالکل جنیوئن تعریف کر رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں زور سے ہنس پڑا۔

لیکن وہ اب خوش نہ دکھائی دی۔ بلکہ میری طرف بڑی حیرت سے دیکھنے لگی۔ جس طرح میں نے اسے پہلی بار دیکھ کر سخت حیرت کا اظہار کیا تھا۔ اور پھر۔ وہ اچانک چیخ اٹھی "آپ کہتے ہیں مجھے کسی خوش قسمت آدمی کی بیوی بننا چاہیے تھا ! آپ کہتے ہیں وہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا !"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ زور زور سے اپنے منہ پر دوہتڑ مار مار کر رونے لگی۔ میں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے میز پر رکھے ہوئے چائے کے سارے برتن ادھر ادھر پھینک دیئے۔ اس کی چیخیں سن کر اسپتال کے دو آدمی بھاگتے ہوئے اندر آگئے انہوں نے مل کر اس پر قابو پانا چاہا تو اس نے بلا کی قوت سے دونوں کو زمین پر پٹخ دیا اور کرسیاں اٹھا اٹھا کر ان پر پھینکنے لگی۔

جس منظر کو میں نے اپنے لیے بے حد راحت آمیز سمجھ لیا تھا وہ پہلے منظر کی مانند وحشت سے

بھر گیا۔ قریب تھا کہ وہ مجھ پر بھی حملہ آور ہو جاتی۔ ڈاکٹر راج اور کئی دوسرے لوگ بھاگتے ہوئے اندر آ پہنچے۔ سب نے مل کر اسے ایک اسٹریچر پر لٹا دیا۔ اور پھر ایک مضبوط رسی سے بھی جکڑ دیا لیکن وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی رہی۔ ڈاکٹر راج نے اس کی کنپٹیوں کے ساتھ بجلی کی ایک بلیٹ باندھ دی اور اسے آٹھ سو والٹ کے دو بار شدید جھٹکے لگائے۔ وہ بے ہوش تو ہو گئی لیکن ذبح کیے ہوئے کسی بہت بڑے پرندے کی طرح تڑپنے لگی۔ میرے لیئے یہ منظر دیکھنا بھی تکلیف دہ ہو گیا لیکن میں وہاں سے ہٹ نہیں سکتا تھا کچھ دیر بعد وہ گہری نیند سو گئی اور اسپتال کے کارندے اسے اسی طرح اسٹریچر پر لیٹے لیٹے اٹھا کر لے گئے۔

میں بے حد خاموش اور کھویا کھویا سا رہ گیا۔ فرش پر الٹی پڑی ہوئی ایک کرسی کو سیدھا کر کے بیٹھ گیا اسی لمحے ڈاکٹر ملک میرے سامنے آکر میز کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ بولا "انور تم نے یقیناً اس کے ساتھ شادی وادی کا ذکر چھیڑ دیا ہوگا۔ تمہیں نہیں معلوم وہ اسی ذکر پر کس قدر برہم ہو جاتی ہے اس کی دماغی بیماری کی جڑ شادی سے محرومی ہے اس کی کیس ہسٹری میں دو باتوں کا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے پہلی تو یہ کہ اس کے منگیتر نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا، دوسری جب سے وہ اس ہاسپٹل میں بھرتی کی گئی ہے اس سے ملنے کے لیے اس کے خاندان کا کوئی آدمی آج تک نہیں آیا۔

ڈاکٹر راج جس خوبصورت لڑکی کا قصہ بیان کر رہا تھا اس کی دلکشی کا سارا امیج اب میرے ذہن سے غائب ہو چکا تھا۔ میں آنکھیں کھولے ہوئے اس کی باتیں سن رہا تھا لیکن تصور میں ابھی تک اسی کو دیکھ رہا تھا کس طرح اسے قابو میں کر کے اسٹریچر کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا اور وہ کس بے چارگی سے مرغ بسمل کی طرح تڑپی تھی، جب اسے بجلی کے ہائی پاور کے دو شاک لگائے گئے تھے!

کچھ لمحوں تک خاموش رہ کر میں نے پوچھا۔ "اس کا منگیتر کون تھا؟ اس نے ناہید کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیوں کیا تھا؟"

ناہید کے بھائیوں نے صرف اتنا بتایا تھا کہ ان کے والد نے جو پولیس میں ایس پی تھے اس کی منگنی اپنے ایک نوجوان ڈی ایس پی کے ساتھ طے کر دی تھی لیکن ایک مہم میں اچانک ان کے والد گولی کھا کر چل بسے اس کے بعد ناہید کے منگیتر نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا، وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکی وہ اسے یہاں لا کر چھوڑ گئے۔ اس کے بعد کسی نے آکر اس کی خیر خیریت نہیں پوچھی ہے جیسے وہ اپنے خاندان کے لیئے مر چکی ہو۔ اپنے والد کی وفات کے بعد لاوارث بن گئی ہو!

کیا اس نے اپنے منگیتر کو کبھی دیکھا تھا؟ دماغی توازن کھونے سے پہلے اس کے پاس جا کر پوچھا

تھا وہ اس کے ساتھ شادی کرنے سے کیوں انکار کر رہا ہے۔؟"
شاید نہ دیکھا ہو اور اس سے کبھی مل بھی نہ سکی ہو لیکن تم کیوں اس قدر سنجیدہ ہو رہے ہو؟
ہمارے یہاں ایسے سینکڑوں کیس ہیں جو زیادہ ہمدردی کے مستحق ہیں اور ان کا بھی اب کوئی والی وارث نہیں ہے!
اس وقت تو میں نے ڈاکٹر راج کو کوئی جواب نہ دیا اور اس کے ساتھ اسپتال سے باہر چلا آیا
لیکن میرے دل و دماغ پر ناہید ہی چھائی رہی پتہ نہیں کیوں اس نے بہت تھوڑی سی دیر کی ملاقات میں
مجھے اس قدر متاثر کر لیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا اس کی تمام تر کیفیت کے لیے میں ہی ذمہ دار ہوں
اس کا وہ بے وفا منگیتر میں ہی تھا۔ بےرحمی سے بھرپور وہ گھناؤنا کردار میرا تھا۔ مجھے اپنے آپ
سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ میں رات بھر بستر پر بڑی بےچینی سے کروٹیں بدلتا رہ گیا۔ میرے
ہونٹوں سے بار بار کوئی بہت اندر سے دھیرے دھیرے 'ناہید' ناہید' پکارتا رہا۔ اور کہتا رہا۔
میں بہت نادم ہوں ناہید! میں بالکل بےبس ہو گیا تھا۔ میں تمھارے ساتھ شادی کرنے سے اس لیئے
انکار نہیں کر دیا تھا کہ تمھارے ایک بہت بڑے افسر باپ کی اچانک موت نے میری نظروں میں تمھاری
اہمیت ہی ختم کر دی تھی یا مجھے تمھارے بھائیوں کی خود غرضی کے بارے میں مجھے پہلے سے علم تھا! اس کا
حقیقی سبب بالکل دوسرا تھا جو اس وقت تمہیں بتا بھی نہ سکا میں نے ابھی تک کسی سے شادی نہیں کی
ہے صرف اس انتظار میں کہ میرے حالات ذرا سازگار ہو جائیں تو تمھارے پاس واپس آ جاؤں۔ تم سے
معافی بھی مانگوں اور تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔
اگلی صبح اٹھتے ہی میں نے ناشتے کی ٹیبل پر ڈاکٹر راج اور اس کی بیتی سے صاف صاف کہہ دیا
" میں آج ناہید سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کل کے بجلی کے جھٹکوں سے نارمل ہو چکی ہوگی۔ کم سے کم
میری بات تو سن ہی لے گی۔ اسے بتا دوں گا میں اس کا منگیتر اعجاز رفعی ہوں جس دن اس کے والد کی
موت واقع ہوئی اس روز میرے آبائی شہر میں ہمارا مکان گر گیا تھا۔ سارا کنبہ دب کر ہلاک ہو گیا
صرف میں بچ گیا اور کئی مہینوں تک پریشان رہا۔ اسی وجہ سے میں اپنی ملازمت کے فرائض بھی نہ
سنبھال سکا اور نوکری سے الگ کر دیا گیا۔ اب میں اپنا کوئی چھوٹا موٹا سا بزنس شروع کر کے اس کا اور
اپنا پیٹ بھر سکوں گا۔ اگر وہ میرے گھر کی زینت بننا قبول کرلے۔"
ڈاکٹر راج نے میری طرف بڑی مشتبہ نظروں سے دیکھا "تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا! تم تو
انور سراج ہو اعجاز رفعی کیسے ہو سکتے ہو؟"
مسز راج ملک نے بھی بڑی حیرانی دکھائی "بھائی صاحب، آپ کی تو بیوی اور ایک بچی

بھی ہے۔ اور آپ کچھ ہی مہینوں کے لیئے یہاں آئے ہیں۔ یہ سب کیوں سوچ رہے ہیں؟ ناشتہ کر کے سو جیئے۔ شاید رات کو آپ اچھی طرح سو نہیں پائے۔"

ڈاکٹر راج اسپتال گیا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اپنے دل میں جو فیصلہ کر لیا تھا اُس پر سختی سے قائم تھا اور ناہید کو بھی میں یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں ہی درحقیقت اعجاز رضی ہوں جو اس کی تلاش میں ایک مدت سے بھٹک رہا تھا۔ یہ سن کر اس کی کھوئی ہوئی مسرت اور فطری شرم و حیا لوٹ آئی۔ وہ میرے ساتھ بیار دنیا سے باہر نکل آنے کے لیئے فوراً تیار ہو گئی۔ لیکن ڈاکٹر راج پریشان ہو اٹھا۔ مجھے الگ لے جا کر بولا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو! تم اسے پاکستان نہیں لے جا سکتے۔ نہ ہی اس کے ساتھ یہاں رہ سکتے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہیں تمہیں بھی اب یہیں نہ رکنا پڑ جائے۔

میں نے جواب دیا۔ "یار تم کیوں گھبرا رہے ہو! اچھی طرح جانتے ہو کہ میں یہ سب ایک انسانی جذبے کے تحت کر رہا ہوں۔ اس کے لیے میں اپنی شناخت تک کھونے کے لیئے تیار ہوں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیئے تمہارا ایک پیشنٹ ہمیشہ کے لیے ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔ اتنا تو تم مجھے جانتے ہو صرف اپنے اور تمہارے ملک کو نہایت بے ضرر سا چکمہ ضرور دوں گا تاکہ یہاں رہ سکوں یہاں نہیں تو کسی دوسرے شہر میں۔ جہاں بھی تم کہو گے۔ لیکن تمہیں میری کچھ مالی مدد بھی کرنی ہو گی۔ پندرہ بیس ہزار تک کی، کوئی بھی بزنس شروع کر لوں گا۔ خدا نے چاہا تو تمہاری پائی پائی مع سود کے واپس کر دوں گا۔ ہو تو ہندوستانی بنیا نا! سود کیوں معاف کرنے لگے!

مجھے ہنستا ہوا دیکھ کر بھی وہ سنجیدہ بنا رہا۔ پھر بولا۔ "ہندوستان میں تمہارے قیام کی مدت ختم ہو جائے گی تو کسی نہ کسی روز تمہاری تلاش شروع ہو جائے گی۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔

کہہ دینا 'یہاں سے تو واپس چلا گیا تھا پھر پتہ نہیں کیا ہوا اس کا۔ راستے میں کہیں مر کھپ گیا ہو گا۔ حادثے تو روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کتنے بھارتی پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پہچان سکتا۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی یار میرے۔ کہو تو کسی بعد کی تاریخ کا لیٹر لکھ کر چھوڑ جاؤں؟ میں بالکل خیر خیریت سے اپنے وطن پنڈی پہنچ گیا ہوں۔ بس! اور اتنا اعتماد تو تم مجھ پر کر ہی سکتے ہو میں تمہارے ملک کے خلاف جاسوسی واسوسی جیسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔"

میں نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کلکتہ کے ایک محلہ کالو ٹولہ سے کیا۔ ہماری شادی ایک مختصر سی تقریب میں ڈاکٹر راج ملک کے ہی گھر پر سرانجام پا گئی تھی۔ اس میں ان کے بہت ہی قریبی چند دوست شریک ہوئے تھے۔ جن سے میں اعجاز رضی کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا۔ میں نے اپنی انور سراج

سوری کی شناخت کو اسی لمحے سے سدا کے لیے ختم کر دیا تھا۔ راولپنڈی میں رہنے والی اپنی بیوی نسرین اور دس برس کی بیٹی فوزیہ کو بھی بھلا دیا تھا۔ اپنی شناخت کے ساتھ ان کی یاد کو بھی دفنا دیا۔ اپنے دل کے تاریک ترین گوشے میں جس میں میرے سوا اور کوئی نہیں جھانک سکتا تھا میں نے یہ بھی طے کر لیا تھا اس کوٹھڑی کا در پھر کبھی نہیں کھولوں گا۔

بعض بیویاں اپنے آدمیوں کے لیے بے حد خوش نصیب ثابت ہوتی ہیں۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ خوبصورت اور سلیقہ مند ہونے کی وجہ سے گھر کو پرکشش بنا دیتی ہیں بلکہ وہ اپنے پیچھے بے انداز آسودگی بھی لے آتی ہیں۔ ان کے قدم رکھتے ہی گھر میں روپے پیسے کی ریل پیل ہو جاتی ہے۔ ناہید بھی میرے لیے انہی خوش بخت بیویوں میں تھی، بہت تھوڑے سے سرمائے سے میرا چمڑے کا کاروبار چل نکلا اور میں جلد ہی اپنی دکان پر تین کارندے بھی رکھنے کے قابل ہو گیا جو منڈی سے چمڑا خریدنے، پرکھنے اور اسے باہر بھجوانے کے علاوہ حساب کتاب بھی رکھتے تھے۔ حساب کتاب پر نگرانی رکھنے میں ناہید بھی بڑی ماہر نکلی۔ وہ گھر کا ہی نہیں میرے کاروبار کے بھی بہی کھاتے کبھی کبھی گھر پر منگا کر دیکھ لیتی تھی کہ کہیں پر کوئی کارندہ خرد برد تو نہیں کر رہا ہے اس طرح اس نے مجھے کئی معاملات کی طرف سے بے نیاز سا کر دیا۔ جب ہمارے پانچ برس کے عرصے میں آگے پیچھے دو بچے بھی ہو گئے تو ان کی پرورش کے علاوہ ابتدائی تعلیم کی ساری ذمہ داری بھی اسی نے خود سنبھال لی، میں نے بچوں کو کسی موڈرن اسلامی اسکول میں داخلہ دلانا چاہا تو اس نے میری تجویز رد کر کے انہیں سینٹ جوزف میں ڈلوا دیا۔ جب بچے گھر لوٹ کر آجاتے تو وہ خود ہی انہیں اسکول کی کتابوں کے علاوہ تھوڑی بہت عربی بھی پڑھا دیتی تھی جس طرح اس نے خود گھر پر رہ کر اپنے بچپن میں اپنے والد سے قرآن شریف پڑھا تھا اسی طرح وہ بھی اپنے بچوں کو تربیت دیتی رہی، یہ سب دیکھ کر کبھی کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی۔ وہ کچھ برس تک اپنی خوشیوں سے محروم رہ کر ضرورت سے زیادہ ذہین تو نہیں ہو گئی ہے! ہو سکتا ہے دماغی طور پر بیمار رہنے کی وجہ سے اس کے بھیجے کے بعض خلئے زیادہ کام کرنے کے قابل ہو گئے ہوں، بہرحال میں خوش اور مطمئن تھا کہ میں نے اس کے ساتھ جو نئی زندگی شروع کر لی تھی وہ میری پہلی ازدواجی زندگی سے کسی درجہ کم پر بہار اور طمانیت بخش ہرگز نہیں تھی۔

ہمارے درمیان کبھی کبھی پولیٹکس اور ملک کے عام حالات پر بھی بحث چھڑ جاتی تھی، اتنے بڑے ملک میں جہاں آبادی اور صنعتی و تجارتی بھاگ دوڑ کی کوئی حد نہیں مقرر کی جا سکتی ہو اور جہاں اتنے زیادہ مذاہب کے لوگ رہتے ہوں وہاں ملک کے کسی بھی حصے میں کبھی کبھی فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہو جاتا تو میرا دل دہل جاتا، دوسرے کئی مسلمانوں کی طرح جن کے درمیان میں رہتا تھا لیکن میں ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے

اپنے اس نقطۂ نظر کو بھی نہیں بھول پاتا تھا جو قیام پاکستان کا منطقی جواز بنتا تھا۔ لیکن ناہید کی ذہنی پرورش بالکل دوسری سطور پر ہوئی تھی وہ ایک عام ہندوستانی مسلمان سے بھی کافی مختلف واقع ہوئی تھی جس میں اس کے اپنے مطالعے اور فکر و نظر کا بھی یقیناً دخل تھا جب کہیں ہندو مسلم فساد برپا ہوجاتا تو وہ فوراً جذباتی ہو اٹھنے کے بجائے اس کے معاشی اسباب پر بحث کرنے بیٹھ جاتی تھی وہ ہر فساد کی جڑ میں انسانوں کی معاشی نابرابری یا تجارتی کمپٹیشن کا ہی ہاتھ دیکھ لیتی تھی۔ جبکہ میں اس قسم کے سانحات کے پیش نظر دو قومی نظریے کی بنیاد پر پاکستان کا بن جانا ہی حق بجانب سمجھتا تھا ایک دن اس نے میرے دلائل کا بہت سخت لہجے میں جواب دیا۔ "اعجاز تم ہر بات ایک پاکستانی کی طرح کیوں سوچتے ہو؟ پاکستان کے استحکام کا انحصار اب دو قومی نظریے پر نہیں بلکہ اس کے معاشی نظام پر ہوگا اسے اگر جذباتی نعروں کے نیچے دبا کر رکھا گیا تو دیکھ لینا وہاں ایک دن بڑی تباہی مچے گی"

میں اس کے سامنے پاکستان کی حمایت میں زیادہ نہیں بول سکتا تھا ڈرتا تھا کہیں اس پر میرے درحقیقت ایک پاکستانی ہونے کا راز نہ کھل جائے لیکن اس کے ساتھ رہتے رہتے میں رفتہ رفتہ اس بات کا قائل ہوگیا کہ اپنے ملک کی کئی خرابیوں کو اپنے ملک سے باہر نکل کر ہی بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ کسی ایسے ملک میں رہ کر جہاں سوچنے سمجھنے اور اظہار پر کسی قسم کی پابندیاں نہ ہوں!

بنگال میں بائیں بازو کی حکومت چل رہی تھی جو ایک بار ٹوٹ کر پھر برسر اقتدار آگئی تھی وہاں کے لوگ اس معاملے میں خاصے جذباتی مگر آئیڈیلوجیکل بھی تھے۔ کلکتہ ایسے ہی لوگوں کا بہت بڑا مرکز تھا ایک تجارتی منڈی میں رہتے ہوئے بھی جہاں ہر طرف کیچڑ کی بدبو بسی رہتی تھی، چھوٹے بڑے مزدور اور تاجر تک معاشی و اقتصادی مسائل پر خاصی اچھی بحثیں چلا لیتے تھے اور اپنی پارٹی کے ایک ہی اشارے پر کام چھوڑ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہوجاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا وہ صرف اپنے صوبے کے لیے نہیں پورے ملک کے نظام کے لیے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اس ہجوم کے اندر میں بھی کہیں پر ایک فرد کی حیثیت سے موجود تھا جو محسوس بھی کر سکتا تھا کہ میرے ملک کے لوگ بھی اسی طرح سوچ سکتے تو وہاں کے حالات آج کتنے مختلف ہوتے!

ہمارے بچے چونکہ شروع ہی سے بنگالی ماحول میں پرورش پا رہے تھے اور اپنے اسکول سے بس میں آتے جاتے راستے میں کئی جلوسوں کو دیکھتے اور لوگوں کے نعرے بھی سنتے تھے تو وہ گھر لوٹ کر ویسے ہی بڑے جوش سے نعرے لگانے لگتے تھے ۔ چول بے نا ۔ چول بے نا، انقلاب جندہ باد جندہ باد! یہ دیکھ کر میں پریشان سا ہوکر ناہید سے کہہ اٹھتا۔ ہمارے بچے بھی بڑے ہوکر کہیں کیمونسٹ نہ بن جائیں۔

وہ جھٹ سے جواب داغ دیتی ۔ "بننے دو جو کچھ وہ بننا چاہتے ہیں، ہم انہیں روک تھوڑے ہی

سکتے ہیں۔ تم انہیں اپنی مرضی سے مولوی نہیں بنا سکو گے۔ میں تو خوش ہوں گی اگر انہی میں سے کوئی مارکس یا لینن بن گیا۔ جس کی ہمارے دیش کو بڑی ضرورت ہے۔"

"دیکھو ناہید۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہندوستان ایک کثیر المذاہب ملک ہے یہاں گاندھی جیسا بڑا ہند لیڈر یا مولانا آزاد جیسا اسلامیات کا عالم ہی پیدا ہو سکتا تھا۔ پنڈت نہرو جیسا عالمی مفکر اور مدبر بھی اتفاق سے پیدا ہو گیا۔ جس نے نئے ہندوستان کی نیاد رکھی۔ لیکن عوام اسکی اہمیت سے ابھی تک پوری طرح واقف نہیں ہو سکے۔ وہ اسے عالمی سیاست میں تو جگہ دیتے ہیں اپنی قومی سطح پر رکھ کر نہیں دیکھتے۔"

"گاندھی اور آزاد کی جگہ جنگ آزادی کی تاریخ میں ہے جو جنگ کم اور سیاسی جذبہ زیادہ تھی۔ نہرو کے بارے میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں پھر بھی۔ وہ کچھ دیر خاموش ہو کر بولی۔" میں کیمونسٹ تو نہیں ہوں کہ جذباتی ہو کر کوئی پیشگوئی کر سکوں، اتنا ضرور کہوں گی، ہمارے بچے ہی میرے اس اعتماد کو دن بدن مضبوط کر رہے ہیں کہ اب بھی کثیر المذاہب ملک ہی ایک بہت بڑا سوشلسٹ لیڈر پیدا کر سکتا ہے جو یہاں کے سارے مذہبی تفرقوں کو معاشی اتحاد کی طرف موڑ دے گا۔

ناہید اپنی بات اس قدر مضبوط لہجے میں کہتی تھی کہ میں اسے رد کرتے وقت جھجک جاتا تھا کہیں وہ شدید طور پر برہم نہ ہو اٹھے، میں اس کے سامنے خود کو کچھ دبا ہوا بھی محسوس کرتا تھا جو کچھ وہ کہتی تھی اسے بڑی خاموشی سے سن لیتا تھا۔ اس وقت میرے اندر کسی قسم کی شکایت یا مخالفت نہیں ہوتی تھی، بس ایک طرح سے ہتھیار ڈال کر مطمئن ہو جانے کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی، اس کے بعد ہم ہنس پڑتے تھے اور یہی محسوس کرتے تھے ہم ایک دوسرے کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے۔ اگرچہ وہ اور ہمارے بچے بنگالی گانوں کے زیادہ دلدادہ تھے۔ وہ تینوں میرے سامنے مل کر گانے لگتے تھے۔

مور ردئیر گر پون بی جو نے گھورے
ایکالے ردئے چپر نیر وب شون لورے

(میرے اندر چھپا ہوا جو ایک گھر ہے اور اس کی اپنی تنہائی ہے اس نے میری آواز کا بھی گلا گھونٹ دیا ہے۔

پرتیا ہے جاگو جاگو جاگو
(محبوب جاگو جاگو جاگو!)
رودّو دارے باہیرے داداۓ آمے

آر کولو کال امو نے کاتی بے شامے
پر تیا ہے جاگو جاگو جاگو
(دھوپ میں اس طرح کھڑے کھڑے کتنے جگ اور بیت جائیں گے۔ محبوب جاگو
جاگو جاگو!)

ناہید مجھے اپنی طرف اجنبیت سے تکتا ہوا پاکر مجھے بلانے لگتی تھی۔ یہ راگ بہار میں پوچارگان ہے میرا جی چاہتا میں بھی اسے اپنے وطن کے سرائیکی اور پوٹھوہاری گیت سنا کر ان کا مطلب سمجھاؤں۔

ہجراں دا چن چڑھیا ٹو بے سک گئے نیں
کیہڑا موسم وڈیا ٹو بے سک گئے نیں
ہن تاں یار دا ملنا اوکھا لگدا ہے
تن من میڈا اسڑیا ٹو بے سک گئے نیں

(فراق کی شب میں چاند نکل آیا لیکن جوہڑ سوکھے پڑے ہیں یہ کیسا موسم آیا ہے کہ جوہڑ تالاب تک سوکھ گئے ہیں اب تو محبوب سے ملنا بھی مشکل معلوم ہو رہا ہے میرے تن بدن میں ایک آگ سی لگی ہے لیکن جوہڑ سوکھا پڑا ہے۔)

سارے لوک گیتوں میں ایک سا درد ہوتا ہے ایک سی تنہائی اور دھوپ کا احساس اور محبوب کی یاد جن میں اس سے کچھ بھی نہیں کہہ پاتا تھا لیکن میرے لیے وطن کی یاد اسی محبوب کی یاد بن کر جاگ اٹھتی تھی۔ اس یاد کا ایک روپ نسرین بھی تھی اور میری بیٹی فوزیہ بھی اور کبھی کبھی وہ میرے کتنے سارے دوستوں اور عزیزوں کا بھی روپ دھار لیتی تھی لیکن مجھے کھویا کھویا دیکھ کر میرے بچے اور ناہید میرے گرد جمع ہو جاتے تو میں سب کچھ بھول جاتا۔

کبھی کبھی ڈاکٹر راج ملک کا خط آ جاتا تھا لیکن میں نے اسے منع کر رکھا تھا اگر پنڈی سے کوئی خط آئے تو اس کا ذکر میرے خط میں نہ کیا کرے۔ دونوں بیوی پتنی دو تین بار چند روز کے لیے ہمارے پاس آ کر رہے تھے۔ ہم بھی ان کے پاس ایک بار ہو آئے تھے۔ راج نے ایک بار مجھے اکیلے میں بتایا تھا میری بیٹی فوزیہ کی ایک پائلٹ کے ساتھ شادی ہو چکی ہے اور میری بیوی نسرین نے میری واپسی سے مایوس ہو کر کسی ادھیڑ انجینئر کے ساتھ دوسرا نکاح کر لیا تھا جس کی پہلی بیوی تین بچے چھوڑ کر مر چکی تھی۔ اب میرے خاندان کے لئے میرا وجود ختم ہو چکا تھا۔ یہ سوچ کر میرے اندر ایک ہلچل تو ضرور مچ جاتی تھی لیکن پشیمان ہرگز نہیں تھا

ناہید کو دیکھ کر میں سارے دکھ بھول جاتا تھا وہ میرے لیے اب بھی بڑی کشش رکھتی تھی۔

سن اکہتر کی جنگ میں ناہید نے رضا کارانہ طور پر کئی امدادی انجمنوں میں والنٹرانہ کام کیا، مجھ سے کئی ہزار روپے لیکر مشرقی پاکستان سے آنے والے ریفیوجیوں پر خرچ کر ڈالے۔ میں نے اس کے لیے اسے کبھی منع نہ کیا۔ ایک دن جب وہ مجھ سے ایک اور چیک کٹوا رہی تھی، ہم اپنے لان پر دھوپ میں بیٹھے تھے تھوڑی دیر پہلے خطرے کا سائرن بج چکا تھا لیکن ہمارے اوپر سے کوئی بمبار جہاز نہیں گزرا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا: "ہمارے پڑوسی ملکوں کے درمیان یہ جنگیں قطعاً غیر ضروری ہیں۔ اور دونوں کے لیے بدبختی کا سبب بھی۔"

ناہید نے میری طرف ایک عجیب سی مسرت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: "اب تم نے احساس کر لیا نا! یہ بات دونوں ملکوں کے عوام بھی جانتے ہیں ہر جنگ کے بعد انتہائی بدحالی اور مہنگائی کا بھی صرف وہی شکار ہوتے ہیں۔

سن پینسٹھ میں میں پاکستان میں تھا جب لڑائی چھڑ گئی تھی۔ اس وقت وہاں ایک قسم کے جہاد کا جوش و خروش تھا۔ میں نے ناہید سے کہا: پاکستان ریڈیو کی خبروں سے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارا ملک ہندوؤں کا ہے جس کے خلاف ایک مذہبی جنگ لڑی جا رہی ہے۔"

ہاں لیکن یہاں ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے ہم امریکہ کی ہی ڈپلومیسی کے خلاف ایک دماغی جنگ لڑ رہے ہیں وہی دونوں ملکوں کو ہتھیار اور مالی امداد بھی دیتا ہے اور انہیں آپس میں لڑا کر بالکل بھنگی بنا دیتا ہے۔"

شاید امریکہ ہندوستان کی ایشیا میں جغرافیائی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جبکہ وہ پاکستان کا محافظ بننے کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔"

"یہ بات تو خود پاکستانیوں کو سمجھنی چاہیئے۔ امریکہ نے ان کی ایک بار بھی موثر امداد نہیں کی۔ الٹا اسے اپنے پڑوسی روس کی نظروں میں بھی مشکوک بنا رکھا ہے۔"

"ناہید کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے تم کمیونسٹ ہوتی جا رہی ہو!" میں نے ہنس کر کہا۔

لیکن وہ سنجیدہ ہو کر بولی: "میں صرف ایک گھریلو عورت ہوں اور تمھاری بیوی۔ کیا تم نے مجھے کبھی پارٹی آفس جاتے ہوئے دیکھا ؟"

"نہیں۔ لیکن تم سوچتی انہی لوگوں کی طرح ہو۔"

"میں بھی تو وہی اخبار اور رسالے پڑھتی ہوں جو تم پڑھتے ہو ممکن ہے ہم دونوں کے

سوچنے سمجھنے میں کچھ فرق ہو"

ان لمحوں میں، میں نے اس کی آنکھوں میں وہی بے چینی دیکھی جو میاں بیوی کے درمیان اکثر چھوٹی چھوٹی گھریلو باتوں پر پیدا ہو جاتی ہے، اس بے چینی کو ختم کرنے ہی کے لیے میں اپنی کرسی چھوڑ کر اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھنے کے لئے ابھی جھکا ہی تھا کہ خطرے کا سائرن پھر بج اٹھا اور دو تیز رفتار جیٹ ذان سے ہمارے سروں پر سے ہو کر گزر گئے اور دور کہیں بڑے زور کا دھماکہ بھی سنائی دیا۔ ناہید فوراً کرسی سے اٹھ کر میرے سینے کے ساتھ لگ گئی تب تک چپکی ہوئی سی کھڑی رہی۔ جب تک خطرہ دور ہو جانے کا سائرن نہ بجا، اس نے اپنے آپ کو میرے بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے کہا۔" میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ تمہارے پاس خود کو اس قدر محفوظ سمجھتی ہوں۔"

میں اسے مکان کے اندر لے جاتے ہوئے بولا۔" تمہارے جیسی بیوی کو پا کر تو میں اپنا سارا ماضی بھول چکا ہوں۔ جیسے اس سے پہلے میرا اپنا کوئی تھا ہی نہیں۔!"

وہ شرارت سے مسکرا کر بولی۔" تم اپنے ماضی کو بھول سکے وہ تو ایک الگ بات ہوئی لیکن اس میں کوئی نہ کوئی ایسی تو ضرور ہو گی جس کی کمی میں نے آ کر پوری کی ہے۔"

یہ وہی لمحہ تھا جس میں عام طور پر محبت کرنے والے شوہر اپنی بیویوں کو قسمیں کھا کر یقین دلایا کرتے ہیں کہ ان کی زندگی میں کوئی دوسری عورت نہیں آئی ہے میں قسم تو نہ کھا سکا لیکن برآمدے میں جاتے جاتے اسے روک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایک بار پھر سینے سے لگا کر کہا:" ناہید، تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ تمہارے اعجاز رضوی کے ماضی میں اپنے والدین، بھائیوں اور بہنوں کی المناک موت کے سوا اور کوئی یاد باقی نہیں ہے جو مکان گرنے سے ملبے کے نیچے دب کر ختم ہو گئے تھے لیکن تمہیں پا کر میں وہ سب بھی بھول جاتا ہوں کیونکہ تمہارے اندر بے پناہ کشش ہے۔ اور تم بلاشبہ ایک خوبصورت جادوگرنی ہو!"

یہ سن کر وہ کئی لمحوں تک میری آنکھوں میں دیکھتی اور مسکراتی رہی، پھر مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اور ریکارڈ پلیئر پر ایک بنگالی گیت لگا کر کچن میں چلی گئی۔

جودی تارے نائے چانی گو
شی کے آئے نیبے پچینے
اے نو بو بچا لگو نیر دیینے
جانے نے، جانے نے

شیکے آمار کون دیر کا نے
کو بے کو تھا گانے گانے
پو ے تاہر نیبے کیتے
آئے ٹو بو۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے سنگیت میں ایک عجیب سی اُداسی ہوتی ہے۔ اس وقت میں تنہا بیٹھا ایک اجنبی زبان کا اُداس گیت سن رہا تھا مجھے بار بار یہی خیال آرہا تھا میں ناہید کے سامنے کبھی سچ کیوں نہیں بول پاتا ہوں۔ اپنا ماضی اُس سے کیوں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ لیکن اب وہاں بھی کیا رہ گیا ہے نسرین جیسی محبت کرنے والی بیوی ایک طویل انتظار سے اکتا کر دوسرا نکاح کر چکی ہے وہ خدا جانے اپنے ادھیڑ شوہر کے بچوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک کرتی ہوگی! ہوسکتا ہے وہ انہیں حقیقی ماں کا پیار نہ دے پاتی ہو اور اسی بات پر میاں بیوی کے درمیان کبھی کبھی تکرار بھی ہو جاتی ہو! اور اس کا شوہر کبھی کبھی دکھی ہو کر اس پر ہاتھ بھی اٹھا لیتا ہو۔ لیکن میں نے اسے کبھی نہیں مارا تھا میں نے تو اپنی پیاری بیٹی فوزیہ کو بھی کبھی نہیں ڈانٹا تھا جب کبھی اس نے گھر کی بہت قیمتی چیزیں توڑ ڈالی تھیں اس وقت شاید وہ مصلیٰ بچھائے اپنے پائلٹ شوہر کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی ہو گی۔ جو ہندوستان کے خلاف کسی نہ کسی محاذ پر یقیناً لڑ رہا ہو گا اور ہو سکتا ہے اس کے پاس جو بم ہیں ان میں سے کسی ایک پر میرا بھی نام لکھا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اٹھ کر ریکارڈ پلیئر آف کر دیا۔ اور مصلیٰ بچھا کر عصر کی نماز پڑھنے لگا۔

عید سے پندرہ روز پہلے ناہید نے میرے منع کرنے کے باوجود شبنم اور صمد کو اسکولی بچوں کے ایک گروپ کے ساتھ سکم اور دارجلنگ کی سیاحت کے لیے روانہ کر دیا۔ وہ ہمارے بغیر پہلی بار گھر سے اتنی دور جا رہے تھے، ناہید نے بچوں کے اس آوٹ ڈور راؤنڈ ٹور میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی تھی۔ میں بھی اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسکول کے منتظمین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ عید سے پہلے بچوں کو واپس لے آئیں گے وہ اس بات سے باخبر تھے کہ بچوں میں بیشتر مسلمان ہیں، جن کے لیے ماں باپ کے ساتھ عید منانا بے حد ضروری ہے۔ لیکن پہاڑی راستوں پر سخت بارش کی وجہ سے اچانک کئی چٹانیں پھسل کر آ گریں، جس کی وجہ سے آمد و رفت کے راستے مسدود ہو گئے! اس حادثے کے علاوہ شمال مشرقی آسام میں کئی ماہ سے ایجی ٹیشن چل رہا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ عین عید کے روز شمالی اتر پردیش کے صنعتی شہر مراد آباد میں فساد پھوٹ پڑا۔ اخبارات نے اس فساد سے متاثرہ

کچھ اور شہروں کے بارے میں بھی خبریں چھپا ہیں۔ ناہید اور میں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ان خبروں اور تصاویر کو دیکھا جن میں بے شمار جوتے عیدگاہ کے احاطے میں بکھرے ہوئے تھے یہ ایک بے حد دلدوز منظر تھا جو ایک سنگین خاموشی کا غماز تھا۔ یہ سارے جوتے ان بوڑھے جوان اور بچوں کے تھے جو خدا اور قرآن اور اپنے رسول پر پختہ ایمان رکھتے تھے اور انہوں نے رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھ کر اور بے شمار نمازیں پڑھ کر اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کیا تھا ان میں سے کتنے بھاگتے دوڑتے اور گرتے پڑتے ایک دوسرے کے پاؤں کے نیچے آکر کچلے گئے تھے اور مر گئے تھے جو اپنے گھروں کو جانے والے راستوں پر جانے میں کامیاب ہو گئے تھے ان میں سے بھی کتنے چھروں اور گولیوں کا شکار ہو گئے تھے اس کا پورا اندازہ ابھی تک نہیں لگایا جا سکا تھا۔ ناہید اور میں خاموشی سے بیٹھے رہ گئے ہماری یہ خاموشی ان واقعات پر پہلا ردعمل تھا لیکن دو تین روز کے بعد ناہید اچانک حسب معمول اپنا تجزیہ لے کر بیٹھ گئی: "دیکھا میں نہ کہتی تھی یہ ہندو مسلم فساد نہیں تھا یہ تو ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کا حکومت کے ساتھ محض ایک علامتی ٹکراؤ تھا جس کے ساتھ آزادی کے بعد اب تک سماجی اور معاشی سطح پر نابرابری کا ہی سلوک روا رکھا گیا ہے اب تو پولیس بھی انہیں لوٹنے کھسوٹنے لگی ہے کیونکہ حکومت کے خلاف اس طبقے کی بھی کچھ شکایتیں ہیں جن پر دھیان نہیں دیا جاتا وہ لوگ ایک بار بغاوت بھی کر چکے ہیں۔ ان کے لیے اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے انہیں موقع ملے تو ہندوؤں کو بھی اسی طرح لوٹیں گے۔"

"پھر بھی کچھ جگہوں پر فرقہ وارانہ ٹکراؤ بھی تو ہوتے ہیں! میں نے طے کر لیا تھا آج اس کی ہر دلیل کاٹ کے رہوں گا۔ اور اب تو ہر طرف سورڈیموکریسی اپنا رنگ دکھا رہی ہے!"

سورڈیموکریسی ہو یا گوتاتاڈیموکریسی یہ سب غنڈوں کا کام ہوتا ہے" ناہید میرے سامنے سیونگ مشین پر کپڑا سیتے ہوئے بولی: "تم نے یہ نہیں پڑھا کئی جگہوں پر دونوں فرقوں کے لوگوں نے خود مسجدوں کو دھویا اور پاک و صاف کیا۔ وہ جان گئے ہیں کہ ایسا کر کے کون اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے!"

"پھر بھی انہیں فساد ہی کہا جائے گا۔" میں نے کچھ تیز ہو کر کہا۔ "یہاں تمہاری معاشی اور سماجی نابرابری وغیرہ کی ساری تھیوریاں فیل نہیں ہو جاتیں؟"

وہ بھی چمک کر بولی: "نہیں، میں انہیں سیاسی فساد ہی کہوں گی۔ جو ہماری ڈیموکریسی پر بدنما داغ ہیں۔ لیکن انہیں میں ہندو مسلم فساد کبھی نہیں کہہ سکتی۔ میں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں، ہمارے ملک میں آج تک ایک بھی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا ہے۔ چاہو تو اس میں غیر منقسم ہندوستان کو بھی شامل

کر لو جس میں وہ سارے شہر شامل ہیں جو مسلم اکثریت کے ہیں اور اب پاکستان میں شامل ہیں، جہاں کہیں اور جب کبھی کسی ایک فرقے کا آدمی قتل ہوا یا اس کی دکان لٹی یا اس کے مکان پر دھاوا بولا گیا اس کے پیچھے اس کی تجارت، مال و دولت اور رہائشی مکان پر قبضہ کر لینے کا جذبہ موجود تھا صدیوں پہلے اس دور میں بھی جو غزنویوں، خلجیوں منگولوں اور مغلوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے یہی کچھ ہوتا رہا۔ وہ مسلمان ضرور تھے اور ان کے آجانے سے یہاں اسلام بھی پھیلا لیکن ان کی ہر ایک یلغار اور حملہ اپنی معاشی بہتری کے لیے پہلے تھا، اسلام کے لیئے بعد میں۔ وہ مسلمان نہ ہوتے کوئی اور ہوتے تب بھی ان کے حملے معاشی فتوحات ہی کہلاتے۔

ان سے بھی ہزاروں سال پہلے جو موہنجوڈارو اور ہڑپہ اور دراوڑ اور آرین گروہ اس ملک میں آئے تھے انہوں نے بھی پہلے سے بسے ہوئے لوگوں کو زیر کر کے اپنی معاشیات کا ہی سدھار کیا تھا اور اتنا تو تم جانتے ہی ہو کہ ہر گروہ کے پاس اپنا ایک مخصوص مذہبی عقیدہ اور نظریہ بھی ضرور ہوتا ہے جس کی آڑ لے کر وہ اپنی برتری جتاتا ہے لیکن اب مذہب کا نہیں معاشیات کا فلسفہ اپنا زیادہ اثر دکھلائے گا ہمارے صوبے میں یا ان صوبوں میں جہاں لیفٹیننٹ سرکاریں قائم ہیں وہاں اس قسم کے فساد کیوں نہیں ہوتے؟ پھر وہ یکایک خاموش ہو گئی اور ہنس بھی پڑی۔

"تم کہو گے میں تمہیں کمیونزم کا لیکچر پلا رہی ہوں۔ آئی ایم ساری! لیکن میں بھی تو تمہاری طرح ایک عام انسان ہوں جس طرح میں اپنے آس پاس ہونے والے تجربوں کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں اسی طرح تمہیں بھی کرنی چاہئیے۔

میرا جی چاہا اپنی اس قدر ذہین بیوی کو سیلوٹ دے کر داد دوں، جو مجھے اپنی دلیلوں سے قائل کر کے ہی چھوڑتی ہے۔ اور پھر ہنس کر معافی بھی مانگ لیتی ہے! اسی وقت ڈاکیا ایک تار دے کر گیا۔ میں نے تار کھول کر پڑھا تو خوشی سے اچھل پڑا اور ناہید سے کہا۔ " لو ایک خوشخبری سنو۔ ہمارے بچے آج ہی دارجلنگ میل سے واپس آرہے ہیں!"

اس نے تار میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اسے خود بار بار پڑھا اور بے اختیار ہنستی چلی گئی۔ زیر لب بولتی بھی رہی۔ " خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تو نے ہمارے بچوں کو بالکل محفوظ رکھا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْن ۝

وہ مشین چھوڑ کر کھڑی ہو گئی جلدی جلدی اسٹیشن جانے کے لیئے تیار ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ ابھی تو بہت وقت پڑا ہے ناہید۔ اتنی جلدی وہاں جا کر کیا کریں گے۔؟

وہ بولی: نہیں ہم ابھی روانہ ہو رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کلکتے میں اچانک ٹریفک جام ہو جاتا ہے اور گاڑیاں گھنٹوں بھیڑ میں پھنسی رہ جاتی ہیں۔ تم بھی یہ تہمد اتار کر آدمیوں جیسے کپڑے پہن لو، یہ کہہ کر وہ ہنس بھی پڑی۔

جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو گاڑی آنے میں ابھی ایک گھنٹہ تھا۔ گاڑی لیٹ بھی نہیں تھی لیکن وہاں ہماری طرح کئی اور والدین بھی وقت سے پہلے آ گئے تھے وہ بار بار انکوائری ونڈو پر جا کر پوچھنے لگتے تھے: "گاڑی لیٹ تو ہو گیا نا دادا!" وہ سب ایک دوسرے کو انداز سے ہی پہچان لیتے تھے اور آگے بڑھ کر متعارف ہو لیتے اور اپنے اپنے بچوں کے بارے میں بڑے جذباتی لہجے میں گفتگو کرنے لگتے تھے۔

"ہمارے ٹونی کا تو ایک ہی خط آیا جب وہ سلی گڑی پہنچا تھا اس کے بعد کوئی خبر نہیں ملی۔"
"ہمیں تو کوئی خبر ہی نہیں ملی دادا۔ ہماری بیوی کا بلڈ پریشر ایک دم ہائی رہنے لگا ہے تب سے"
خدا کا شکر ہے اب وہ خیریت سے واپس آ رہے ہیں ورنہ ہم بہت پریشان تھے۔

اچانک وہاں ایک نہایت ہی وجیہہ اور باوقار شخص پولیس افسروں کی سی وردی پہنے اپنی دلکش بیوی کے ساتھ ٹہلتا ٹہلتا ہمارے پاس آ کر رک گیا۔ پہلے تو بہت حیران دکھائی دیا پھر مسکرا کر ناہید سے بولا: "السلام علیکم ناہید صاحبہ! میں اعجاز رضی ہوں پہچانا؟ آپ کے والد مرحوم کے انڈر چٹگانگ میں ڈی ایس پی رہ چکا ہوں۔

یہ سن کر ناہید پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ سر اٹھا کر کبھی اسے گھورتی کبھی مجھے۔ اس قدر نازک اور آزمائشی لمحہ میری زندگی میں پہلے نہیں آیا تھا اس کی مجھے توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی، لیکن وہ آدمی ابھی تک مسکرائے ہی چلا جاتا تھا اپنی بیوی کو بھی تبا رہا تھا: "انہیں میں نے کئی برسوں کے بعد دیکھا ہے کم سے کم بیس سال کے بعد"

ناہید کی کیفیت یکایک بدل گئی، اس کی آنکھوں میں حزن اتر آیا۔ اس آدمی کو کوئی جواب دینے کے بجائے میرا ہی گریبان پکڑ کر چیخ اٹھی، "اگر یہ اعجاز رضی ہے تو پھر تم کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ تم نے اعجاز رضی بن کر میری کوکھ سے بچے کیوں پیدا کیے۔؟ جواب دو! یہ حق تمہیں کس نے دیا۔ میں تمہارا خون پی جاؤں گی!!!"

اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا اس نے میرے کپڑے چیر ڈالے لیراں لیراں کر دیئے اور میرے بدن کو تیز ناخنوں اور دانتوں سے نوچنے لگی۔ اس کی چیخیں سن کر پل بھر میں ہمارے گرد ایک جم غفیر جمع

ہو گیا۔ اسی وقت دارجلنگ میل بھی دھڑ دھڑاتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ لگی جس کی کئی کھڑکیوں میں سے چھوٹے چھوٹے خوشنما بچے اپنے اپنے ماں باپ کو پہچان کر زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے اور خوشی سے چیخ رہے تھے اعجاز رضی اور اس کی بیوی بھی اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے بچوں کو رسیو کرنے کیلئے چل دیئے۔

میں ابھی ابھی کوتوالی سے لوٹا ہوں، پولیس والوں نے میری درخواست پر ایک بند گاڑی میں ناہید کو رانچی کے اسپتال میں بھجوا دیا ہے اور اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں بھی گئی ہیں۔ اپنے وکیل کو بلا کر میں ایک وصیت لکھ کر دے چکا ہوں کہ میری کل املاک کو بیچ کر جس کا تخمینہ ساڑھے چار لاکھ کے قریب ہے رانچی کے اسپتال کو دے دیا جائے، میں نے پولیس افسران کو یہ بھی لکھ کر دے دیا ہے کہ میرا حقیقی نام انور سراج سوری ہے اور میں بھی انہی ہزاروں بدقسمت پاکستانیوں میں سے ہوں جو کسی نہ کسی ذاتی سبب سے ویزا کی مدت ختم ہو جانے کے بعد بھی کئی سال سے ہندوستان سے واپس نہیں گئے ہیں جن کی تلاش آج کل بڑے زوروں سے کی جا رہی ہے قانون کے مطابق مجھے ہر سزا قبول ہوگی اور میں اپنے وطن بھی ضرور واپس چلا جاؤں گا جہاں اب میرا کوئی بھی انتظار نہیں کر رہا ہے، میرے دو ہندوستانی بچوں کو اگر میرے ساتھ جانے دیا جائیگا تو میں ہندوستانی حکومت کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ ورنہ وہ میرے بغیر تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ اب تو ان کی ماں کے صحت یاب ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں ہے۔ میرے بچوں کو مجھ سے ملانے کے لیے اسکول کی ایک وارڈن انہیں لے کر آنے والی ہے پولیس افسران نے مجھ پر یہ بھی بڑی مہربانی کی ہے کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے دی ہے تاکہ میں یہاں اس گھر کو آخری بار دیکھ سکوں جسے خوبصورت اور آرام دہ بنانے میں ناہید نے اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔

پوسٹ اسکرپٹ

اخبار میں ایک آدمی کی فوٹو کے ساتھ ایک کالمی خبر میں کہا گیا ہے کہ اس نے خود کو پاکستانی ڈیکلیئر کر کے پولیس کو بتایا تھا کہ وہ عرصہ ۲۰ سال سے غیر قانونی طور پر بھارت میں رہ رہا تھا لیکن حکومت پاکستان نے اسے واپس لینے سے انکار کر دیا ہے کیونکہ اس کے تفتیش کرنے والے ذرائع اس کی ماں کی شہریت کی تصدیق نہیں کر سکے نہ ہی وہاں اب ایسا کوئی ریکارڈ موجود ہے جس کی بنا پر وہ تسلیم کر سکیں کہ اسے واقعی ایک پاسپورٹ دیا گیا تھا۔ اب یہ آدمی اپنے پہلے بیان سے منکر ہو کر خود کو مراد آباد کا بتاتا ہے لیکن اسے وہاں بھی کوئی نہیں جانتا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی خلل ہے لہٰذا وہ جب تک صحت یاب نہیں ہو جاتا۔ حکومت ہند نے اسے انسانی ہمدردی کے تحت پاگل خانے بھجوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ★

رشید امجد
راولپنڈی

بند کنویں میں سرسراہٹ

یہ بات شاید صبح ہوئی، دوپہر کو یا رات کو کسی وقت، اب اسے ٹھیک سے یاد نہیں، بس اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ اس کے اندر سے کوئی پھڑپھڑا کر باہر نکلا اور فضا میں بلند ہو گیا۔ جلگجی روشنی میں اس نے دیکھا کہ ایک دشت ہے، ہو کا عالم اور وہ بیچوں بیچ کھڑا اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے اتنے میں کہیں سے ایک پرندہ اڑتا ہوا آیا اور چند لمحے اس کے گرد چکر لگاتا رہا پھر اس کے اندر داخل ہو گیا اب ایک اور ہی منظر ہے۔

وہ بھرے بازار کے بیچوں بیچ کھڑا ہے لوگوں کا اژدھام ہے، سارے لوگ بھاگے جا رہے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ دوڑتا چلا جاتا ہے، منظر پھر بدلتا ہے۔ اور اب وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ہے، میز پر فائلوں کا انبار ہے۔ بس یہ ساری کہانی ہے — ایک لمحہ یا کئی سو لمحوں کی یہ اسے معلوم نہیں۔

یہ واردات اچانک ہو جاتی ہے، اسے اس وقت پتہ چلتا ہے جب ہو چکتی ہے، اس کے بعد بہت دیر تک اسے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے بید سے اس کی پٹائی کی ہے اور روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا ہے۔ فائلوں کے حرف اسے بے معنی لگتے ہیں، چہروں پر چڑھے ہوئے ماسک اتر جاتے ہیں اور ہر چیز اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ گھر میں ہوتا ہے تو بیوی کی باتوں میں ایک عجیب تصنع محسوس ہوتا ہے، بچوں کی آوازوں میں بے سُرا پن آ جاتا ہے۔ سارا گھر ریت کے گھروندے کی طرح بھُربھُراتا محسوس ہوتا ہے۔

اجنبی فضا میں اڑتا پرندہ اپنا راستہ بھول گیا ہے کیا پرندے بھی راستہ بھول جاتے ہیں؟
اور اسی لمحہ یہ اذیت کہ وہ ساری عمر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا ہے جو نہ بنا۔ وہ بنتا رہا اور جو بنا وہ
تھا نہیں۔ شاید اب بھی نہیں، ویسے دیکھنے کو اسے کوئی دکھ نہیں، سجا سجایا گھر، ماڈرن بیوی، پھول
ایسے بچے، عزت والی نوکری۔
بیوی کہتی ہے — "تم بڑے ناشکرے ہو، اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنے
آپ کو کوستے رہتے ہو۔"
اس کے پاس جواب نہیں۔ کیا واقعی میں ناشکرا ہوں — ؟
لمحہ بھر کے لیے لگتا ہے بیوی ٹھیک ہی کہتی ہے آخر اسے فکر کس بات کی ہے۔ لیکن ساری
مصیبت تو اس پرندے کی ہے جو اس کے جسم کے قفس میں کہیں پھڑ پھڑاتا ہے اور کبھی کبھی اچانک باہر نکل
کر کھلی فضا میں ایک چکر لگاتا ہے اور پھر اس کے جسم کے ملبہ میں دفن ہو جاتا ہے۔
تو کیا میں کوئی قبر ہوں؟
کیا قبریں بھی احساس رکھتی ہیں، ان کا بھی کوئی جذبہ ہوتا ہے ؟
کیا پھر یہ کہ میں کوئی ہوں اور قبر میرے ارد گرد کہیں اور ہے جو مجھے تو نظر نہیں آتی شاید اس
پرندے کو دکھائی دیتی ہے۔
تو کیا میں خود پرندہ ہوں؟
لیکن میں تو ا ابن ب ہوں۔
"ڈیڈی —"
"جی بیٹے —"
"شام کو آئس کریم کھلانے لے جائیں گے نا"
"جی بیٹے —"
"میرے لیے ساڑھی — میرے لیے — میرے لیے —"
دن فرمائشوں کے دھاگوں سے بُنا ہوا دن،
رات — سمندر سے بھی گہری رات،
وہ ان دونوں کے درمیان کہیں اٹکا ہوا ہے
پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے — اُس کے اندر ایک قلابازی کھاتا ہے اور پھر سے اُس کے

حلق سے ہٹتا نغمہ فضا میں بلند ہوجاتا ہے وہ آنکھوں پر دونوں ہاتھوں کا چھجا بنا کر اُسے فضا میں اُڑتے دیکھتا ہے۔

کچھ دیر بعد یہ پرندہ اپنے پنجرے میں لوٹ آئے گا۔

ہاں لوٹ آئے گا۔

ڈیڈی ——— اس کا بیٹا پکارتا ہے۔

"اجی سنیئے نا ——" بیوی کچھ کہہ رہی ہے۔

ابّو ——— بیٹی ہاتھ ہلا رہی ہے

"جناب میرا کیس ——— کوئی کہہ رہا ہے۔

"سر — یہ فائل بہت ضروری ہے اس کا پی۔ اے میز پر جھکا ہوا ہے۔

پرندہ کہاں جائے۔ اتنی ساری قینچیاں اس کے پر کاٹ رہی ہیں

وہ ایک لمبی آہ بھرتا ہے اور سوچتا ہے کبھی تو یہ ساری قینچیاں ٹوٹ جائیں گی۔ نئے پر نکلیں گے اور یہ پرندہ بس فضا میں اونچا اور اونچا اڑتا چلا جائے گا۔

لیکن کب ———

پھر خود ہی مسکراتا ہے ——— میں بھی عجیب ہوں۔ اپنے آپ کو خود ہی مٹانے پر تُلا ہوا ہوں

اُسے جھرجھری آتی ہے ———

لیکن سب سے الگ فضا میں اڑنے کی خواہش۔

خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ ہیں نا،

وہ اندر ہی اندر مسکراتا ہے اور پی۔ اے سے کہتا ہے۔

لو بھئی پہلے ذرا بیگم صاحبہ سے بات کروا دو، پھر آجاؤ بہت دن ہو گئے آج اس فائل کو ضرور ڈسپوز آف کرنا ہے۔'

* * *

کمال مصطفیٰ

نیروبی

(۱)

ایک صبح وہ اچانک جیل کے سامنے نمودار ہوئی اور سڑک کے اس پار کھڑے ہو کر جیل کی طرف منہ کر کے واویلا کرنے لگی۔

'میرے پُتّر کو انگریز مار گئے'

وہ جوان عورت تھی جو دیکھنے میں ادھیڑ عمر کی لگتی تھی۔ اس کے چہرے پر خوبصورتی کے نقوش اب بھی باقی تھے اگرچہ تازہ جھرّیوں کے نشانوں، سفید اور کالے، کھچڑی بالوں اور اس کے خراب حلیے نے اس کی خوبصورتی کو بہت حد تک چھپا دیا تھا۔ کپڑے اس کے میلے اور ملگجے تھے جیسے وہ کپڑے بدلنے کی ضرورت سے بے نیاز ہو گئی ہو۔ نظر کی موٹی عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں اُجاڑ، پھیکی پھیکی، دور خلاء میں تکتی ہوئی تھیں۔ چہرے پر غم کم، دحشت زیادہ۔ وہ چیخ رہی تھی، فریاد سی تھی، آہ و بکا کر رہی تھی۔

'میرے پُتّر کو انگریز مار گئے'

کچھ لوگ اس کے پاس سے گزر جاتے، کچھ اس کے گرد جمع ہو جاتے، اس کی فریاد سنتے اور مزے لیتے، کچھ اسے دیوانہ تصوّر کرتے، کچھ پاگل سمجھتے اور کچھ مظلوم اور کچھ نفسیاتی مریض۔ رفتہ رفتہ

اس کے اِردگرد لوگوں کا ہجوم جمع ہوگیا۔ ایک مجمع لگ گیا۔ کچھ لوگ تو صرف تماشہ دیکھنے کھڑے ہوگئے تھے۔ لیکن کچھ ہمدردی سے اسے دیکھ رہے تھے، کچھ حیرت سے اسے تک رہے تھے اور کچھ اس کے خراب حُلیہ کے پیچھے اس کی پوشیدہ جوانی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے اور کچھ اس کے جسم کے اُبھاروں اور زاویوں کو بھوکی نظروں سے گھور رہے تھے۔

'ہائے، میرے پُتّر کو انگریز مار گئے'

وہ انہیں دیکھ کر اپنا واویلا اچانک بند کر دیتی جیسے ان کی موجودگی کا اُسے ابھی احساس ہوا ہو اور ان سے مخاطب ہو کر کہتی:۔

"مجھے کیا تکتے ہو۔ اپنے گھروں کو جاؤ۔ اپنی اولاد کی خیر مناؤ۔ تمہاری باری بھی آنے والی ہے"۔

کچھ لوگ کھسیانے ہو کر منتشر ہو جاتے۔ کوئی اس سے کہتا: 'بی بی، انگریز کو گئے تو بتیس سال ہو گئے'۔

کسی نے آوازہ کسا: 'مائی حوصلہ کر۔ ابھی تیرا بگڑا ہی کیا ہے۔ اللہ اور دے گا' مگر اس نے رٹ لگائی:۔

'میرے پُتّر کو تو انگریز مار گئے'۔

اور کسی نے اسے دلاسہ دیا' اماں گھر جاؤ۔ صبر کرو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا خدا کو یہی منظور ہوگا'

مگر وہ خلا میں گھورتے ہوئے بڑبڑائی:

'میرے پُتّر کو انگریز مار گئے'۔

جب اس کا شور و غل زیادہ بڑھا تو سامنے جیل کے پہرے داروں نے اسے دھکّے دے کر بھگانا چاہا ــــــ اور لوگ دیکھتے رہے ــ مگر وہ پھر بھی باز نہ آئی۔

ڈیوٹی پر تعینات مجسٹریٹ اُدھر سے گزرتے ہوئے رُک گیا اور جھڑک کر کہنے لگا: 'مائی' یہ تو نے کیا شور مچا رکھا ہے؟ یہ کیا مجمع لگا رکھا ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ برسرِ عام واویلا کرنا اور وہ بھی جیل کے باہر، قانوناً جرم ہے۔ اپنے گھر کی راہ لے ورنہ میں امنِ عامہ میں خلل ڈالنے کے جرم میں تجھے اندر کر دوں گا۔

اچانک اس کا واویلا رُک گیا اور اس نے پھٹی آنکھوں سے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ کُود کر چند گز پیچھے ہٹ گئی اور جیل کے سامنے سڑک کے اس پار پُل پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنے ہاتھ کو لبوں پر رکھ

کر، اپنے پاؤں کھول کر، اُس نے اپنا سینہ تانا اور غضبناک آنکھوں سے مجسٹریٹ کو گھورا۔ اچانک اس نے دیوانہ وار قہقہہ لگایا۔ ہنسی اور روئی ـــ روئی اور چیخی:

'میں کیا جھوٹ بکتی ہوں ـ میں اپنے پُتّر کے قاتلوں کو پہچانتی ہوں، ان کی شناخت کر سکتی ہوں ـ اور تو بھی ہُشیار رہ ـ تیرے پُتّر کو بھی وہ مار ڈالیں گے ـ وہ کسی کو نہیں بخشیں گے ـ سب کا نمبر آوے گا'

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مجسٹریٹ نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ 'اب کوئی انگریز موجود نہیں ـ یہاں تو سب اپنے ہیں۔ انگریز تو عرصہ ہوا چلا گیا۔ بہرحال جس نے بھی تم پر ظلم کیا ہے ہم تفتیش کریں گے ـــ لیکن تم گھر جاؤ ـــ اور لوگو تم بھی اپنے گھروں کی راہ لو'

چلتے چلتے مجسٹریٹ نے مڑ کر کہا۔ 'اور اماں ـ میرے کوئی پُتّر نہیں'

'تو پھر تیری باری آوے گی' وہ چیخی۔ وہ مسکرایا اور جیپ میں سوار ہو گیا۔

'مائی تیرا بیٹا کتنا بڑا تھا۔ وہ تو سکول میں پڑھتا ہو گا' ایک شخص نے اس سے پوچھا۔

'وہ اتنا آہ بڑا تھا' اس نے ہاتھ اٹھا کر اتراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں 'وہ خوبرو جوان تھا۔ عورتیں اس پر مرتی تھیں۔ اس کی دوستی کا سب دم بھرتے تھے، اس کی قابلیت کے سب قائل تھے ـــ' پھر وہ پژمردہ ہو گئی اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

'مگر کوئی بھی تو مدد کو نہیں آیا۔ سب دیکھتے رہے، اسے مرتے دیکھتے رہے مگر کوئی بھی تو مدد کو نہیں پہنچا۔ اس کے سارے دوست اُسے چھوڑ گئے۔ وہ کیسے بے وفا نکلے ـ" وہ بڑبڑاتی رہی ـــ

اتنے میں پولیس آئی، اسے پکڑ کر گاڑی میں بند کر کے تھانے لے گئی۔ راستے بھر وہ چیختی چلاتی رہی۔

'ارے میرے پُتّر کو تو انگریز مار گئے، کیا اب تم بھی مجھے مار ڈالو گے؟'

اور پولیس تھانیدار نے کہا۔ 'مائی ـ فکر نہ کر۔ ہم کسی کو نہیں مارتے۔ ہم تو اپنے افسر کے حکم سے تجھے یہاں لائے ہیں۔ ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے۔ تو جو اتنا شور مچا رہی ہے، لوگوں کو ورغلا رہی ہے' تیرا دماغ چل چکا ہے۔ ہم اُسے ٹھیک کرائیں گے۔ ہم تیرا علاج کرائیں گے'

'میرا دماغ صحیح ہے۔ تم اپنے دماغ کا علاج کراؤ جس پر تالے پڑے ہیں۔ تم اپنی نظر کا علاج کراؤ جو اندھی ہے ـــ' اور وہ سب ٹھٹھے مار کر ہنسنے لگے اور اسے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔

'مجھے یہاں سے نکالو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا کوئی ماں اپنے پُتر کی موت کا ماتم بھی نہیں کر سکتی؟ کیا اِس کی بھی ممانعت ہے۔۔ وہ میرے پوت کو ماردیں اور میں کچھ نہ کہوں۔ فریاد بھی نہ کروں۔ ظالمو مجھے یہاں سے نکالو' اس نے اپنے مُکے زور زور سے دروازے پر مارنا شروع کر دیے۔ باہر پولیس والے قہقہے مارتے رہے۔ کچھ دیر بعد ایک زنانہ کانسٹیبل کھانے کی ٹرے لے کر اندر آئی اور اس کے ایک گھونسا رسید کر کے کہنے لگی "اب چُپ بھی کرے گی کہ نہیں، ساری حوالات کو سر پہ اٹھا رکھا ہے۔۔ لے یہ کھانا کھا"

ڈاکٹر آیا اور اسے سونے کا ٹیکہ لگا دیا گیا اور وہ نڈھال ہو کر گھٹری چارپائی پر گر پڑی۔

اُسے ہسپتال لے جایا گیا جہاں ایک ماہر نفسیات نے اس کا معائنہ کیا اور اسی ہسپتال میں اسے داخل کر دیا گیا لیکن ٹیکوں کے خمار آلود اثر کے باوجود وہ بار بار یہی بڑبڑاتی "میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو یہ مجھے یہاں لے آئے ہیں۔ میں تو اپنے پُتر کا ماتم کر رہی ہوں"

ایک ہفتہ تک ڈاکٹروں نے اس کا علاج کر کے اُسے واپس پولیس کے حوالے کر دیا۔

"یہ دماغی طور پر پریشان ہے۔ یہ صدمے کا شکار ہے۔ اس کا علاج تو وقت ہی کرے گا"

پولیس افسر نے کہا "اچھا اماں۔ اپنا پورا بیان لکھواؤ کہ تمہارے بیٹے کو کب، کہاں اور کس نے کس طرح مارا۔ ہم تفتیش کریں گے"

مگر اس نے خلا میں گھورتے ہوئے صرف اتنا کہا 'میرے پُتر کو انگریز مار گئے'

پولیس افسر ہنسنے لگا۔

'تمہارا گھر کہاں ہے؟'

'مجھے نہیں معلوم'

'جاؤ اسے کہیں لے جا کر چھوڑ دو' پولیس افسر نے سپاہی کو حکم دیا۔ اور اسے جیل سے دور، شہر سے بھی دور، ایک سنسان سڑک پر چھوڑ دیا گیا۔

'چلو جان چھوٹی' ایک پولیس والے نے دوسرے سے کہا۔

مگر اگلے روز علی الصبح وہ پھر جیل کے باہر نمودار ہو گئی اور صبح کے وقت دفاتر جانے والے لوگوں کے سامنے فریادی ہوئی۔

'اے لوگو، میرے پُتر کو ـــــ'

کچھ لوگ ایک لمحہ کے لیے رُکتے' اس کی بات سُنتے اور پھر اپنا رستہ پکڑ لیتے۔ کچھ ہنستے ہوئے

پاس سے گزر جاتے۔ کچھ سائیکلوں پر پاس سے گزرتے ہوئے کہتے:
'آج یہ عورت پھر آگئی ہے'۔
'ارے یہ تو وہی مائی ہے'!
کچھ اس کے گرد مجمع لگا کر کھڑے ہو جاتے اور اُن میں سے کوئی پوچھتا:
"مائی تیرا بیٹا کیا بریڈ فورڈ میں مرا ہے"؟
کچھ ایک دوسرے سے بڑے یقین کے ساتھ کہتے: 'اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کسی حادثے میں مر گیا۔ اس کے بعد سے اس کا دماغ اُلٹ گیا ہے'۔
کچھ کہتے 'یہ پاگل نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی مجذوب ہے اور اسے کسی امتحان سے گزارا جا رہا ہے'، اور کوئی کہتا:
"لگتا ہے کہ مائی نے کوئی صدمہ سہا ہے۔ یہ پاگل کی بڑ نہیں ہو سکتی"۔
ایک مولوی صاحب کافی دیر سے کھڑے اس کا واویلا سنتے رہے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر بولے:
"اماں جو مر گیا، اس کا ماتم کرنے سے کیا حاصل۔ صبر کرو۔ اللہ ایک اور فرزند سے نواز سکتا ہے۔ اس کے ہاں رحمت کی کوئی کمی نہیں۔
وہ لمحے بھر کو رُک گئی۔ پھر بولی: 'میں اس کا ہی ماتم تو نہیں کر رہی جسے مار دیا گیا۔ بلکہ ان کا ماتم کر رہی ہوں جنہیں مارا جائے گا۔ تمہارے بیٹوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو گا۔ آخر وہ بھی تو میرے ہی پُتر ہیں'!
مولوی صاحب پیچھے ہٹ گئے اور کسی نے کہا: 'یہ تو بالکل ہی جھلّی پاگل ہے۔ اس کی زبان کالی ہے'۔

(۲)

اُس روز صبح سے ہی وہ کچھ زیادہ واویلا کر رہی تھی۔ اس کے بال اُجڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس کے کپڑے بوسیدہ، پر شکن اور تار تار تھے۔ اس کا گریبان پھٹا ہوا تھا اور وہ جیل کے سامنے اپنی پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس میں کہیں سے نئی طاقت آگئی ہو۔ کبھی وہ روتی، کبھی زور زور سے ہنستی، کبھی چیختی۔
'آج اسے کوئی زیادہ ہی بڑا دورہ پڑا ہے'، کسی نے سائیکل پر جاتے ہوئے کہا۔
"کہیں آج چاند کی چودھویں تو نہیں"؟

وہ آپے سے باہر تھی۔ گریبان چاک کر چکی تھی اور بپھری ہوئی شیرنی کی مانند دیوانہ وار جیل کے باہر سڑک پر پھر رہی تھی۔ اس کے جسم کا رواں رواں لرزاں و پیچاں تھا۔

اچانک وہ خاموش ہو گئی۔ خلا میں گھورنے لگی جیسے اس نے کوئی مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس کا واویلا، اس کی چیخ و پکار بالکل بند ہو گئی۔ اسے چپ لگ گئی مگر ساتھ ہی اس کی بے چینی اور اضطراب بڑھتا گیا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کی آنکھیں دور خلا میں مرکوز تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ مضبوط قدموں سے بیچ سڑک پر آن کھڑی ہوئی اور اوپر کی طرف تکنے لگی۔

اچانک سامنے سے موڑ کاٹ کر ایک دیو ہیکل، بھاری بھرکم ٹرک تیزی سے اُدھر آنکلا۔ بریکوں کی چیخ سنائی دی۔ اور وہ ڈرائیور کے قابو سے باہر، فیلِ بے مہار کی طرح اس کو روندتا ہوا، اس کے بازوؤں کو توڑتا ہوا سڑک کے کنارے پُل کے قریب سے دوڑتا ہوا نالے میں جا گرا۔

فضا میں اچانک سکوت طاری ہو گیا۔ اب صرف ٹرک کا ہارن واویلا کر رہا تھا اور سکوت کی گہرائی میں اضافہ کر رہا تھا۔ اور لوگ سراسیمگی کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

مرزا حامد بیگ

راولپنڈی

نیند کے ماتے

بات ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ الجھتا چلا گیا۔ ریستوران کے اندر، اس کے سامنے بچھے ہوئے میز پر سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے رکھی تھی، باہر تیز دھوپ تھی اور سڑک کا شور — اور ایک طرف کونے میں ویٹر اونگھ رہے تھے۔

وہ نہایت آہستگی کے ساتھ اٹھا اور سامنے پھیلی ہوئی میز پر گھٹنوں میں سر دیے کر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے دائیں بائیں اور پیچھے چمک دار سطح پر آسمان جھک آیا۔ اس شفاف نیلے آسمان سے نیچے آتے، اونگھتے ہوئے ریستوران کے ادھ نیم روشن فانوس تھے اور سامنے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے۔

میز پر اس کے دائیں بائیں دو عمارتوں کی بنیادیں بھری گئیں اور پھر لمحہ لمحہ اوپر اٹھتی سیسہ پلائی ہوئی دیواریں۔ اور فارمیکا کی چکنی چمک دار سطح، بجری کی کھردری پٹی میں بدل گئی جس کے بیچوں بیچ وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ وہ بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں جانب کی عمارتیں تکمیل پا کر گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے دھندلانے لگیں۔

اب بجری کی تنی ہوئی پٹی میں وہ صرف ایک گانٹھ تھا۔ اور وہ جب چاہتا یہ گانٹھ کھل

سکتی تھی لیکن وہ بیٹھا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بٹی ہوئی سرمئی رسیاں جھول رہی تھیں اس کے پیروں میں پہنے ہوئے بوٹ گل گئے اور کپڑے پسینے کے ساتھ بہہ گئے۔ اس نے بازو پھیلا کر اوپر جھکی ہوئی آسمان کی نیلی چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا اس کے گلے ہوئے بوٹوں کی ٹو سے انگوٹھوں نے کونے میں اونگھتے ہوئے وڈیروں کو جھانکا وہ پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں بوٹوں کے تسموں کے ساتھ بندھے تھے۔ اور اونگھ رہے تھے۔

اس نے بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھولیں اور سر کے بالوں سے بٹی ہوئی سرمئی رسیوں کی اوٹ سے میز کی چکنی چمک دار سطح پر ابھرے سرکنڈوں کے مٹیالے منظروں میں جھانکا وہ اُن سوتے جاگتے چہروں میں اپنا کھویا ہوا چہرہ تلاش کرتا بہت دُور نکل گیا۔ اور گرتے ہوئے شدید موسم، اس نے عورتوں اور مردوں کو بنیادیں کھودتے اور سیسہ ابھارتے دیکھا اس نے دیکھا کہ ان سیسہ ابھارنے والوں میں وہ خود بھی شامل ہے۔ وہ جو یوں ہی بیکار کھپریل کی چھت تلے سوتا جاگتا تھا اور وہ ماہتاب چہرہ چھلنی دھوپ میں اس کے سامنے کھلا رہتا یہی اس کے جینے کا طریقہ تھا۔

وہ بے کار تھا۔ دوسروں کے کہنے میں آ گیا۔

یہاں سے اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

ہاں تو وہ بے کار تھا وہ دوسروں کے کہنے سننے میں آ گیا آخر کب تک بانٹھ پیر توڑ کر سوتا جاگتا۔ اور وہ یاد گار دن جب کام پر بھی ماہتاب سامنے کھلا رہتا۔

وہ دن جب صرف بنیادیں بھری گئی تھیں۔ جب سے سیسہ پلائی ہوئی دیواریں اٹھی ہیں اور آپس میں الجھتی ہوئی راہداریاں تب سے درمیان میں بچھی ہوئی یہ بجری کی پٹی دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرتی گئی ہے۔ تقسیم بھی کچھ ایسی تھی اور کچھ کہنے سننے والے دونوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ گرم لو چلنے لگی اور درمیان میں گرتے ہوئے موسموں نے جگہ لے لی۔

وہ صاحب سے بات کرے گا۔ اس نے سوچا اور سارا دن صاحب دوسری طرف کام کی نگرانی کرتا رہا یہاں تک کہ شام ہو گئی اگلے روز پھر یہی ہوا اور یہی معمول بن گیا۔

ایسا کیوں ہوا؟ وہ صاحب سے بات کرے گا۔

اس نے سوچا لیکن صاحب کا اس طرف چکر ہی نہیں لگتا تھا۔ اور اس کے جینے کا ایک ہی طریقہ تھا، ماہتاب سامنے کھلا رہے یہ اس طرف رہا اور دوسری طرف اس کے جینے کا طریقہ۔ اور درمیان میں یہ بجری کی سات فرلانگ لمبی پٹی۔ دونوں جانب اوپر اٹھتی عمارتوں کے اوپر تلے متعدد کمرے اور

الجھی ہوئی راہداریاں، جن میں مزدوروں کی قطاریں آپس میں سر جوڑے ہوئے تھیں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب کام پر نہیں جائے گا۔ تب ایک مدت تک اس کے سامنے کھپریل کی چھت سے چھلنی زرد ماہتاب پھڑ پھڑاتا اور اس کا سونا جاگنا۔ وہ صبر شکر کر کے بیٹھ رہا تھا آخر کب تک؟

دوسروں نے کہا سنا، وہی لوگ جو آپس میں سر جوڑے تھے ایک بار پھر ساتھ لے گئے، تقسیم پھر اسی طرح ہوئی اور درمیان میں بجری کی نامکمل کھردری پٹی۔ زمانے بیت گئے

ایک دن موقع پا کر وہ قطار میں چکر کھاتے ہوئے تیر کی طرح نکلا اب وہ دوسری جانب جا رہا تھا وہ بے پروا تھا دوسری جانب جہاں اس کے جینے کا طریقہ تھا۔

ہانپتا ہوا دوسرے سرے تک پہنچا، کمروں میں راہداریوں میں، اوپر تلے ڈھونڈتا پھرا۔ اور پھر ایک بند دروازے سے ٹکرایا اس نے دیکھا کہ دروازوں کی درزوں میں زرد چھلنی ماہتاب الجھ کر رہ گیا ہے اور کمرے میں صاحب کھری چارپائی پر بے ترتیب سگار پی رہا ہے وہ دروازے پر کھڑا ہانپتا رہا اور راہداریوں میں چکر کھاتے ہوئے مزدوروں کے جڑے ہوئے سر، وہ اپنے منطقے کو لوٹ آیا۔ اور شام کو پھر دوسروں نے کہا سنا۔

وہ ہانپتا ہوا وہاں تک پہنچا کمروں میں راہداریوں میں اوپر تلے الجھا پھرتا۔ اور صاحب کمرے میں کھری چارپائی پر بے ترتیب

وہ دروازوں پر ہانپتا رہا، اور شام کو دوسروں کا کہنا سننا معمول بن گیا وہ دوڑتا رہا اور ہانپ کر بیٹھ گیا اس نے موسلا دھار بارشوں کی ترچھی باڑ سے بنی ہوئی تہہ در تہہ۔ موٹی چادریں اوڑھ لیں اب وہ بیٹھا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بٹی ہوئی سرمئی رسیاں جھول رہی تھیں وہ بیٹھا رہا اور دونوں جانب کی عمارتیں اور بکھرے ہوئے سرکنڈوں کے منطقے گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے دھندلا گئے۔ اس نے دیکھا کہ وہ بجری کی پٹی میں ایک گانٹھ ہے اور وہ جب چاہے اٹھ کر کھڑا ہو سکتا ہے اس نے اپنے پیروں پر نگاہ کی پھر اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں ٹانگیں بھی سلامت ہیں فضا میں وصال اور جدائی کی ملی جلی مدہم سرگوشی اور ویٹر کونے میں اونگھ رہے تھے چہار جانب حیرت تھی اور درد فراق میں نڈھال، دکھی ہر طرف دکھ بانٹتا پھر رہا تھا۔

اس نے یہ سب دیکھا اور امن امن پکارتا باہر نکل گیا۔

وہ جہاں سے اٹھا تھا، میز پر الٹی ہوئی تھی اور ادھ جلی سگریٹوں کے ٹکڑے ایک ترتیب کے ساتھ اوپر تلے چنے ہوئے

علی عباس امید

بھوپال

بے زمینی کا المیہ

فضا خاموش ہے۔

سیاہ بادلوں کا قافلہ سرخ رو ہو کر اس شہر سے ہجرت کر رہا ہے۔ بجھی بجھی نیم روشن آنکھیں ان پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ خائف ہیں۔ اب یہ بادل نہ جانے کس بستی کو لہو رنگ کریں گے۔

فضا خاموش نہیں ہے۔

ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی خبر بچے کھچے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گئی ہے — سیاہ بادلوں کا قافلہ پھر اس شہر سے ہو کر گزرنے والا ہے.... بجھی بجھی سانسوں کے تسلسل میں خود بخود بے ربطی آنے لگی ہے۔

فضا خاموش ہے۔

نیم بیدار ذہن آج ہمیشہ سے زیادہ استغراق میں ہیں۔۔ پہلے تو بادلوں کے کئی رنگ ہوتے تھے۔ سفید، بھورے، اودے، کاسنی، چمپئی... لیکن اب....اب صرف دو۔ سیاہ اور سرخ! آخر کیوں؟ کہاں چلے گئے دل کے ساگر میں مسرت کی موجیں اٹھلانے والے نرم رو بادل! کیا ہوئے روح کو آسودہ کرنے والے رنگ! کیا ہو گیا ہے جو ان دنوں شب چہرہ آنے والے سیاہ بادل سرخ رو ہو کر جانے لگے ہیں؟ سیاہی کے سرخ ہونے تک کا وقفہ کیوں اس شہر کے لیے دم واپسیں بن جاتا ہے؟ اور.... اور... تاریکی....

تاریکی... صرف تاریکی!

فضا خاموش نہیں ہے۔

جسموں کے جنگل پر دھوپ نے اپنے پر پھیلا دیئے ہیں۔ ہر طرف ایک طلسمی دائرہ مضبوط ہوتا جا رہا ہے... شعاعوں کے نیزے چاند جسموں کو پار کر چکے ہیں۔ منجمد آوازیں یکلخت پگھل گئی ہیں، روشنی نے اُداسی کا ملبوس پہن لیا ہے۔ بچے کھچے دروازوں، دیواروں، کھڑکیوں، طاقوں اور محرابوں پر سڑاپے اگلنے والے اسپِ وحشی اپنے سموں کے نشانات چھوڑ گئے ہیں۔ بکھرتی سمٹتی، اکھڑتی سانسوں کا اب نہ کوئی بدن ہے نہ چہرہ.... دیر تک نظریں گڑائے رہنے کے بعد بینائی ایک ہیولے سے ٹکراتی ہے صرف ہیولے سے... اور کچھ بھی نہیں، کہیں بھی نہیں۔

دیئے یادوں کے مدھم ہو چکے ہیں،
جو گزرا ہے اسے یکسر بھلا کر،
ہم آنے والے کل کو رو چکے ہیں!
سبھی کچھ کھو چکے ہیں!!

میں شاید مر چکا ہوں۔ نہیں۔ ابھی کہاں، ابھی تو تنہائی مجھے قطرہ قطرہ کر کے پی رہی ہے میں سرد ہوں، ایک دم سرد.... تنہائی نہ جانے کتنی تشنہ ہے کسی صورت بجھتی ہی نہیں اس کی پیاس۔ اوہ، یہ کیسی آواز ہے....کون ہے یہ؟ یقیناً کسی نے اپنے آنسوؤں کی سرکشی سے شکست قبول کر لی ہے۔ کوئی بھی ہو، بہت قریب ہے..... میرے بالکل پاس... اف.... یہ تو میرے اپنے سینہ کے اندر کوئی دھیرے دھیرے رو رہا ہے۔ آنسو بہانے والا کوئی اجنبی تو نہیں! آشنا چہرہ ہے۔ یادوں کے خار ذہن کو لہولہان کرنے لگے ہیں... نہیں نہیں، اب اور زخم نہیں! مجھے اپنے حافظے کے دروازہ پر ناآشنائی کی تختی لگا لینی چاہیئے، شاید یونہی میں زندہ رہ سکوں!

آج پھر روشنی اُداسی کا ملبوس پہن کر اس شہر میں آئی ہے۔

میری آنکھیں شام سے جاگتی رہی ہیں ہر سرد لمحہ کا لمس میری سانسوں میں تیرتا رہا ہے... مجھے معلوم ہے مسلسل جاگنے والی آنکھوں سے خواب روٹھ جاتے ہیں۔ میری آنکھیں اسی لیے بے خواب ہیں، اب رہا بھی کیا ہے خواب دیکھنے کے لیے ——— !

اس صبح، ہاں اس خوشگوار صبح کو جب میں بیدار ہوا تھا تو شگفتگی نے میری نیم باز آنکھوں کے بوسے لیئے تھے اور میں نے اس سے کہا تھا۔ مجھ سے پوچھو، میرے خواب کی تعبیر ابھی۔ واقعی وہ خواب خوبصورت

تھا۔ بہت ہی خوبصورت۔ اس میں یہی شہر تھا، اس کا شباب تھا اور تھے ہنستے، کھنکتے، دوڑتے، بھاگتے انگنت شوخ لمحے اور... اور وہ سب کچھ تھا جو جینے والوں کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔

خواب کل ہے اور تعبیر جزو۔ ابھی لیے اس روز میں نے تعبیر نہیں بتائی تھی، کسی کو نہیں، اپنے کو بھی نہیں)۔ روح میں نغمگی اتارنے والے اس خواب کی تعبیر کا روح فرسا روپ کون برداشت کر سکتا تھا میں بھی نہیں، تم بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ اُداسی کا ملبوس پہننے والی روشنی پھر آ پہنچی ہے —— میں —— میں سوچتا ہوں اس شہر کو چھوڑ دوں۔ ابھی یہاں میرے کچھ دوست بچ رہے ہیں اور روشنی، وہی روشنی ہاں وہی اداسی کا ملبوس پہننے والی پھر یہاں آ پہنچی ہے۔

میں نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں جیسے واگنر کی کوئی سمفنی چھیڑ دی گئی ہو.... ہاں میں نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے.... میں اپنے حافظہ کے دروازہ پر ناآشنائی کی تختی لگا چکا ہوں اور واگنر کی سمفنی چھڑی ہوئی ہے موسیقی قطرہ قطرہ میرے کانوں سے گزر کر دماغ میں جمع ہوتی جا رہی ہے۔ دماغ جس نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔

کیا میں زندہ ہوں؟ اس شہر سے نکل کر کیا میں زندہ رہ سکوں گا؟ کیا میں زندہ رہنا چاہوں گا؟ موسیقی تیز ہوتی جا رہی ہے۔ سوالات گردش کر رہے ہیں —— موسیقی اور سوالات ایک دم گڈمڈ ہو گئے ہیں —— موسیقی.... سوالات۔ سوالات۔ موسیقی۔ موسیقی...... سوالات۔ سوالات.... موسیقی.....

میری آنکھیں اتنی پھیل چکی ہیں کہ ان کے کناروں سے حزن رسنے لگا ہے —— اب نہ ان میں اداسی کا ملبوس پہننے والی روشنی کا عکس ہے نہ شب چہرہ بادلوں کی شبیہ!

فضا خاموش ہے۔

فضا خاموش نہیں ہے۔

میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔

میں نے فیصلہ نہیں کیا ہے۔

میں اس شہر کو چھوڑ دوں گا۔

میں اس شہر کو نہیں چھوڑ دوں گا۔

⭑ ⭑ ⭑

غزلیں

حبیب جالبؔ

لاہور

ذرّے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سرِ عرصۂ غم آ تو گئے ہم

اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
رُوداد وفا دار پہ دُہرا تو گئے ہم

کہتے تھے جو اب کوئی نہیں جاں سے گزرتا
لو جاں سے گزر کر انھیں جھٹلا تو گئے ہم

جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دل اُن کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم

کچھ اور ہی عالم تھا پسِ چہرۂ یاراں
رہتا جو یونہی راز اُسے پا تو گئے ہم

اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر اُن سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ہم

اُٹھیں کہ نہ اُٹھیں یہ رضا ان کی ہے جالبؔ
لوگوں کو سرِ دار نظر آ تو گئے ہم

رضا ہمدانی

پشاور

ہر پھول، ہر کلی پہ ہے غم، میرے پیار کا
ہر شاخ پر گڑا ہے عَلَم، میرے پیار کا

پتھر کو ضربِ تیشہ گوارا ہے اس لیے
شاکی ہے زخم خوردہ صنم، میرے پیار کا

میں ہوں ازل سے عشق و محبت کا ترجماں
قرطاس پر رواں ہے قلم، میرے پیار کا

گُن گا رہے ہیں، میری محبت کے اہلِ دہر
اور معترف ہے شیخِ حرم میرے پیار کا

رُسوائے خلق تھیں، مِری رسوائیاں بہت
رکھا ہے میرے فن نے بھرم میرے پیار کا

اب کیا بتاؤں روزِ ازل سے کہاں کہاں
برسا ہے جا کے ابرِ کرم، میرے پیار کا

جون ایلیا

کراچی

جانے کہاں گیا وہ، وہ جو ابھی یہاں تھا
وہ جو ابھی یہاں تھا، وہ کون تھا کہاں تھا

وہ جا رہا تھا جس دم بس ایک دھند سی تھی
جب وہ چلا گیا تھا، میں تھا اور آسماں تھا

پلٹی ہے جس نگہ سے پرچھائیں میری اس میں
آندھی کی تھیں فصیلیں اور گرد کا مکاں تھا

کیا کیا نہ خون تھوکا میں اس گلی میں یارو
سچ جاننا وہاں تو جو فن تھا رائیگاں تھا

یہ وار کر گیا ہے پہلو سے کون مجھ پر
تھا میں ہی دائیں بائیں اور میں ہی درمیاں تھا

جب ڈوبتا چلا میں تاریکیوں کی تہ میں
تہ میں تھا اک دریچہ اور اس میں آسماں تھا

اعجاز اعظمی
ملائشیا

بہتا ہوں میں پگھل کے انا کے الاؤ سے
اترو گے پار کس طرح کاغذی ناؤ سے

گہرائیوں کی چپ کہیں طوفاں اٹھا نہ دے
بوجھل ہے سطح آب ہوا کے دباؤ سے

آؤ رخ سفینۂ افکار موڑ دیں
ساحل تو ڈوبتا ہے مسلسل کٹاؤ سے

صدیوں پہ ہے محیط مری داستانِ کرب
میں نے دیا ہے رنگ جسے دل کے گھاؤ سے

قدروں کے جو پہاڑ تھے کٹ کٹ کے بہہ گئے
اس سیلِ ارتقا کے کٹیلے بہاؤ سے

دل میں کدورتیں ہوں، زباں پر سلامِ شوق
اعجاز دشمنی ہی بھلی اس لگاؤ سے

اسرار زیدی
لاہور

وہ چاند کہ بادلوں میں گُم تھا
خود اپنی ہی قربتوں میں گُم تھا

دستک کی صدا تو آ رہی تھی
مَیں اپنے واہموں میں گُم تھا

شیریں سے سجا تھا قصرِ خسرو
فرہاد محبّتوں میں گُم تھا

مٹّی میں نمی کہاں سے آتی
پانی تو سمندروں میں گُم تھا

منزل کا سراغ دینے والا
بے نام مسافتوں میں گُم تھا

شاھین

آٹوا۔ کینیڈا

وہ جانے گا اسے تحقیر اپنی
میں ورنہ کاٹ دوں زنجیر اپنی

تحفظ کس نے پایا مقبرے میں
فنا کا خوف ہے تعمیر اپنی

لہو سے ہم نے اتنے جھوٹ لکھے
کہ سچی بن گئی تشہیر اپنی

اُن آنکھوں نے دکھائے خواب کیا کیا
جن آنکھوں میں نہ تھی تعبیر اپنی

مری ساری ندامت اُس نے لے لی
بہت مہنگی پڑی تقصیر اپنی

گنہ کو دل کا آئینہ بنایا
ہمیں مقصود تھی تطہیر اپنی

میں اب شاہین شاید پھٹ پڑوں گا
خموشی ہو چلی گمبھیر اپنی

ڈھل جائے گی یہ شام غمِ دل کو غزل کر
اے کشتۂ آلام غمِ دل کو غزل کر

یہ دل کے بکھیڑے تو سدا ساتھ رہیں گے
جینا ہے بڑا کام غمِ دل کو غزل کر

ہر وہم نتیجہ ہے فسردہ نظری کا
زندانیٔ اوہام غمِ دل کو غزل کر

دلدادۂ منزل کو خبر ہے کہ تھکن کا
منزل بھی ہے اِک نام غمِ دل کو غزل کر

خوشیاں تو ہیں شاہین گھڑی بھر کا اثاثہ
لے غم سے ہی کچھ کام غمِ دل کو غزل کر

شریف منور

قطعہ

ملتے رہنا، سنتے اور سناتے رہنا
کچھ ہو جائے آگے بات بڑھاتے رہنا

بالا خانوں، چوباروں پر گہری چپ ہے
تم تہہ خانے سے آواز لگاتے رہنا

لطفِ وصل الگ ہے، کیفِ ہجر جُدا
تم یہ کرم فرمانا آتے جاتے رہنا

کوئی نہیں تو دیواروں کے کان سہی
اپنی بات سناتے رہنا، گاتے رہنا

اس کی رخصت کا منظر جب یاد آ جائے
آنکھیں روشن رکھنا، ہاتھ ہلاتے رہنا

وقار ناصری

لکھنؤ

ہر غم پہ اختیار برابر بنا رہا
پتھر نہیں تھا اور میں پتھر بنا رہا

ہر تشنہ لب کے خواب فقط خواب ہی رہے
صحرا، سراب، ریت، سمندر بنا رہا

میں وہ شجر کہ جس کی جڑیں خشک ہو چکیں
رشتہ برا زمیں سے کیونکر بنا رہا

اَن دیکھے دشمنوں کا رہا خوف کس قدر
اپنا ہی سایہ اپنے لیے ڈر بنا رہا

کاغذ پہ بس گئی ہیں کئی بستیاں مگر
گھر جس کو چاہیے تھا وہ بے گھر بنا رہا

ہر سَر جھکا ہوا تھا کسی پاؤں کی طرف
میں تھا جو ایک لاشۂ بے سر بنا رہا

خیمے کی ہر طناب اکھڑتی گئی وقار
میں آندھیوں کے قہر کا منظر بنا رہا

رضی مجتبیٰ

پیرس

خود نگر تھے اور محوِ دیدِ حُسنِ یار تھے
ہم کہ اپنے روبرو شیشہ کی اِک دیوار تھے

پھر نگاہوں نے بُنے تھے چار سو خوابوں کے جال
سو بہ سو پھر رشتہ گردِ وہم و گماں کے تار تھے

مختصر سا ہے ہمارا قصۂ شوقِ سفر
ابرِ آوارہ تھے ہم لیکن سرِ کہسار تھے

خندہ ریز و گریہ گیں تھی زخمِ خاطر کی نمود
دُور دنیا کے تعیّن سے مرے آزار تھے

میں سوادِ دشتِ تنہائی کا پھلتا پیڑ تھا
سبز زہرِ بے کسی سے میرے برگ و بار تھے

بُجھ گیا تھا دل ہمارا بعدِ شرحِ آرزو
جی کڑا ہم کہنے گئے تو کشتۂ اظہار تھے

رائیگاں تھی اپنی آب و تاب بھی کیا کیا رضیؔ
ہم کہ اک بے معرکہ اور بے عدو تلوار تھے

ستار سیّد
میانوالی

یوں اہتمامِ ردِ سحر کر دیا گیا
ہر روشنی کو شہر بدر کر دیا گیا

اپنے گھروں کے سُکھ سے بھی روکش دکھائی دیں
لوگوں کو مبتلائے سفر کر دیا گیا

چہروں سے رنگ ہاتھ سے آئینے چھین کر
بے چہرگی کو رختِ نظر کر دیا گیا

اب جسم و جاں پہ حقِ تصرّف طلب کرے
ظالم کو اس قدر تو نڈر کر دیا گیا

درپے تھے ہر شجر کے تعفّن شعار لوگ
محروم خوشبوؤں سے نگر کر دیا گیا

وہ قحطِ غم پڑا ہے کہ اک بیں کے لیے
اہلِ کرم کا دست نگر کر دیا گیا

مُحِبّ عارفی

کراچی

عمر بھر جس پہ تکیہ رہا کچھ نہ تھا دل نہیں مانتا
کیا کروں تجزیوں کا اٹل فیصلہ دل نہیں مانتا

کوند کر ایک لمحہ جو پھر جا ملا وقت کے ابر میں
چھوڑ دے گی اُسے وقت کی مامتا دل نہیں مانتا

گھُپ اندھیرے سے لیتی ہے کیونکر جنم روشنی کی لگن
یہ کرشمہ نہیں ہے کسی شمع کا دل نہیں مانتا

خشک ہی کیوں نہ ہو جائے دریا مرا لہریں بن کے میں
ڈھونڈنا چھوڑ دوں خشکیوں کا سرا دل نہیں مانتا

اپنے مرکز کو اک وہم سمجھا کیا عقل کا دائرہ
جس کو کچھ اپنے دام کشش کے سوا دل نہیں مانتا

اس کی تصویر کو دیکھتے دیکھتے یہ ہوا کیا مجھے
یعنی بے حس ہے تصویر کی ہر ادا دل نہیں مانتا

دل میں کچھ ہے زباں سے نکلتا ہے کچھ بات ایسی ہے کچھ
میرا مطلب مُحِبّ کوئی پا جائے گا دل نہیں مانتا

حامد جعفری

بھوپال

جنوں میں ہم نوا کوئی نہیں ہے
کہ ہم سا دوسرا کوئی نہیں ہے

بڑا اِک جُرم ہے دل توڑنا بھی
مگر اِس کی سزا کوئی نہیں ہے

کھُلی آنکھوں سے کب تک خواب دیکھیں
یہاں تو جاگتا کوئی نہیں ہے

گھرا ہوں صورتوں کے جنگلوں میں
مرا غم آشنا کوئی نہیں ہے

مجھے مکتوب اُس کے نام بھیجو
مرا اپنا پتہ کوئی نہیں ہے

یہ مایوسی، یہ پاگل پن، ترا غم
مرا اِن کے سوا کوئی نہیں ہے

حمیرا رحمان

نیویارک

ان لفظوں میں خود کو ڈھونڈوں گی میں بھی
اپنی اَنا کا منظر دیکھوں گی میں بھی

کوئی مرے بارے میں نہ کچھ بھی جان سکے
اب ایسا لہجہ اپناؤں گی میں بھی

آنکھوں سے چُن کر سب ٹوٹے پھوٹے خواب
پتھر کی خواہش بن جاؤں گی میں بھی

میں خود اپنی سوچ کی مجرم ٹھہری ہوں
اب یہ عدالت خود ہی جھیلوں گی میں بھی

کس کس رنگ میں الہامات اُترتے ہیں
کس کس کی روداد یں لکھوں گی میں بھی

تصویروں کے مدھم رنگ بتاتے ہیں
اپنے کو پہچان نہ پاؤں گی میں بھی

دُکھ میں حمیراؔ اپنی حفاظت کرنے کو
پچھلے سبھی آسیب بُلاؤں گی میں بھی

جیسے کوئی ضدی بچہ کب بہلے بہلانے سے
ایسے ہم دنیا سے چھپ کر دیکھیں خواب بہانے سے

سب کچھ سمجھے لیکن اتنی بات نہیں پہچانے لوگ
مِل جاتا ہے چین کسی کو ایک تمہارے آنے سے

ہم تو غم کی ایک اک شدت باہر آنے سے روکیں
اُس کی آنکھیں باز نہ آئیں انگارے برسانے سے

لوگو! ہم پردیسی ہو کر جانے کیا کیا کھو بیٹھے
اپنے کوچے بھی لگتے ہیں بیگانے بیگانے سے

دیکھو دوست! تمہارا مقصد شاید ہمدردی ہی ہو
میرا پیکر ٹوٹ گرے گا وہ باتیں دہرانے سے

گھر کا سناٹا تو حمیراؔ ہنگاموں کے نذر ہوا
دل کی ویرانی ویسی کی ویسی ایک زمانے سے

حسنین جعفری
کراچی

ماتم وہی ہے اشک فشانی ہے ایک سی
بس عہد مختلف ہے کہانی ہے ایک سی

دیکھا تو بس یہی کہ تری قتل گاہ میں
بچپن بھی ایک سا ہے جوانی ہے ایک سی

بے یار و بے دیار حصارِ سپاہ میں
سارے گھروں کی تشنہ دہانی ہے ایک سی

ارضِ سپاسِ عشق پہ گل رنگ ہے لہو
ہر واقعہ کے بعد نشانی ہے ایک سی

پورا کہاں ہوا ہے ابھی ہجرتوں کا باب
اک بار اور نقل مکانی ہے ایک سی

باہر وہ جبر ہے کہیں آہ و فغاں نہیں
اندر لہو کے مرثیہ خوانی ہے ایک سی

محمد انور
بالٹی مور۔ امریکہ

ہے متاعِ عشق ہر خواہش کے مٹ جانے کا نام
جذبۂ دل ہے شعورِ زندگی پانے کا نام

اپنی گم نامی کی یارو! یہ بھی اک تصویر ہے
لوگ ہم سے پوچھتے ہیں ان کے دیوانے کا نام

ہستیٔ اہلِ محبت، مستیٔ اہلِ جنوں...!!!
بارگاہِ حسن میں بے دام بک جانے کا نام

عشق سے پہلے دلِ معصوم اتنا سوچ لے
زندگی رہ جائے گی گھٹ گھٹ کے مر جانے کا نام

کاش ایسا ہو کہ انورؔ وہ خیالوں کی طرح
میری تنہائی میں آکر پھر نہ لیں جانے کا نام

ابرار احمد

اسلام آباد

کوئی بات، اپنی بھی، کوئی اپنا لہجہ بھی،
اور ایسی خواہش پر بے دلی کا پہرہ بھی

سارے خواب اَن ہونے، سارے حرف نادیدہ
اک ہجوم، اَن دیکھا، اور میں اکیلا بھی

جنگلوں کی سانسیں بھی، شہر کی اداسی بھی
آج تو چلے کوئی زندگی کا جھونکا بھی

کوئی شام ایسی ہو، جس کا رنگ اُجلا ہو
کوئی تو سحر ایسی، جس کا رنگ میلا بھی

ایک نام میرا بھی۔ جو نظر نہیں آتا
تو بہت اکیلا بھی، تیرے ساتھ دنیا بھی

تو نے جس طرح چاہا، مجھ کو نقش پہنائے
دیکھنا بگاڑوں گا اب میں تیرا چہرہ بھی

سیّد جہانگیر ہمدانی

برکلے۔ کیلی فورنیا

یوں رشتۂ جاں میں ہے پرویا تجھے میں نے
جو سانس نکلتی ہے وہ موتی کی لڑی ہے

دروازہ امیدوں کا کھلا ہے یونہی ہر بار
رہزن کی بھی آہٹ مرے کانوں میں پڑی ہے

ہم واقفِ زنجیرِ ستم خوب ہیں جس نے
جکڑا ہے زباں کو کبھی گردن میں پڑی ہے

آزادیٔ اظہار کا دستور ہے ہمدم
حق گوئیٔ گفتار پہ سُولی ہی کھڑی ہے

شاہین بدر
کراچی

نام لکھا میرا، پھر وہ آبدیدہ ہو گیا
فرشِ تنہائی پہ یادوں کو بچھا کر سو گیا

کوئی بھی رُت ہو، مگر آتی ہے خوشبو دھوپ کی
جسم کی وادی میں میرے کون سورج بو گیا

میرے ہونٹوں پر تبسم کا جو گہرا داغ تھا
وقت کا سیلاب آیا اور اس کو دھو گیا

وہ صحیفہ ہوں کہ بوسیدہ ہے جس کا ہر ورق
حالتِ خستہ پہ جس کی آسماں بھی رو گیا

چاندنی کی پتیوں پر عہدِ رفتہ ہے رقم
قطرۂ شبنم مری آنکھوں کا تارا ہو گیا

تحفۂ نمناک آنکھوں کے لیے مخصوص تھا
اور دلِ دیوانہ اس کی لذتوں میں کھو گیا

آنسوؤں کو نیند آئی، آئینے چپ ہو گئے
رنگ اُس دستِ حنائی کا بھی پھیلا ہو گیا

تزئین حنا
واشنگٹن۔ ڈی سی

صورت نہ دکھا اپنی، تو آواز سنا دے
سہہ لوں میں جسے جاں پہ بس اتنی سزا دے

خوابیدہ مقدر کا چلن سیکھ لے تو بھی
اے دیدۂ بے خواب مجھے یوں نہ سزا دے

مانا کہ ہوئی رسمِ وفا نذرِ تغیر
رسم و رہِ دنیا تو بہر طور نبھا دے

اب مرنے کی خواہش ہے نہ جینے کی تمنا
کوئی تو خدارا مرا احساس جگا دے

کہتے ہیں کہ شیشہ میں ڈھلا عکس ہے سچا
اے کاش کوئی مجھ کو بھی آئینہ دکھا دے

اصغر مہدی نظمی

کراچی

بے رنگ تمناؤں کا منظر نہیں بدلا
دیوار تو بدلی ہے مگر در نہیں بدلا

اچھا ہے رفاقت کا صلہ یہ بھی عزیزو
رُخ پھیرا ہے دریا نے سمندر نہیں بدلا

کچھ سلسلۂ حرف و معانی ہو تو کہنا
لہجہ ترے مکتوب کا یکسر نہیں بدلا

اک تارِ نفس توڑ گیا رات کا جادو
اک شوقِ نظارا ہے کہ منظر نہیں بدلا

ابتک وہیں بیٹھا ہوں جہاں دھوپ نہ چھاؤں
ابتک مرے احساس کا محور نہیں بدلا

رستہ بھی وہی رہبر و راہی بھی وہی ہیں
تسخیرِ مہ و سال کا لشکر نہیں بدلا
بویا جو بزرگوں نے وہی کاٹ رہے ہیں
ابتک مرے بچوں کا مقدر نہیں بدلا

عقیل عباس جعفری

کراچی

شہرِ سخن میں جرأتِ اظہار بیچ کر
اہلِ قلم ہیں شادماں پندار بیچ کر

سکّہ تو کوئی شہر میں چلتا نہیں مگر
سب کچھ خرید لیجیے کردار بیچ کر

اس گھر میں شاید اس لیے بستا نہیں کوئی
یہ گھر بنا ہے سایۂ دیوار بیچ کر

چھوٹی سی اک خبر نہ چھپی اس کی موت پر
جس نے بسر کی زندگی اخبار بیچ کر

ہیں میری بے بسی پہ وہی خندہ زن عقیلؔ
آیا تھا جن کے واسطے گھر بار بیچ کر

ڈاکٹر سلمان اختر

پنسلوانیا۔ امریکہ

سیکھی نئی زبان وطن سے جُدا ہوئے
جینے کی دوڑ دھوپ میں ہم کیا سے کیا ہوئے

شاخیں پکارتی رہیں پیپل کے پیڑ کی
پتّے کی طرح لے اُڑے تجھ کو ہوا ہوئے

فٹ پاتھ پر پڑے تھے تو کھاتے تھے ٹھوکریں
مندر میں جا کے بیٹھ گئے اور خدا ہوئے

تبدیلیاں نہ پُوچھیے اُن کے مزاج کی
لُو بن گئے کبھی، کبھی بادِ صبا ہوئے

پرچھائیں بن کے ساتھ رہے تیز دھوپ میں
بیمار دوستوں کے لیے ہم دوا ہوئے

کر کے لوگوں سے وہ اِک شخص بہانے کیا کیا
پُوچھتا ہوگا مرے بارے میں جانے کیا کیا

سامنے گھر کے، جنازے پہ بڑا ماتم تھا!
بند دروازے کے پیچھے تھا نہ جانے کیا کیا

دو گھڑی نیند میسّر نہیں آتی اُس کو
جس نے دیکھے تھے کبھی خواب سہانے کیا کیا

چھوڑ کر جس کو چلے آئے ہیں بے رحمی سے
ہائے اُس شہر میں تھے، اپنے ٹھکانے کیا کیا

مت علی گڑھ کی طرف ترچھی نظر سے دیکھو
دفن اس دشت میں ہیں اب بھی خزانے کیا کیا

سلمان سعید
لاہور

جب تجھے کھو کے میں نے پایا تھا
دل کو کتنا قرار آیا تھا

اجنبی تھا میں تیری گلیوں میں
میرے ہمراہ میرا سایہ تھا
میری آنکھوں میں خواب تھے کتنے
جب میں تیرے نگر میں آیا تھا

وہ گھڑی یاد ہے مجھے اب تک
جب وہ شرما کے مسکرایا تھا

لگ رہا تھا جو دور سے اپنا
پاس آنے پہ وہ پرایا تھا

عابد جعفری
ٹورنٹو

کیوں اجنبی سا آج ہمیں اپنا گھر لگا
یہ کیا ہوا کہ اپنے ہی سائے سے ڈر لگا

اس کی ہر ایک شاخ پہ بے جان جسم ہیں
چھوڑا ہے کس نے دشت میں تنہا شجر لگا

اُس سے ملے تو ہم کو ملا زخم زخم دل
وہ شخص دیکھنے میں بڑا معتبر لگا

بیٹھے رہے تو پاؤں میں چبھنے لگا سکوت
اُٹھے تو بے حسی کی گھٹاؤں سے سر لگا

چہرے پہ جم رہی ہے گئے قافلوں کی دھول
عزم سفر بھی ہم کو بڑا بے ہنر لگا

کوئی تو ہو کہ جس سے تبسم اُدھار لیں
اس شہر میں تو جو بھی ملا نوحہ گر لگا

حسن عابد
کراچی

یہ جو نے میں نوا کے قصّے ہیں
دلِ نغمہ سرا کے قصّے ہیں

داستاں عشق کی حدیثِ جنوں
اِک دلِ مُبتلا کے قصّے ہیں

پیکرِ نظم ہو کہ حرفِ غزل
سب اُسی خوش اَدا کے قصّے ہیں
اک زُلیخائے آرزو کے سخن
ایک شہرِ سبا کے قصّے ہیں

وصل کی صُبح اُس کی آنکھوں میں
ہلکی ہلکی حیا کے قصّے ہیں

ہیں اُفق پر جو سُرخیاں سی عیاں
آنے والی ہوا کے قصّے ہیں

داستانِ امیر حمزہ ، ہیچ
شہرِ دل میں بلا کے قصّے ہیں

ڈاکٹر محمد حسن

جواہر لال نہرو یونیورسٹی ۔ دہلی

"اردو انٹرنیشنل" ملا۔ آپ کی سلیقہ مندی کا اظہار ہر ہر ورق سے ہو رہا ہے۔ آپ نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ زمانے نے جغرافیائی فاصلوں اور تہذیبی اختلافات پر فتح پانے کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ ضرورت ہے کہ عصری حسیت کا سراغ لگایا جائے۔ اردو والے یوں بھی ملکوں ملکوں بکھرے ہوئے ہیں۔ امید ہے "اردو انٹرنیشنل" ان کی ادبی شیرازہ بندی کا فریضہ ادا کر سکے گا۔ اردو والوں میں ابھی تک تخلیقی آگ باقی ہے صرف اسے ایک نئے وجدان کی ضرورت ہے۔ ایک عالمی کمٹ منٹ سے پھر نئی آگہی اور نئی جمالیات ابھر سکتی ہے۔ آپ کے رسالے کے مخاطب عالمی آگہی اور عالمی معیاروں سے واقف اور متاثر اردو والے ہونے چاہئیں۔ نیز اردو کی عالمی سطح پر بکھری ہوئی آبادی کی دھڑکنیں اور خیالات کی رو۔ اور وہ لہریں بھی جن کا اظہار وہ خود اپنے ممالک اور اپنے معاشرے میں نہیں کر سکتے۔ گویا یہ رسالہ محض (WESTERNISATION) کا نہیں، صحیح معنوں میں MODERNISATION کا وسیلہ ہونا چاہیے۔ اور جدید تحریکوں اور ادبی سرگرمیوں اور میلانات سے معمور بھی ہونا چاہیے۔

انور احسن صدیقی

کراچی

کینیڈا جیسے دور دراز ملک سے "اردو انٹرنیشنل" کا اجرا بلاشبہ اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کی جانب ایک اہم قدم ہے اور آپ اس پہل کاری کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ یہ رسالہ نہ صرف غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں کو اردو ادب کی ترقی کی رفتار سے واقف رکھنے کا فریضہ ادا کرے گا، بلکہ خود پاکستان کے لوگوں کے لیے بھی یہ ادبی جرائد میں ایک مستحسن اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں ادبی جرائد کا جو قحط ہے، اس کے پس منظر میں خاص طور پر اس گراں قدر کاوش کی داد دینی چاہیئے۔

"اردو انٹرنیشنل" کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان اور پاکستان، دونوں ممالک کے اردو والوں کے درمیان ایک مستحکم رابطے کا کام دے گا۔ جب کہ فی الوقت اس رابطے کی کوئی ٹھوس اور واضح شکل موجود نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان، دونوں جگہ اردو زبان میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن بدقسمتی سے ثقافتی اور ادبی روابط کے فقدان کے باعث دونوں جگہ کے لوگ ایک دوسرے کی تحریروں سے کماحقہٗ واقف نہیں ہو پاتے۔ اُمید ہے کہ "اردو انٹرنیشنل" اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر سکے گا۔

جمال زبیری

ٹورنٹو

اس رسالے کے اجرا میں جس قدر جاں فشانی اور محنت کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ دوسرے شمارے میں عنوانات کی تقسیم میں بڑے سلیقے کا ثبوت دیا ہے۔ اس کو جاری رکھنا چاہیے۔ دوسرے شمارے کی خاص بات وہ نظمیں ہیں جن کو "بیروت" کے عنوان سے علیحدہ سیاہ کاغذ پر چھاپ کر لوگوں کو اس عظیم المیے کی یاد دلائی ہے۔ فیضؔ صاحب نے یہاں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ ہر ادیب اور خاص کر ہر مسلمان ادیب کا فرض ہے کہ وہ لبنان کے المیے کو بھولنے نہ دے کہ جس طرح نازی جرمنی کے مظالم کو آج بھی یہودی ایک عظیم سوگ کی طرح مناتے ہیں۔ فیضؔ صاحب کی بات کی لاج رکھتے ہوئے بیروت پر جس انداز سے نظمیں شائع کی گئی ہیں وہ میرے نزدیک شہیدانِ لبنان کے خون کا حق ادا کرنے کے مترادف ہے۔

فیضؔ صاحب نے تو خود یہ المیہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ "کربلائے بیروت" کے اس میں ایک نئے لبنان کی بشارت ملتی ہے۔

جو چہرے لہو کے غازے کی — زینت سے سوا پُر نور ہوئے
اب اُن کی دمک کے پَرتو سے — اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اب خنگ نگ ہے ارضِ لبناں — بیروت نگارِ بزمِ جہاں

بیروت بدیلِ باغِ جناں

احمد فرازؔ کی زبان سے نکلا ہوا یہ شکوہ، کیونکر نہ خون رُلائے گا۔

محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چُپ
بادشاہ چُپ ہیں
حرم کے سب پاسبان، عالم پناہ چُپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے سربراہ چُپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے لا الہٰ چُپ ہیں

مگر خالد علیگ کی نظم "آوازِ شہید" کا آخری بند پڑھ کر ایسا لگا جیسے کسی نے روح کو جھنجھوڑ ڈالا اور بے اختیار آنسو بہنے لگے میرے نزدیک خالد نے یہ بند کہہ کر دنیا کے ہر مسلمان کو للکارا ہے کہ وہ اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھئے کہ اس المیہ میں اس کا کتنا ہاتھ ہے۔

مجھ کو امریکہ سے اسرائیل سے شکوہ نہیں
میرے قاتل میرے ماں جایوں میں، ہمسایوں میں ہیں

مجھ کو مقتل میں نہتا بھیجنے والوں میں ہیں

میرا دشمن ہے ریاض

میرے دشمن انقرہ، جکارتا

میرے دشمن قاہرہ، بغداد عمّان و رباط

میرا دشمن کوفۂ نو ہے سلام آباد ہے

میری دشمن اُمتِ مرحوم ہے

میرا قاتل عالمِ اسلام ہے

اطہر رضوی کی نظم کے صرف یہ دو مصرعے ہی جذبات کی سچی تصویر ہیں

مغرب بیروت تجھ پر ہم فدا

یا

تو کہاں ہے آسمانوں کے خدا

پرچے کے دوسرے حصوں میں جس سلیقے کا ثبوت دیا ہے، خدا کرے وہ قائم رہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل کا طنزیہ ڈرامہ "خفیہ ہاتھ" بہت اچھی چیز ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا مضمون "پاکستانی ادب میں احتجاج کی آواز" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ اب بھی پاکستان کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کے ضمیر زندہ ہیں۔

ڈاکٹر سلمان اختر

پنسلوانیا، امریکہ

اردو انٹرنیشنل دیکھا دل ایسا خوش ہوا کہ مت پوچھئے۔ آپ نے اردو کو صحیح معنوں میں انٹرنیشنل بنا دیا۔ کمال مصطفٰے کا افسانہ "مرتد" حاصلِ رسالہ (پہلا شمارہ) رہا۔ ان کو شائع کرتے رہیئے۔

پروفیسر عبد القوی ضیاؔ

لارنٹین یونیورسٹی، سڈبری

اردو انٹرنیشنل کا دوسرا شمارہ ملا۔ آپ نے اسے جس خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے نکالا ہے۔ اس کی داد نہ دینا آپ کے ساتھ بیداد ہوگی اس کی دیدہ زیبی، حُسن اور معیار کو دیکھ کر آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر یہ مجلّہ اسی انداز سے نکلتا رہا تو مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد دنیا سے اردو ادب میں ایک مستحکم روایت بن جائے گا۔ اور ہماری ثقافت و زبان میں آگے چل کر ایک گراں قدر اضافہ کرے گا

علی عباس اُمیدؔ

بھوپال

ایک دوست نے گزشتہ ماہ آپ کا خوبصورت جریدہ لاہور سے بھیجا، بے حد پسند آیا، دست بدعا ہوں کہ جاری رہے۔ تحفۂ درویش کے مصداق تخلیقات نذر کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر منیر الدین احمد

ہمبرگ، جرمنی

اردو انٹرنیشنل کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔ اس کے اندر ظاہری و باطنی دونوں اقسام کی خوبیاں ہیں۔ محمد علی صدیقی نے "ڈان" میں اس کی جو تعریف کی تھی وہ بجا تھی۔ میرا تعاون آپ کے ساتھ ہے۔ اردو انٹرنیشنل کے لئے تازہ افسانہ حاضر خدمت ہے۔

اعجاز اعظمی

ملائیشیا

کافی انتظار کے بعد "اردو انٹرنیشنل" ملا تو چشم کو روشن اور دل کو شاد کر گیا۔ حنیف احمد حنیف، ڈاکٹر قمر رئیس، علی سردار جعفری، محمد علی صدیقی، رشید امجد، مرزا حامد بیگ، زاہدہ حنا، فارغ بخاری اور قمر عباس ندیم جس مجلے کی زینت ہوں اس کے معیار و مزاج کو کون چیلنج کر سکتا ہے۔

شہزاد منظر

کراچی

پرچہ بہت شاندار ہے، طباعت، جلد سازی اور کاغذ کے معیار کا کیا کہنا تم نے سارے ہندوستان اور پاکستان کو نمائندگی دی ہے۔ یہ اچھا کیا۔ مصنف کے نام کے سامنے اس کے ملک کا نام لکھ دینے سے یہ تو ظاہر ہوا کہ "اردو" واقعی ایک انٹرنیشنل جریدہ ہے۔ محمد علی صدیقی کی کتاب پر تمہارا مضمون خاص طور پر پسند آیا۔ اس سے تمہاری تنقیدی بصیرت کا بھی علم ہوا۔

ڈاکٹر نصرت یار خان

آٹوا

آج صبح شاہین صاحب سے ملاقات ہوئی اور اردو انٹرنیشنل کا پہلا شمارہ دیکھا۔ یہ پرچہ آپ کی خوش مذاقی کا ثبوت ہے۔ مواد کے لحاظ سے بھی اور بہت طباعتی کے لحاظ سے بھی۔

نیلوفر تیموری

وینکور، کینیڈا

اس سرزمین پر بقائے اُردو کے لئے کوئی کام کرنے کے معنی ہیں۔ اپنے تہذیبی اور تمدنی نقوش کو ابھارنا اور یہ سچ ہے کہ یہ کام آپ نے بڑے سلیقے سے شروع کیا ہے۔

مجاہد علی

ناروے

اپنے وطن اور خطۂ اردو سے اتنی دور اردو ادب کا اتنا خوبصورت پرچہ شائع کرنے پر آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں یہاں پر اردو کے جو لکھنے والے ہیں میں ضرور انہیں اس بات پر آمادہ کروں گا کہ وہ اس پرچے کے لئے لکھیں، میرے نزدیک آپ کو اس بات پر توجہ مرکوز کرنی چاہیئے کہ جب ادیب اپنے خطے کو چھوڑ کر نئے خطوں میں آباد ہوتا ہے تو نئے حالات اور ضروریات اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

مرزا حامد بیگ

راولپنڈی

اردو انٹرنیشنل کا اولین عمدہ شمارہ دو چار روز پہلے موصول ہوا۔ کینیڈا سے یہ کوشش یادگار رہے گی۔ اردو انٹرنیشنل کے لئے ایک تازہ افسانہ بھیج رہا ہوں۔

زہرا نگاہ

لندن

اُردو انٹرنیشنل کو دیکھ کر ہی خوشی ہوئی تھی۔ پڑھ کر تو بہت ہی اچھا لگا میں جلد ہی کچھ نہ کچھ اردو انٹرنیشنل کے لئے روانہ کروں گی۔

ہرچرن چاولہ

ناروے

اُردو انٹرنیشنل کا مواد اور شکل وصورت دونوں دلپذیر ہیں۔ حصۂ شاعری فیکس سے جا آب تک چلا گیا ہے اسی طرح افسانے ہیں سب بڑے نام موجود ہیں مضامین کے لحاظ سے بھی اسے کسی بھی بڑے ادبی رسالے کے مقابلے میں رکھا

جاسکتا ہے۔ باہر سے ایسا ادبی جریدہ نکالنا بہت بڑا کام ہے۔ اور اس کے لئے بہت ہی زیادہ مضبوط دل گردے اور سخت کاندھوں کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ

سلور اسپرنگ، امریکہ

اُردو انٹرنیشنل کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیں۔ اس رسالے کو قائم رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ میں ہر طرح سے آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔

ادا جعفری

واشنگٹن

ان دنوں میں واشنگٹن میں ہوں، ٹورنٹو میں آپ کا پرچہ ملا، اتنا کامیاب، خوبصورت اور معیاری رسالہ ٹورنٹو جیسے شہر سے شائع کرنے کی مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ لوگ اتنی دور آ بسے ہیں لیکن اپنی تہذیب و زبان سے جو والہانہ لگاؤ آپ لوگوں کو ہے۔ وہ قابلِ صد ستائش ہے۔

ڈاکٹر نریش

پنجاب یونیورسٹی۔ چنڈی گڑھ

اُردو انٹرنیشنل کا پہلا شمارہ موصول ہوا، پردیس میں رہتے ہوئے اردو کی خدمت کا جو جذبہ آپ کے دل میں ہے وہ قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ تحسین بھی۔ میں حتی الوسع تعاون کروں گا۔

ستیش بترا

فرید آباد، ہندوستان

اُردو انٹرنیشنل کا صاف ستھرا اور حسین شمارہ مل گیا ہے کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کینڈا جیسے دور افتادہ ملک میں ایک اچھے ادبی پرچے کا مواد فراہم ہو سکتا ہے اور اسے اس خوبصورتی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ آپ کے اس پرچے میں مرحوم قمر عباس ندیم سے بھی ملاقات ہو گئی ورنہ ہم ہندوستان میں بیٹھے ان کے ان قابلِ قدر افسانوں سے محروم رہتے،

تبصرہ

انور احسن صدیقی

مصنف ۔ فارغ بخاری
صفحات ۔ ۱۲۸ قیمت ۱۸ روپے
ناشر۔ آئینہ ادب چوک مینار انار کلی لاہور

پیاسے ہاتھ

شعری مجموعہ

حقیقتوں کے رنگ بھی ہزار ہیں ٭ صداقتیں ہیں اور بے شمار ہیں (فارغ بخاری)

اور فارغ بخاری کی شاعری بھی حقیقتوں اور صداقتوں کی تلاش کی، حقیقتوں اور صداقتوں کی پرکھ کی، سچائی، حُسن اور خیر سے محبت کی اور ظلم، استحصال، جبر و ستم سے نفرت کی اک طویل داستان ہے۔ اس ورق در ورق داستان کا ایک ایک حرف اپنے اندر ایک حساس اور گہرا سماجی شعور رکھنے والے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

"پیاسے ہاتھ" فارغ بخاری کا تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی ہیں۔ کچھ آزاد نظمیں ہیں اور کچھ پابند نظمیں۔ مجموعے کی پہلی ہی نظم "میرے منصف خدا میرے عادل خدا" سماجی اور سیاسی جبر کے خلاف ایک سچی اور بے ریا صدائے احتجاج کی صورت رکھتی ہے۔ مصلحتوں، منافقتوں اور ذہنی دریوزہ گری کے مارے ہوئے اس معاشرے میں وہ سچائی کی روشنی کو تلاش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

میرے دانشوروں کی زبوں سوچ کو ٭ کوئی خورشید دے کوئی مہتاب دے

فارغ کی شاعری گہرا آفاقی رنگ لیئے ہوئے ہے۔ اس میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ کائنات بھی۔ لیکن وہ ذات پرستی کے مریضانہ رجحان کا شکار کبھی نہیں ہوتے۔ سچے جذبوں کی سچی اور فنکارانہ عکاسی کا ظرف ایک طویل ریاضت اور گہری کاوشوں کے بعد حاصل ہوتا ہے اور فارغ ان مراحل سے بخیر و خوبی گزر چکے ہیں۔ ان کے ہاں اظہار کی سچائی غمِ ذات کے دائرے کو بڑھا کر غمِ کائنات تک وسیع کر دیتی ہے۔ اور یوں ان کے دل کی دھڑکنیں تمام دکھی دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں اور ان کی آواز نوائے عصر بن جاتی ہے۔ یہی وہ لب و لہجہ ہے جو حسنِ اظہار کے ساتھ ساتھ ایقان اور اُمید کو بھی استحکام بخشتا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں شامل فارغ کی زیادہ تر منظومات کا تعلق ان کے غیر ممالک کے دورے سے ہے۔ وطن کی سرزمین سے باہر لکھی جانے والی یہ نگارشات شاعر کے ذہن کے وسیع اور مربوط آفاق کی نمائندگی کرتی ہیں اور اس کے فکری زاویوں کی ہمہ جہتی کا اظہار کرتی ہیں۔ فارغ اپنے وطن سے باہر رہتے ہوئے باہر کی چیزوں کو اپنے وطن، اپنے ماحول اور اپنی سرزمین کے مسائل کے حوالے سے ہی دیکھتے ہیں۔ وہ باہر کی دنیا کی محض بے روح تصویر کشی نہیں کرتے، بلکہ "یہاں" اور "وہاں" میں جو فرق ہے، اور اس کے جو سماجی اور معاشی محرکات ہیں، ان کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا ذہن ایک باشعور تجزیہ کار کا ذہن ہے اور اس شعری تجزیے کو وہ سارے فنی لوازمات کے ساتھ قاری تک پہنچاتے ہیں۔ ان کی آنکھیں باہر کی دنیا میں رنگ و نور اور رقص و نغمہ کے سیلِ بیکراں کی حشر سامانیوں سے چکا چوند نہیں ہوتیں، بلکہ اس کے پیچھے چھپے ہوئے زہراب کو بھی تلاش کر لیتی ہیں۔ "آئن اسٹائن"، "فرانس، لاس ویگاس" اور "ہالی وڈ" وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے گہری سماجی حسیت سے کام لیتے ہوئے ان کو حقیقت شناس اور صداقت آشنا تجزیہ کا سا ہنر دکھایا ہے۔

فارغ کی غزلیں اپنے اندر انسانی زندگی کے پیچ در پیچ المیوں، نا آسودہ تمناؤں اور گہری داخلی کیفیتوں کا ایک محشر لیے ہوتے ہیں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ؎

اے کاش وہ لمحہ بھر ہی ٹھہرے ۔۔۔ جی لیں گے وہ لمحہ اوڑھ کر ہم ۔۔۔ یا

جہاں بھی جاؤں مرے ہمرکاب بھی تو ہے ۔۔۔ جدا بھی مجھ سے ہے لیکن عجیب بات ہے یہ ۔۔۔ یا

یہ کس کے واسطے دل سے دعا نکلنے لگی ۔۔۔ یہ کس نے درد کی دولت سے کر دیا ہے غنی ۔۔۔ یا

جیسے تمام کھوئے ہوئے خواب پا لیے ۔۔۔ دیکھا تجھے تو آنکھوں نے ایواں سجا لیے

تو وہ انسانی جذبات و احساسات کی وہ کہانی ایک نئے انداز میں دہراتے ہیں جو ہزاروں سال پرانی ہونے کے باوجود ہر لمحہ تازہ اور ہر آن نئی ہے اور اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے ہمیشہ نئے نئے سانچے اور نئے نئے اسالیب تراشتی رہتی ہے، ہر معاشرے میں، ہر زبان میں۔

فارغ نے اردو کے دیگر جدید اور باکمال شعراء کی طرح غزل کو ایک نیا حسن عطا کرنے کے علاوہ اسے وہ نئی معنویت بھی بخشی ہے جو خالصتاً عہدِ جدید سے عبارت ہے اور جس نے غزل کو اس دور میں بھی ایک متحرک اور فعال صنفِ سخن کی حیثیت سے زندہ رکھا ہے

کتاب حسن و اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔

URDU INTERNATIONAL: February 1983, Volume 2 - No. 1

Editor Ashfaq Hussain

Associate Hasan Abid

Advisory Council Faiz Ahmed Faiz
Dr Qamar Raees
(Delhi University)
Dr Abdul Q Lodhi
(University of Toronto
The Ontario Institute for Studies in Education)

Circulation Manager Abid Jafri

URDU INTERNATIONAL, a journal of literature and literary criticism, is published quarterly in August, November, February and May by the U I Publishers, Toronto, Canada Subscription rates institutions, 1 year $40 00, individuals, 1 year $20 00 Single copy rates institutions $10 00, individuals $5 00

Concerning manuscripts, address
Ashfaq Hussain, Editor, Urdu International,
9-Thirty-fifth Street, Suite 2, Toronto, Ontario, Canada M8W 3J8
Tel. (416) 255-3588

 Printed in Canada

شمالی امریکہ سے نکلنے والا علمی و ادبی مجلّہ

سہ ماہی

اردو انٹرنیشنل کینیڈا

(۴)

مُدیر

اشفاق حسین

معاونِ خصوصی

پروفیسر حسن عابد

جلد ۲ مئی ۔ جولائی ۱۹۸۳ء شمارہ ۲

مجلس مشاورت

فیض احمد فیض

ڈاکٹر قمر رئیس

دھلی یونیورسٹی

ڈاکٹر عبد القیوم لودھی

یونیورسٹی آف ٹورنٹو

سرکولیشن منیجر:

عابد جعفری

فی شمارہ

قیمت پانچ ڈالر

ترتیب

اداریہ

افسانے، انشائیے

نظمیں

مضامین

غزلیں

خطوط و تبصرے

اُردو انٹرنیشنل کا چوتھا شمارہ آپ کے پیشِ نظر ہے۔ چار سہ ماہی، تین سو پینسٹھ دن یا ایک سال یوں لگتا ہے ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ویسے بھی سفر کسی نوعیت کا ہو کل اور آج لمحوں کی گلتی ہوئی زنجیروں کے سوا اور کیا ہیں۔ لیکن اہم بات زنجیر کی جھنکار ہے جو وقت کی پہنائی میں گونجتی رہتی ہے اور جس سے حال و مستقبل کے گوشہائے ادب آشنا ہیں گے۔ سو میں نے میرے ساتھیوں نے اور لکھنے والوں نے ایک ہلکی سی جھنکار ہی سہی مگر اپنے وجود کے اظہار کے لیے کچھ حوالے ضرور فراہم کیے ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کی سوچ کے سمندر میں چند لہریں ابھارنے میں ہماری بھی کاوشیں ہیں، پاک و ہند کی زمینی حدود سے دور ایک چراغ جلانے کی ہم نے بھی کوشش کی ہے۔ اردو زبان و ادب کے بہت سے چراغ نہ صرف شمالی امریکہ بلکہ دوسرے برِاعظموں میں بھی روشن ہیں۔ اور ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ ہم وہ چراغ ہیں جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ ہماری منزل نہیں، ہمارے قدم یہاں رُکنے نہیں چاہئیں۔ کیونکہ ہم تو ایک چراغاں کا سا سماں پیدا کرنا چاہتے ہیں، جب ہمیں انگلیوں پر گننے کے بجائے آنکھوں سے شمار کیا جائے اور آخر میں صرف ایک کا ہندسہ رہ جائے جسے اجتماعی کوششوں کا استعارہ کہا جائے۔

اس موقعہ پر ہم اُن تمام قلمکاروں کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہوں نے اس رسالے کے ابتدائی دنوں میں ساتھ دیا، اپنے رشحاتِ قلم سے اس سہ ماہی کے وقار میں اضافہ کیا۔ اور وہ لوگ بھی ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جو اس رسالے کے خریدار بنے، اس کو دلچسپی سے پڑھا اور اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔ تنقید کے ذریعہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو سہارا دینے کی کوشش کی اور تعریف کے ذریعے حوصلہ ہارتے ہوئے قدموں کی ہمت بندھائی۔

ایک اور بات جس کی وضاحت کرنا مناسب ہے وہ یہ کہ اس ایک سال کے دوران اس چیز کی بھرپور کوشش کی گئی کہ رسالہ ہر سہ ماہی پر باقاعدگی سے نکلتا رہے اور ہم اس میں اب تک سو فیصد کامیاب رہے ہیں، چنانچہ شمالی امریکہ اور یورپ کے قارئین کو یہ رسالے ہمیشہ وقت پر ملتے رہے ہیں۔ البتہ پاک و ہند کے ادبی حلقوں سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ انہیں انتہائی کوششوں کے باوجود رسالہ وقت پر نہ مل سکا اور اس کی بہت سی وجوہ ہیں جسے کچھ کچھ وہ بھی سمجھتے ہیں۔ بہر حال ہماری طرف سے اس سلسلے میں ہمیشہ کوششیں جاری رہیں گی۔

اشفاق حسین

افسانے
انشائیے

جوگندر پال

دہلی

مست قلندر

کیوں قلندر، اتنا مَل مَل کے منہ کیوں دھوئے جا رہے ہو؟

سنو گے قلندر؟

اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔

تو پہلے تعظیم سے بیٹھو، میرے بیان میں پیر و مُرشد کا ذکر ہے۔

اچھا، لو بیٹھ گیا۔

نہیں سیدھے ہو کر بیٹھو۔

جب تک میں سیدھا ہوتا ہوں قلندر، تم منہ دھو آؤ، ورنہ صابن آنکھوں میں جا چُبھے گا۔

تو کیا ہوا؟ صابن ہی تو ہے کوئی کانٹا تو نہیں۔ چُبھے گا تو گُھل بھی جائے گا۔

نہیں پہلے منہ دھو آؤ۔

نہیں، پہلے تم سنو۔ آج میں نے خواب میں پیر و مُرشد کو دیکھا ہے۔

واقعی، قلندر؟

ہاں، میں زار و قطار رو رہا تھا۔ پیر و مرشد آہستہ آہستہ میرے قریب آئے اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

ٹھہرو قلندر، پہلے پیرو مرشد کا حلیہ بیان کرو۔

حُلیہ تو ہم گنہگاروں کا ہوتا ہے قلندر۔ پیرو مرشد کا کیا حُلیہ؟

تو پھر تم نے انہیں کیسے پہچان لیا؟

اپنی پیٹھ پر ان کے شفقت بھرے ہاتھ سے، اور کیسے؟ ۔ مَیں روئے جا رہا تھا اور وہ میری پیٹھ پر اپنا ہاتھ پھیرے جا رہے تھے۔

اِدھر آؤ، قلندر، میری پیٹھ پر ویسے ہی ہاتھ پھیرو، جیسے پیرو مرشد نے تمہاری پیٹھ پر پھیرا۔ میں بھی اپنے اندر ہی اندر روئے جا رہا ہوں۔

کیوں روئے جا رہے ہو، قلندر؟

پتہ نہیں، کیوں؟

تو پھر اس وقت تک اپنی ڈھارس آپ ہی بندھاؤ، جب تک سمجھ میں نہ آئے، کیوں رو رہے ہو۔

تم اپنے خواب میں کیوں روئے جا رہے تھے، قلندر؟

اِس لیے روئے جا رہا تھا کہ وہ خوب رُو لڑکا کہاں گیا جس کے بارے میں کئی سال پہلے مجھے گمان تھا، وہ میں ہی ہوں۔

ہہ ہا ۔ ہہ ہہ ہا۔ ! کیا اسی لیے منہ کو اتنا مَل مَل کے دھو رہے تھے؟ ۔ جاؤ، قلندر، پہلے منہ دھو آؤ، ورنہ صابن آنکھوں میں جا چُبھے گا۔

چُبھ چُبھ کر آپ ہی گُھل جائے گا۔ پہلے تم میری بات سنو۔

بات کیا سنوں قلندر؟ کیا تم اس خوبصورت چھوکرے کو ہر رات اپنے ساتھ سُلا کر اپنا بستر گرم کرنا چاہتے ہو؟

ہمارے پاس بستر کہاں، قلندر؟ اپنی مٹی ہی سے جو گرمی پیدا ہو، سو ہو۔

وہ تو پیدا ہوتی رہتی ہے، مگر تم اپنے گمان سے اُسے ٹھنڈا کر دیتے ہو۔ اب اگر وہ خوبرو لڑکا واقعی تم ہی تھے تو وہ گیا کہاں؟ تم تو تم ہی دکھ رہے ہو۔

ہاں، قلندر، مَیں ہوں تو مَیں ہی۔

میں کہتا ہوں منہ دھو آؤ، قلندر۔ تمہاری آنکھوں میں صابن چُبھ رہا ہے۔

چُبھ چُبھ کر آپ ہی گُھل جائے گا۔ تم پہلے اپنی بات پوری کرو۔

تم کہتے ہو قلندر، کہ تم تمہی ہو، مگر ذرا سوچو تم آخر ہو کیا، جو اپنی ذات کو اس طرح اوڑھے ہوئے ہو؟

تم ہی بتاؤ اتنی سردی میں ننگے بدن کیسے رہوں؟

نہیں، قلندر، کل کل بھی تم اپنے اِس آپ کو ویسے ہی بے سود ڈھونڈ ڈھونڈ کر روؤگے جیسے اپنے خواب میں اس خوبرو لڑکے کے لیے رو رہے تھے

ارے، یہی تو پیر و مرشد نے بھی کہا تھا۔ آؤ قلندر، میری پیٹھ پر ویسے ہی ہاتھ پھیرو۔

مگر گمان کے پیٹھ کہاں ہوتی ہے قلندر، جو اس پر ہاتھ پھیرا جا سکے؟

لیکن پیر و مرشد نے تو پھیرا تھا اور ان کے دستِ مبارک کے لمس سے میری مُڑی تُڑی ریڑھ کی ہڈی تن گئی تھی اور میرا رونا تھم گیا تھا۔

سارا رونا یہی ہے کہ رونا تھا رہے، میں بھی اپنے اندر ہی اندر ہر وقت روتا رہتا ہوں۔

ہاں، تم بتا چکے ہو، مگر پانی باہر نہ بہہ نکلے تو مٹی سیراب نہیں ہو پاتی۔

شاید اسی لیے میں سوکھتا جا رہا ہوں۔

ایک بات بتاؤں قلندر، ایک بار کھل کر رو لینے کے بعد میرا جی چاہتا ہے کہ بے سبب ہنسنا شروع کر دوں۔

ہنس لیا کرو، قلندر۔ بے سبب ہنسنا ہی اصل ہنسنا ہوتا ہے۔ اچھا، یہ بتاؤ پیر و مرشد سے کیا تمہاری کوئی بات چیت بھی ہوئی؟

ہاں، جب میرے دم میں دم آیا تو انہوں نے بڑی نرمی سے پوچھا، کہاں پہنچے ہوئے تھے قلندر؟ جب میں نے انہیں بتایا ماضی میں، تو وہ ہنسنے لگے اور بولے، اسی لیے رو رہے ہو؟ جس لڑکے کو تم اپنے ماضی میں ڈھونڈ رہے ہو وہ تمہارے مستقبل میں پہنچا ہوا ہے۔

یہی تو میں تمہیں بتانے جا رہا تھا، قلندر۔ کسی عورت سے محبت کرو اور موقع ملتے ہی اُس کی کوکھ میں داخل ہو کر جاں بحق ہو جاؤ۔

لیکن اگر میں جاں بحق ہو گیا تو اس لڑکے سے کیونکر ملوں گا؟

پھر سے پیدا ہو کر، قلندر۔ کوکھ میں جاؤ گے تو کوکھ سے باہر بھی آؤ گے۔

ہاں، اور باہر آؤں گا تو پھر سے بڑا بھی ہوں گا۔

ہاں، قلندر، بڑے ہو ہو کر تم ہو بہو وہی نکل آؤ گے جسے ڈھونڈنے کے لیے تم ناحق اپنے پیچھے ہو لیتے ہو۔

مگر ہم آگے بھی جاتے ہیں تو گھوم کر پیچھے ہی آ جاتے ہیں۔

یہی تو میں کہہ رہا ہوں قلندر، پیچھے بھی جانا ہو تو ہمیں آگے کا ہی رخ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

تو پھر میں ناچتے ناچتے اپنے دائروں آگے کی جانب ہو لوں؟ شاید کوئی عورت میرا ناچ دیکھ دیکھ کر مجھ پر ریجھ جائے۔

ہاں، مگر پہلے منہ دھو لو، قلندر۔

میں اپنا منہ اسی لیے دھو رہا تھا کہ شاید دُھل دُھل کر اسی لڑکے کا منہ نکل آئے۔

ہہ ہہ — ہا — ! گندگی دُھل جائے قلندر، تو ابھی آنے والی جھریاں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔

ہاں، اب پوری بات میری سمجھ میں آ گئی ہے۔

مگر بات تو ابھی ادھوری ہی ہے۔

تم فکر مت کرو۔ وہ عورت میرے ناچ پر ریجھ ریجھ کر جب مجھے گلے لگائے گی تو میں اسی دم اپنی بات کو پورا کر لوں گا۔

ہاں، اُس کے گلے لگتے ہی اُس کی کوکھ میں اتر جانا، قلندر۔ عورت ذات ہے، کیا پتہ کب اپنا ارادہ بدل لے۔

نہیں، ایک بار میں اس کی کوکھ میں داخل ہو گیا تو پیدا ہوئے بغیر باہر نہیں آؤں گا۔

ہاں، مگر پہلے اپنا منہ دھو آؤ۔

نہیں قلندر، ناچنا ہے تو منہ دھونا کیسا؟

اچھا، جاؤ پھر۔ شاید تمہیں جاتے ہوئے دیکھ کر میرا رونا بھی باہر پھوٹ آئے۔ اپنے اندر ہی اندر روتے ہوئے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔

ہاں، قلندر، کھُل کر رو لو گے تو اوروں کو مشورے دینے کی بجائے اپنے وصل کی تدبیر کرو گے۔

اکرام بریلوی
ایڈمنٹن

اسپتال میں تین روز

اس بڑے سے کمرے میں صرف چار بڈ (BED) تھے۔

ایک پر میں، دوسرے پر ولیم، تیسرے پر جان ریبا بلنسکی صاحب فراش تھے۔ اور چوتھا ہنوز خالی پڑا تھا۔ کمرے کے اندر، موسم خاصا معتدل تھا، مگر باہر کھلے میدان میں برف کی شفاف اور سفید چادر بچھی ہوئی تھی، آسمان پر سفیدی مائل بھورے بادل چھائے ہوئے تھے تناور درختوں کو جھنجھوڑتی ہوئی تیز اور منہ زور ہوائیں چل رہی تھیں سردی کی لہر جسم جلائے دے رہی تھی اور نقطۂ انجماد سے کم و بیش ۳۰ ڈگری نیچے گر چکی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ برف کی سفید اور چمکتی ہوئی تتلیاں اب آئیں کہ اب آئیں!

ہم تینوں میں جان کی عمر سب سے زیادہ تھی، یہی کوئی اَسّی سال کے لگ بھگ ویسے تو جان کا نام عام پولش اور یوکرینی باشندوں کی طرح بڑا لمبا چوڑا سا تھا مگر ہم دونوں اسے جان کہنے پر ہی اکتفا کر رہے تھے جان کے کہنے کے مطابق، اس کے آباؤ اجداد پولینڈ سے نقل مکانی کرکے یوکرین میں آباد ہو گئے تھے، ایک طویل مدت کے بعد، جب یوکرین کی سیاسی فضا اتنی پرآشوب ہوئی کہ سکون اور اطمینان کا سانس لینا دوبھر ہو گیا۔

تو وہ سب کے سب، اپنا گھر بار، مویشی اور زمینیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے، موسم کے شدائد، راستے کی صعوبتوں، مار دھاڑ اور قتل و غارت گری کے ہنگاموں سے جان بچا کر نہ جانے کس طرح، صرف جان ہی کینیڈا پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت جان کی عمر تقریباً بارہ سال ہوگی۔ بچپن ہی سے جان کو زبانیں سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ اُسے اس ننھی سی عمر میں پولش، اور یوکرینی زبانوں پر خاصا عبور حاصل ہو گیا تھا۔ اور وہ بے تکان دونوں زبانیں بولنے لگا تھا۔ کم عمری، تنہائی اور غریب الوطنی نے اسے مختلف پولش اور یوکرینی کنبوں کے ساتھ رہنے اور مشقت کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے شب و روز محنت کی تعلیم حاصل کی، انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھیں، اور سنِ شعور کو پہنچنے پر مقامی یونیورسٹی میں لسانیات کا پروفیسر ہو گیا۔ اب وہ اپنے منصب سے سبکدوش ہو کر تجرّد اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ یوں کہنے کو تو اس کی پانچ اولادیں تھیں۔ مگر بیماری کے وقت میں کوئی بھی اس کے پاس نہ تھا۔

جانؔ کو گردے کی تکلیف تھی وہ سخت کرب کے عالم میں تھا۔ بستر کے ایک طرف آکسیجن کا سلنڈر اسے زندگی کی گرمی اور حرارت پہنچا رہا تھا۔ دوسری طرف اسٹینڈ میں لٹکا ہوا گلوکوز میں ملی ہوئی دواؤں کا تھیلا گرتی ہوئی طاقت کو سہارا دے رہا تھا اور گردے کا زہریلا اور فاسد مادہ پیشاب کے ساتھ رس رس کر پلاسٹک کی پتلی سی نال میں سے گزرتا ہوا بستر کے ایک طرف پڑے ہوئے پاؤچ میں جمع ہو رہا تھا۔ تین دن کی مدت میں ولیم کے پاس، اس کی بیوی، دو چھوٹی بچیاں اور اس کی کمپنی کا افسر بالالتزام پرسش کو آئے۔ میرے پاس میری بیوی، بیٹی اور داماد باقاعدگی سے آتے رہے۔ مگر جان کے پاس کوئی بھی نہیں آیا۔ شاید اسی لئے تمام نرسیں اس کے گرد جمع ہو کر اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہتی تھیں جس سے جان کو یک گونہ آسودگی کا مزہ آ رہا تھا، ویسے بھی وہ اپنی بیماری سے ہراساں نہ تھا۔ وہ عام توانا اور تندرست آدمیوں کی طرح اس عالم میں بھی خاصا خوش باش اور چونچال دکھائی دے رہا تھا۔ اور صبح و شام کی نوک جھونک میں نرسوں سے کسی طرح ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ زندگی سے ہار مان کر مایوس ہو جانا اس کا مسلک نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی تو خود روز بروز بکھرتی جا رہی ہے۔ تمام رشتے ناطے کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو انہیں ٹوٹنا ہی تھا کہ یہ سب رشتے کمزور اور بے بنیاد تھے۔ اس کے خیال میں صرف ایک ہی رشتہ مضبوط اور پائیدار تھا۔ اور وہ مٹی سے انسان کا رشتہ! وہ کہتا تھا کہ مٹی سے ہی انسان کا خمیر اٹھا ہے اور آخر میں مٹی ہی پیار سے، اسے اپنی گود میں بھر لیتی ہے۔

ولیم طبعاً ملنسار آدمی تھا۔ اس کی باتوں میں ایک طرح کی اپنائیت تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کے چہرے کی سرخ و سفید رنگت خلوص کی گرمی سے دمکنے لگتی تھی۔ کچھ اس کا یہ انداز اس قدر پیارا لگا کہ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"آپ کے آباؤ اجداد اس ملک میں کہاں سے آئے تھے۔؟"

"ویلز سے، میں اس وقت بہت چھوٹا سا تھا۔" ولیم چند لمحوں کے لئے رکا اور پھر بولا۔ "اور آپ۔۔۔؟"

"میں تو صرف چار سال سے یہاں ہوں۔" میں نے اس کے نامکمل جملے کا جواب دیا۔

"کہاں سے آئے ہیں۔؟" ولیم نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔

"پاکستان' یعنی کہ ایسٹ ایشیا سے۔" میں نے جواب دیا۔

نہ جانے کیوں' میں نے محسوس کیا' وہ پاکستان کا نام سن کر اچانک خاموش سا ہو گیا۔ میں بجھ سا گیا۔ میری خواہش تھی کہ وہ پاکستان کے بارے میں مجھ سے کچھ پوچھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے پوچھے۔ پاکستان کب اور کیونکر بنا؟ پاکستان کیسا ملک ہے؟ وہاں کے لوگ کیسے ہیں۔؟ کس طرح زندگی گذارتے ہیں؟ دنیا کے دوسرے ملکوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ پاکستان کی آب و ہوا اور موسم کیسے ہیں؟ مگر اس نے تو کچھ بھی نہیں پوچھا اور اپنا چمڑے کا جیکٹ پہنتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد' واپس آیا تو میرے پاس آکر آپ سے آپ کہنے لگا۔

"اس وقت میں جلدی میں تھا۔ میری بیوی وارڈ کے لاونج میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس لئے میں آپ سے آپ کے ملک کے بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکا۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔" میری زبان سے بے ساختہ اتنا ہی ادا ہو سکا۔ اس کے متعلق میرے شبہات از خود ماند پڑنے لگے' ملکی' قومی اور نفسیاتی عصبیتیں ختم ہونے لگیں۔ میں نے اچانک ایک بار پھر محسوس کیا کہ اس کے چہرے کا رنگ خلوص کی گرمی سے دمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنائیت کی البیلی چمک تھی۔ جس سے اس کے چہرے کی جلد نکھر سی گئی تھی۔ میں سوچنے لگا انسان کتنا متعصب اور تنگ نظر ہے ذرا سی بات کا افسانہ بنا لیتا ہے اور پھر بے بنیاد شکوک و شبہات کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر منافرت اور مغائرت کی دیواریں کھڑی کر لیتا ہے۔

یہی شکوک اور شبہات' قومی' ملکی' علاقائی اور لسانی حد بندیوں میں بٹ کر بڑھتے بڑھتے' انفرادی سطح پر فتنہ و فساد اور ملکی و قومی سطح پر جنگ و جدل کی صورت میں رونما ہو کر بھاری بربادیوں کا سامان بن جاتے ہیں اگر انسان صبر سے کام لے اور ایک دوسرے کو ٹھنڈے دل سے سمجھنے کی کوشش کرے تو اختلافات مٹ سکتے ہیں' کشت و خون غارت گیری و بربادی رک سکتی ہے' اور انسان کو دھوئیں کی پھانسی' بارود کی بد بو' اور آگ کے شعلوں کی مرگ آسا لپیٹ سے نجات مل جائے

"کس سوچ میں کھو گئے ہیں آپ؟" ولیم نے میرے چہرے کو غور سے تکتے ہوئے پوچھا۔

"میں! ؟" میری زبان سے صرف اتنا ہی ادا ہو سکا۔

"جی ہاں آپ۔؟" ولیم نے کہا۔

"ارے آپ اس طرح کب تک کھڑے رہیں گے۔ ادھر کرسی پر بیٹھ جائیے۔" میں نے بستر پر لیٹے لیٹے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ولیم بیٹھ گیا تو میں نے اپنی حیرت کا اظہار کئے بغیر پوچھا۔

"دیکھنے میں تو آپ اچھے بھلے لگتے ہیں۔ ایسی کون سی بیماری لاحق ہے جو تین ہفتے سے یہاں پڑے ہیں؟"

"اس سے پہلے ایک ہفتہ کراس کینسر انسٹیٹیوٹ میں رہ چکا ہوں۔ انہوں نے خاصی چھان بین کے بعد یہاں آپریشن کے لئے بھیجا تھا۔" وسیم نے جلدی جلدی کہا۔

"کیا آپریشن کے لئے۔!۔؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

"کیا عارضہ لاحق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سچے۔؟"

"جی ہاں، آپ کو؟" میں نے کہا۔

"ایک ایسی بیماری جسے کینسر (CANCER) کا پیش خیمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔" وسیم نے ماہرانہ لہجے میں کہا۔ لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر بولا: "اور اس کے سدباب کے لئے۔۔۔؟"

"یہ آپریشن ضروری تھا۔" میں نے وسیم کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"جی، ورنہ بلڈ کینسر کا خطرہ تھا۔" وسیم نے آہستہ سے کہا۔

میں پھر سوچنے لگا ——— انسان باہر سے کیا کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اور اندر اندر کتنی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر کی آنکھیں کتنا کچھ دیکھ سکتی ہیں!۔؟ اندر کا حال تو خصوصی معالج ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن بسا اوقات تو وہ بھی سر بگریباں رہ جاتے ہیں۔ اور بظاہر تنا ہوا اور خوش باش دکھائی دینے والا انسان اندر کی انجانی ٹوٹ پھوٹ کی نذر ہو جاتا ہے۔ دنیا کا کیا ہے! وہ تو باہر ہی سے دیکھنے کی عادی ہے۔ کسی کے اندر جھانکنے کی کوشش کون کرتا ہے۔ لوگ سرسری جہاں سے گزر جاتے ہیں۔ کون کس کو دیکھتا ہے سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ اپنی ذات سے باہر نکلنے کی مہلت ملے تو کائنات کا دکھ درد دیکھنے میں آئے ——— اپنی ذات سے باہر نکلنے کی مہلت کیسے ملے اور کیونکر ملے!؟ انسان تو خود اپنے ہی خوابوں کی جلوہ گری میں ایسا ڈوبا ہوا ہے کہ دوسروں کی خود اور فکر کیسے کرے اور کہاں سے کرے۔!؟

"اچھا اب میں چلتا ہوں۔" وسیم نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا

"گھر۔" وسیم نے جواب دیا۔

"اجازت مل گئی کیا۔؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہاں۔ میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔" وسیم کرسی سے اٹھا اپنے بیڈ کی طرف گیا اپنا بیگ اٹھایا اور جان کے بیڈ کے پاس جاکر اسے بائی بائی کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ جان نے وسیم کی بائی بائی کا کوئی جواب

نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور وہ دواپنے اور گداز تکیوں کی ٹیک لگائے بے خبر سو رہا تھا۔ جونہی دتیم کمرے سے باہر نکلا ایک شوخ وشنگ نرس کمرے میں داخل ہو کر جان کے بڈ کی طرف گئی۔ اسے جھک کر دیکھا، پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی

شام ہونے لگی تھی۔ کمرے میں میٹھا میٹھا موسم تھا۔ میری بھی آنکھ لگ گئی اور جب آنکھ کھلی تو جان اپنے بڈ کی پائنتی پر بیٹھا، ایک گونا بیخودی کے عالم میں بڑی نرم آواز میں، ایک گیت گا رہا تھا۔ وہ سوتے سوتے جب بھی اٹھتا تو اس کی زبان پر کوئی نہ کوئی پولش یا یوکرینی زبان کا گیت ہوتا۔ آج بھی وہ یوکرینی زبان میں ایک گیت گا رہا تھا۔ وہی بے خودی کا عالم، آواز میں وہی نرمی اور لوچ۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا مگر گیت کی لے انتہائی دلگیر و درد ناک تھی۔ جب وہ گنگناتے گنگناتے چپ ہو گیا تو میں نے کہا

"ہلو جان، آپ کیسے ہیں۔؟"

جواباً جان نے کچھ اس طرح بات کی جسے غالب کے پیرایہ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے۔ ؎

درد منت کشِ دوا نہ ہوا۔

میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا۔

"جان!"

"ہاں۔" جان نے جواب دیا۔

"کس زبان کا گیت گا رہے تھے آپ؟ میں نے پوچھا

"یوکرینی۔" جان نے جواب دیا۔

"ترجمہ تو خیر ممکن نہیں۔"

"کیوں؟" جان نے پوچھا۔

"ہر زبان کا اپنا ایک علیحدہ مزاج ہوتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ یوکرینی زبان کا انگریزی میں ہوبہو ترجمہ ہو سکے لفظاً بہ لفظاً ترجمہ نہیں تفصیل کے ساتھ گیت کا مفہوم بتا سکیں گے آپ۔؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔" جان نے جواب دیا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بڑا اداس گیت ہے۔" کچھ سوچ کر وہ لمحے بھر کے لئے رکا۔ اور پھر بولا "مجھے اس طرح کے گیتوں میں بڑا مزہ آتا ہے!"

"کیوں؟"

"میں نے بتایا تو آپ ہنس پڑیں گے۔" جان نے کہا۔

"کیوں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"مجھے اداسیوں میں کائنات کی وسعتیں دکھائی دیتی ہیں۔ جان نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"اور اسی لئے آپ کو اداس گیت اچھے لگتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" جان نے فوراً کہا۔

"مگر عجیب بات ہے۔۔۔"

"کیا۔" جان نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

"جب آپ کوئی بھی اداس گیت گاتے ہیں تو آپ کے چہرے پر مکمل سکون ہوتا ہے۔ درد و کرب کے آثار نظر نہیں آتے" میں نے کہا۔

"مجھے اداس گیتوں میں کھوئی ہوئی زندگی کا سراغ مل جاتا ہے!"

جان اب بالکل جامد و ساکت ہو گیا تھا۔ جیسے وہ اپنی تمام گھٹن کا اندر ہی اندر گلا گھونٹنے کی کوشش میں مصروف کار ہو۔۔۔ میں سمجھ تو گیا مگر کسی قسم کا اظہار کئے بغیر میں نے ہی جمود کو توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ نے گیت کا مفہوم تو بتایا ہی نہیں"

"ضرور سنیں گے؟" جان نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے کہا۔ جان نے بھاری اور دلدوز آواز میں کہنا شروع کیا۔

میں سب کچھ اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔

بات اتنی پرانی ہو گئی ہے۔

کہ اچھی طرح یاد بھی نہیں رہی۔

مگر اتنا ضرور یاد آتا ہے۔

کہ میں زمینوں کا مالک تھا۔

میرے ہرے بھرے لہلہاتے کھیت اور کھلیان تھے۔

کھیتی باڑی کے مویشی اور جانور میرا سرمایۂ حیات تھے۔!

میرے کھیت اور کھلیان بھرے رہتے تھے۔

مگر اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں!

میں سب کچھ اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔

ماں، باپ، بہن بھائی کنبے اور قبیلے کے تمام لوگ۔ ۔ ۔ ۔

زمینیں، ہرے بھرے کھیت، کھلیان، مویشی، اور جانور،

دنیاوی رشتے، ناطے۔ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں

اور میں سب کچھ چھوڑ کر، توڑ کر یہاں آگیا ہوں۔

لے دے کے بس ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا ہے ــــ

سب سے سچا اور پکا رشتہ ــــــــــ

مٹی سے انسان کا ازلی اور ابدی رشتہ!

بس وہی اپنے ساتھ لے کر یہاں آگیا ہوں۔

باقی سب کچھ اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔!

جاَن ریا بلسنکی کا سانس پھول چکا تھا۔ اس نے بے سدھ ہو کر دونوں گداز تکیوں کے درمیان اپنا منہ چھپا لیا۔ شاید اُسے اپنے آنسوؤں کی بے حرمتی گوارا نہ تھی۔ ۔ ۔ ۔، میں نے گھبراہٹ میں کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا میدان میں برف کے انبار لگ چکے تھے ــــــ

اور میں، امید و بیم کے صحرا میں کھڑا، جو ہر اندیشہ کی گرمی سے جل رہا تھا۔"

منیر الدین احمد

ہمبرگ ۔ جرمنی

جہنم کے نو ماہ

لیکچر کے دوران یونیورسٹی کی خوبصورت ترین لڑکی میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔ مگر اس میں اتفاق کا ہاتھ نہ تھا۔ میں اسی کی خاطر تو یہ لیکچر سننے آیا تھا ورنہ مجھے تھوماس فان اقوین کی فلاسفی میں کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ اس سبز آنکھوں والی لڑکی کو میں نے صرف ایک روز قبل پہلی بار دیکھا تھا۔ جب وہ دوپہر کے وقت یونیورسٹی منیزا کے باہر لیکچر کے دعوتی کارڈ تقسیم کر رہی تھی۔ اس نے ایک کارڈ مجھے بھی دیا تھا۔ جس پر میں نے کہا تھا کہ اگر اس سے ملاقات کی یہی ایک صورت ہے تو میں ضرور آؤں گا۔ اس پر اس نے مسکرا کے کہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ والی کرسی میرے لیے خالی رکھے گی۔

جب ہم لیکچر کے بعد باہر نکلے تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ دروازے پر ہوا کے ایک سرد جھونکے نے ہمارا استقبال کیا۔ دن بھر دھوپ نکل رہی تھی۔ اس لیے میں بغیر اوورکوٹ کے تھا۔ اکتوبر کے مہینے میں شمالی جرمنی میں ٹھنڈ ہو جایا کرتی ہے البتہ دھوپ نکل آئے تو دن کے وقت موسم خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔ بریگیٹے کے فر کے اوورکوٹ کو دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی تھی۔ میں نے کہا "اتنی سردی تو ابھی سائبیریا میں بھی نہیں پڑی کہ فر کا اوورکوٹ پہنا جا سکے"

اس پر بریگیٹے نے جواب دیا "باہر کی ٹھنڈ کی مجھے پرواہ نہیں میں تو اندر کی سردی سے بچنے کیلئے اوورکوٹ پہنتی ہوں۔" میں نے کہا "اندرونی سردی کا علاج فرکاکوٹ نہیں بلکہ سکاچ وہسکی ہے۔ تمہیں اندر سے گرم کرنا پڑے گا۔"

میں خوش تھا کہ اسے بار میں لے جانے کا بہانہ پیدا ہوگیا۔ بریگیٹے نے بھی فوراً حامی بھر لی۔ اور ہم ایک قریبی بار میں جا بیٹھے۔ مگر وہسکی سے اسے دلچسپی نہ تھی البتہ سفید وائن پینے کا شوق تھا اس نے موزیل کا انتخاب کیا۔ کہنے لگی "اگر تم سگریٹ پیتے ہو تو میں بھی پیوں گی ورنہ اکیلے پینے میں مجھے مزا نہیں آتا۔" اس کی خاطر میں نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔ مگر ان چیزوں سے زیادہ میں قدرت کے اس نادر نمونے کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ نازک ترین ہاتھ تھے جو میں نے آج تک کبھی تھامے ہیں۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں دبانے سے کانچ کی طرح ٹوٹ نہ جائیں۔ اس کی انگلیاں لمبی تھیں اور ہاتھ کی جلد بے حد ملائم۔

دوسری ہر چیز سے زیادہ مجھے اس کی آنکھوں نے مسحور کر رکھا تھا۔ نیلی، کالی، بھوری، آنکھیں تو ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس لیے میں اکثر بھول جایا کرتا ہوں کہ میرے دوستوں کی آنکھوں کا رنگ کیا ہے۔ مگر بریگیٹے کی آنکھوں کا سبز رنگ ایک غیر معمولی گہرائی کا حامل تھا۔ وہ ایسی شفاف تھیں جیسے آڈریاٹک کے ساحل پر سمندر کا پانی جس کی تہہ میں پڑی ہوئی کنکریاں تک صاف نظر آتی ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں کہہ بیٹھا۔

"بریگیٹے تمہاری آنکھیں اس قدر شفاف ہیں کہ میں تمہاری روح کی گہرائیوں تک دیکھ سکتا ہوں۔"

وہ یہ سن کر ہنس پڑی۔ کہنے لگی "میری آنکھیں دھوکے کی ٹٹی ہیں میری روح کی گہرائیوں تک پہنچنے کے لیے تمہیں اس میں غوطہ لگانا پڑے گا۔ یوں ساحل پہ کھڑے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کے علاوہ میں بتا چکی ہوں کہ میری روح منجمد ہے، برف کی طرح یخ۔ اس میں غوطہ لگانے سے قبل تمہیں اسے پگھلانا ہوگا۔"

ہم آدھی رات تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بریگیٹے کا پہلا سمسٹر تھا۔ اس کا باپ جنگ کے آخری دنوں میں مارا گیا تھا۔ جب کہ بریگیٹے کی عمر بمشکل چھ برس تھی اس کی ماں نے اسے اور اس کی چھوٹی بہنوں کو وظیفے پر پالا تھا۔ البتہ اب کئی سالوں سے ایک فیکٹری میں بطور سیکرٹری کام کر رہی تھی۔ بریگیٹے نے میڈیکل میں داخلہ لیا تھا۔ مگر اس کی ماں کو اصرار تھا کہ نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرے۔ اوّل تو یہ کہ اس کا کورس مختصر ہے۔ دوسرے اسے پورا پورا یقین تھا کہ بریگیٹے بہت جلد شادی کرے گی۔ اس طرح اس کی

تعلیم نامکمل رہ جائے گی۔ مگر بریگیٹ نے اس مشورے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہنے لگی " ماں سے میری نہیں بنتی وہ میری ہر بات کی مخالفت کرتی ہے ہمارے درمیان جیسے ایک دیوار حائل ہے۔ اس کے برعکس میرے تعلقات چھوٹی بہنوں کلارین اور ایلکے کے ساتھ بہت گہرے ہیں، دونوں میری ہر بات کی نقل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو کچھ میں کروں وہ بھی کریں گی اور جس چیز کو میں پسند کروں وہ بھی اسے ہر دوسری چیز پر ترجیح دیں گی۔ مگر بجائے اس کے کہ ماں اس بات سے خوش ہو اسے الٹا لگا ہے کہ میری بہنیں مجھے اس پر ترجیح دیتی ہیں۔ ماں مجھ میں اپنی بیٹی نہیں دیکھتی بلکہ مجھے اپنا مدمقابل سمجھتی ہے "۔

" تم جیسی خوبصورت بیٹی تو ہر ماں کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ ممکن ہے تم خوبصورتی میں اپنی ماں کو مات کرتی ہو" میں نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ بریگیٹ ہنس دی اور کہنے لگی " نہیں یہ بات نہیں۔ اس کی تفصیل تمہیں پھر کبھی بتاؤں گی۔ میری ماں اتنی سادہ نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو"

چونکہ آخری ٹرام کے چھوٹنے کا وقت ہو رہا تھا اس لیے ہمیں اپنی گفتگو کسی دوسری محفل کے لیے ملتوی کرنا پڑی۔ مجھے اصرار تھا کہ ہم دوسرے ہی روز ملیں۔ مجھے صرف ایک لیکچر میں جانا تھا جو دوپہر کو ختم ہو جاتا تھا مگر بریگیٹ دوپہر کے کھانے پر ایک سہیلی کے ہاں مدعو تھی۔ اس لیے تیسرے پہر کافی کے وقت مینزا میں ملنے کا پروگرام بنا۔

میں ساڑھے تین بجے کافی ٹیریا میں پہنچ گیا اور بریگیٹ کے آنے کے انتظار میں فرانسیسی کا سبق دہراتا رہا۔ بریگیٹ اپنی سہیلی انے ماریکے کے ساتھ خاصی دیر سے پہنچی۔ انے ماری کو میں نے اب تک دور دور سے ہی دیکھا تھا وہ خوبصورتی میں بریگیٹ کی ہم پلہ تو نہ تھی مگر اس کی چال میں ایک خاص ادا تھی۔ وہ چلتی تو گمان ہوتا کہ رقص کر رہی ہے اس کا باتیں کرنے کا انداز منفرد تھا۔ فقرے چست کرنے میں مہارت رکھتی تھی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی " تمہیں تو سٹوڈنٹس پارلیمنٹ کے انتخابات کے دنوں سے جانتی ہوں۔ تمہاری تصویر اور پروگرام مجھے بے حد پسند آئے تھے اور میں نے تمہیں ووٹ بھی دیا تھا کئی دنوں تک تمہیں ڈھونڈتی پھری تھی آخر ایک روز تم مینزا میں نظر آ گئے مگر تم سے بات کرنے سے میں جھجکتی رہی۔ آخر کہتی بھی کیا۔ بلو تمہاری تصویر مجھے پسند آئی ہے "۔

" مجھ سے کسی نے پوچھا تھا کہ تم لوگ یونیورسٹی میں ایک دوسرے سے بات چیت کیوں کر شروع کرتے ہو، اس پر میں نے مزاحاً کہا تھا جس سے بات کرنی مطلوب ہوتی ہے اس کے پاؤں پر پاؤں دھرتے ہیں یا اسے دھکا دے مارتے ہیں۔ اور معذرت کرتے ہیں۔ دوسرے روز اس کو سلام کرتے ہیں۔ تیسرے روز کافی کی دعوت دیتے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے تم انگریزوں کی طرح انتظار کرتی ہو۔ اس وقت کا جب کوئی تمہارا تعارف مطلوبہ شخص سے کروا دے "۔

"نہیں یہ درست نہیں۔ تمہارا نام، پتہ اور فیملی وغیرہ کا تو مجھے علم ہو چکا تھا۔ صرف اس غیر مرئی برف کے ٹوٹنے کا انتظار تھا جو انسانوں کے درمیان معلق ہے۔ برگیٹے نے اس یخ کو توڑنے میں میری مدد کی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا کہ برف ٹوٹ گئی ورنہ خدا جانے ہماری روحیں کب تک ٹھٹھرتی رہتیں۔"

اس عرصے میں برگیٹے ہم سب کے لیے کافی لے آئی تھی۔ انے ماری کا ایک واقف کار بھی آ نکلا جس کے ہمراہ اس کا پروگرام اس شام سینما میں جانے کا تھا۔ میں تو برگیٹے کے ساتھ باتیں کرنی چاہتا تھا اس لیے ہم دونوں نے ساتھ چلنے سے معذرت کر دی۔ دن بھر دھوپ نکلنے کی وجہ سے سردی کچھ ایسی نہ تھی میں نے تجویز پیش کی آلسٹر جھیل کے کنارے سیر کے لیے جانے کی۔ برگیٹے نے بتایا کہ وہ بھی میری طرح پیدل چلنے کا شوق رکھتی تھی۔ خود کار گاڑیوں کے اس دور میں پیدل چلنا بھی اب محض شوقی مشغلہ بن کر رہ گیا ہے۔

آلسٹر کے کنارے چلتے ہوئے میں نے برگیٹے کو پہلی بار بوسہ دیا۔ کہنے لگی" سکاچ وہسکی کی بجائے اندرونی ٹھنڈ کو دور کرنے کا یہ زیادہ موثر طریق ہے۔"

"مگر تمہارے سرد ہاتھوں کو میں شاید ہی گرم کر پاؤں۔ ہاتھ کیا ہیں تم تو برف کی ڈلیاں اٹھائے پھرتی ہو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا مگر اس کا ہاتھ گرم کیا ہوتا خود میرا ہاتھ ٹھٹھرنے لگا تھا۔

برگیٹے نے پھر سے اپنی ماں کی باتیں شروع کر دیں۔ اس کی ماں چالیس کے پیٹے میں تھی۔ اس نے دوبارہ شادی نہ کی تھی۔ البتہ ہمیشہ کسی نہ کسی مرد کے ساتھ منسلک رہی تھی۔ برگیٹے کو اس پر اعتراض تھا کیونکہ اکثر مرد جو اس کی ماں کے ساتھ گھر آیا کرتے تھے یا وہ اس لوریا لبستر ڈال لیا کرتے تھے بیکار اور نکھٹو قسم کی غلیظ مخلوق سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ انجینئر تھا اور برگیٹے کی نظر میں دنیا بھر کا سب سے زیادہ محبت کرنے والا انسان تھا۔ اسے موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا پیانو بجانے میں مہارت رکھتا تھا اس نے برگیٹے کے لیے پیانو سکھانے والی استانی مقرر کر رکھی تھی۔ اپنے آخری خط میں اس نے تاکید کی تھی کہ برگیٹے پیانو کی مشق میں سستی نہ کرے۔ اس کا خط پہنچنے سے اگلے روز ان کا گھر بمباری کی نذر ہو گیا تھا عین وہ کمرہ جس میں پیانو رکھا تھا تباہ ہو گیا تھا۔ البتہ ان کے مکان کے دو کمرے، باورچی خانہ اور گیلری صحیح وسالم بچ گئے تھے۔ چونکہ سیڑھیاں بھی خطرے سے باہر تھیں۔ اس لیے انہیں اس مکان میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی مگر جلد بعد انہیں ایک کمرہ ایک اور خاندان کو دینا پڑا تھا۔ جن کا پورا مکان بمباری کے سبب تباہ ہو گیا تھا۔ اس خاندان کے بھی تین بچے تھے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ان کا باپ جنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔ گولی اس کے پھیپھڑے کو چھلنی کرتی ہوئی دوسری طرف پار ہو گئی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ

بھی کاٹنی پڑی تھی۔ اب وہ سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا۔ کبھی کبھار بیساکھی پکڑ کے ڈاک خانے میں جا بیٹھتا۔ سردیوں میں بھی ایک جگہ ایسی تھی جہاں ہیٹنگ کی جاتی تھی۔ وہاں پر بڑھے پنشنر اور جنگ میں زخمی ہونے والے گھنٹوں تک بیٹھے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی کی آنکھ پھوٹی ہوتی تھی تو کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی۔ انہیں میں لمبی لمبی بڑی مونچھوں والا خوفناک قسم کا ایک شخص بھی تھا جو اس کی ماں کو اکثر گھیر لیا کرتا تھا اور اتنی باتیں کرتا تھا کہ بچے کھڑے کھڑے تھک جایا کرتے تھے۔ اور رونا شروع کر دیتے تھے۔ ایک روز وہ ان کے گھر بھی آن نکلا تھا اور جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ تینوں بہنیں تھک کے سو گئی تھیں اگلی صبح جب وہ بیدار ہوئیں تو مونچھوں والا ان کی ماں کے بستر میں لیٹا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے وہیں ڈیرہ جما لیا تھا۔ اگر برگیٹے یا اس کی بہنیں کبھی شور مچاتیں تو وہ بڑی کرخت آواز سے انہیں دھمکایا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے ان کی ماں کو پیٹا بھی تھا۔ اس پر برگیٹے کی ماں نے الماری میں سے اس کا بوسیدہ سوٹ اور بوٹوں کا جوڑا نکال کے سیڑھیوں پر پھینک دیا تھا اور کہا تھا کہ دفع ہو جائے۔ اس دن کے بعد وہ نہیں لوٹا۔

"میں تھی تو چھوٹی سی مگر مجھے یہ احساس تھا کہ ہمارا باپ تو دشمنوں سے لڑنے گیا ہوا ہے اور ہماری ماں دوسرے مردوں کے ساتھ دوستیاں کرنے میں مصروف تھی۔ مجھے اور میری بہنوں کو اس وقت علم نہ تھا کہ ہمارا باپ کب کا روس کے محاذ پر ایک گولی کا نشانہ بن چکا تھا۔ ہمیں کسی نے بتایا ہی نہ تھا ہمیں صرف حیرت ہوا کرتی تھی کہ باپ کے خط آنے بند ہو گئے تھے۔ بمبار جہاز بھی اب ہمارے شہر پر نہ گرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بمباری کا الارم ہونے پر ہم بڑے شوق سے تہہ خانہ میں جایا کرتے تھے جہاں سب لوگ سکڑ کے بیٹھتے تھے ہماری ماں ہم تینوں بہنوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑے رکھتی تھی۔ بعض اوقات تو ہم وہیں سو بھی جایا کرتی تھیں۔ میں ہمیشہ اپنی گڑیا کو جس کا نام ہم نے "الزبے گرڈیا" رکھا ہوا تھا اپنے ساتھ اٹھائے پھرتی تھی۔ اسے آخری بموں کا نشانہ بنتے تو نہ دیکھ سکتی تھی ایک روز نیچے جاتے ہوئے بھاگم دوڑ میں وہ کہیں راستے میں گر گئی۔ میں نے اسے بہتیرا تلاش کیا مگر وہ مجھے نہ مل سکی۔ میں کئی روز تک روتی رہی تھی، کھانا تک کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ہمارے پاس ایک پریم تھی جس میں اب ہم "الزبے گرڈیا" کی جگہ ایلکے کو، جو ابھی بے بی تھی، ڈال کے گیلری میں ادھر سے ادھر سیر کروایا کرتی تھیں۔ ماں نے ایک روز دس سیر سیبوں کے عوض وہ پریم ایک زمیندار کو دے دی تھی کیونکہ جنگ کے معاً بعد ہمیں پھل کھانے کو بالکل نہ ملتے تھے، مگر ہمیں پریم کے جانے کا اس قدر صدمہ تھا کہ نہ میں نے اور نہ ہی میری بہن کارین نے وہ سیب کھائے، ہم بے حد روئیں تھیں۔ میں نے اپنی ماں کو اس پریم کا بیچنا اب تک معاف نہیں کیا۔"

ایکا ایکی بارش کے قطرے گرنے لگے یوں بھی ہم چلتے چلتے بہت دور نکل آئے تھے۔ اس لیے انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کا رخ لیا۔ میں نے بریگیٹے کو اپنے ساتھ ہوسٹل چلنے کی دعوت دی۔ اسے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہ تھا ہوسٹل میں پہنچ کے میں نے شام کا کھانا تیار کیا۔ اس دوران بریگیٹے نے میرے ٹیپوں سے مکیش کی ایک ٹیپ نکال کے لگا دی ہندوستانی گانے اس نے لندن میں سنے تھے ایک دو ہندوستانی فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ اسے گانے پسند آئے تھے۔ مگر فلموں کو نہ سمجھ پائی تھی۔ بنگالی ریستوران میں کھانا بھی کھایا تھا۔ مگر مرچوں نے برا حال کر دیا تھا۔ ہندوستانیوں کے انگریزی تلفظ کی نقلیں اتارتی رہی۔

اس رات بریگیٹے میرے کمرے میں ہی سوئی۔ اس کے ہونٹوں میں شہد بھرا ہوا تھا۔ اس کی چھاتیاں ملائی کی طرح ملائم تھیں میں نے پہلی بار اتنی خوبصورت جسم کو برہنہ دیکھا تھا۔ ہمارے ہوسٹل کے بستر کچھ ایسے کشادہ نہ تھے جس کے سبب طالب علموں نے انہیں "اخلاقی بستر" کا نام دے رکھا تھا۔ بریگیٹے میری طرح اکہرے بدن کی تھی اس لیے ہمیں اس بستر پر رات گزارنے میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ دراصل یہ رات ہم نے جاگ کے گزاری۔ بریگیٹے کے لیے ایک مرد کے ساتھ پوری رات بسر کرنے کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ پہلی بار وہ سترہ برس کی عمر میں جنوبی فرانس کے ساحل پر ریت میں ایک دوست کے ساتھ سوئی تھی۔ یہ کہتے کہتے وہ اچھل کے بیٹھ گئی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"وہ پہلی بار نہ تھی۔ البتہ اپنی مرضی سے میں پہلی بار فرانس میں میٹائیلی کے ساتھ سوئی ہوں۔ دراصل میں بارہ برس کی عمر میں ماں کے ایک دوست کی ہوس کا شکار بنی تھی۔ اس نے مجھے دھمکایا تھا کہ ماں کو نہ بتانا ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ مگر خون بند ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس قدر درد ہو رہی تھی کہ میری برداشت سے باہر تھا۔ جب ماں گھر آئی تو اس کا دوست جا چکا تھا۔ ماں نے مجھے اس حالت میں دیکھا تو غصے سے پاگل سی ہو گئی تھی۔ مجھے گلے سے لگا کر روتی رہی۔ یہ پہلا اور آخری موقعہ تھا کہ میں نے ماں کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے ہمیں کبھی اپنے کسی دوست کے ساتھ اکیلے گھر پر نہیں چھوڑا۔"

"اس قسم کے واقعات کے نتیجے میں اکثر گہری نفسیاتی الجھنیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں"، میں نے اپنی معلومات کا رعب جمانے کے لیے کہا۔

"میری اندرونی سردی اگر نفسیاتی الجھن نہیں تو آخر کیا ہے؟"

"تمہیں علم نفسیات کے کسی ماہر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے تم محض وہم کا شکار ہو۔"

"اگر تمہاری روح کی گہرائیوں میں دھیرے دھیرے سردی جڑ پکڑتی جائے اور تم دوستی کے قابل نہ رہو پیار اور لگن کے الفاظ تمہارے لیے اجنبی بن جائیں تمہیں اپنوں سے نفرت ہونے لگے اور اجنبیوں سے ڈر

گھنے لگے تو اس کو وہم نہیں کہا کرتے۔ میں اپنی حد تک ان خیالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر میرے دل میں یہ خدشہ پتھر کی لکیر کی طرح گھر کر چکا ہے کہ شکست میری تقدیر ہے تم میری تنہائی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں مردوں کے ساتھ سوتی ضرور ہوں مگر میرے دل میں کوئی حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ مجھے آج تک کبھی جنسی تسکین نہیں مل سکی۔ شاید میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ کسی سے محبت کر سکوں۔"

"مگر تمہاری باتوں سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تمہارا تعلق اپنی بہنوں کے ساتھ بہت گہرا ہے اسی طرح تم اپنے والد کا ذکر بہت پیار سے کرتی ہو۔ اگر اسے محبت نہیں کہتے تو کیا کہتے ہیں؟"

"میں اپنی بہنوں کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہوں۔ شاید اس لیے کہ وہ مجھ سے چھوٹی ہیں میری خواہش ہے کہ انہیں خوش و خرم دیکھوں۔ میری ماں نے ایک کتیا پال رکھی ہے جس کا نام سوزی ہے میں نہیں چاہتی کہ وہ مثلاً کار کے نیچے آئے یا کوئی جانور اسے پھاڑ کھائے۔ اس سے تم دیکھو کہ بہنوں اور سوزی کے بارے میں میرے دل میں خیر خواہی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں مگر محبت کی تعریف اس سے مختلف ہے۔"

"کیا تم رومیو اور جولیا والی محبت کی تلاش میں ہو؟ ایسی لافانی محبت صرف ادبی شاہکاروں میں جنم لیا کرتی ہے۔ وقت آنے پر تمہارا مجنوں بھی تمہیں ڈھونڈ نکالے گا۔"

مجھ جیسی عورت سے محبت کرنے والا یقیناً کوئی سرپھرا ہی ہوگا۔ مگر تمہاری بات درست ہے میرے دل کی گہرائیوں میں یہ خواہش ضرور موجود ہے کہ لوگ مجھ سے محبت کریں۔ میرے حسن کے مداح ہوں، میری تعریفیں کریں۔ میرے ناز نخرے برداشت کریں، مگر میرے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میری محبت کے سوتے سوکھ چکے ہیں۔ میں نفرت تو کر سکتی ہوں مگر محبت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے خود احساس ہے اپنی خود غرضی کا، میں دنیا بھر سے مطالبہ کرتی ہوں، خود کو چاہنے کا مگر اس کا بدل دینے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ میری ساری زندگی بناوٹ کا مجسمہ ہے۔ میں میک اپ کرتی ہوں کیونکہ سب عورتیں کرتی ہیں مگر مجھے اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ سگریٹ پیتی ہوں اگرچہ مجھے مزا نہیں آتا۔"

"تمہاری باتیں سن کے مجھے تم پہ ترس آنے لگا ہے نہیں، خوف لگنے لگا ہے۔ کیا تم لاشعوری طور پہ چاہتی ہو کہ لوگ تم سے نفرت کریں؟"

"کیا تم اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ میرا کوئی دلی دوست نہیں ہے۔ کوئی رازدار سہیلی نہیں ہے میری ماں اور بہنیں میری قلبی کیفیت سے ناآشنا ہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت آتی ہے کہ میں نے تم سے اپنے زنا بالجبر کا شکار بننے کا ذکر کیونکر کیا ہے جسے میری ماں کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تم سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ڈر نہیں لگتا بلکہ سکون ملتا ہے۔"

"چلو اچھا ہوا کہ تم میرے سینے پڑھ گئی ہو۔ تمہیں ماہر نفسیات کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہی تمہارے پیسے بچیں گے۔ تم جب چاہو میرے پاس مشورے اور علاج کے لیے آسکتی ہو۔"

اس روز کے بعد ہم نے باقاعدگی سے ملنا شروع کر دیا۔ برگیٹے ٹینس کلب کی رکن تھی۔ مجھے بھی اسی کی وساطت سے وہاں داخلہ مل گیا۔ ہفتے میں دو بار ہم کھیلنے جانے لگے ہر تیسرے چوتھے روز سینما یا تھیٹر میں جاتے ہفتے کی رات اکثر ڈانس کا پروگرام بنتا۔ میرے دوستوں میں بھی برگیٹے بہت مقبول ہو گئی۔ اس کی خوبصورتی پر جہاں مجھے ناز تھا وہاں مجھے پسند نہ تھا کہ ہم جدھر جائیں لوگ ہماری طرف نظریں اٹھا کے دیکھیں۔ مگر برگیٹے اس چیز کی عادی ہو چکی تھی وہ بھرے مجمع میں یوں چلتی جیسے اس کے سوا وہاں کوئی اور موجود ہی نہیں۔ میری عادت ہے کہ کسی مجلس میں جاؤں تو چپکے سے کسی پچھلی سیٹ پر بیٹھتا ہوں۔ اس کے برعکس برگیٹے پہلی قطار میں بیٹھنے پر اصرار کرتی۔ جیسے یہ اس کا پیدائشی حق ہو۔ میں لباس کے بارے میں بہت محتاط ہوں۔ شوخ رنگ مجھے پسند نہیں البتہ کپڑے کی کوالٹی کا دھیان رکھتا ہوں۔ برگیٹے کوالٹی سے زیادہ رنگوں پر جاتی تھی۔ وہ سستے سے سستے کپڑوں میں بھی پری لگتی تھی۔ اسے ہر رنگ سجتا تھا۔ مگر سرخ رنگ پر جان دیتی تھی۔

شمالی یورپ میں سردیوں کی راتیں لمبی اور دن بہت مختصر ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار کیلئے منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں۔ اور جب شام کو لوٹتے ہیں تو رات پڑ چکی ہوتی ہے دن کے وقت بھی روشنی مدھم ہوتی ہے۔ اکثر بادل چھائے رہتے ہیں سردیوں کے مہینے گویا مستقل سوگ کا رنگ رکھتے ہیں بیشتر لوگ سردیوں میں کالے یا گہرے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں یہی وجہ ہے کہ سڑکوں پر ٹریفک کے ایسے حادثات جن کا شکار پیدل چلنے والے ہوتے ہیں عموماً سردیوں میں زیادہ ہوتے ہیں روشنی کم ہونے کے سبب ڈرائیور کالے کپڑے پہننے والوں کو نہیں دیکھ پاتے۔ ان مہینوں میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں بھی معتدبہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس ماحول کا مقابلہ کرنے کے لیے سردیوں میں ڈانس کے مقابلے ہوتے ہیں۔ کارنیوال منایا جاتا ہے قیمتی شو ہوتا ہے گویا دن کی جگہ رات لے لیتی ہے۔ بجلی کی روشنی میں یورپ رنگ رلیاں مناتا ہے ایک ایسی ہی رات میں خوبصورتی کی ملکہ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ ہماری محفل میں کسی نے ایک روز یہ تجویز پیش کردی کہ برگیٹے کو اس انتخاب میں حصہ لینا چاہیئے پہلے تو اس نے اس مخرے پن میں اپنا گوشت پوست نمائش کے لیے پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر دوستوں کے اصرار پر اس نے شمولیت کی حامی بھرلی۔

مقابلے کے روز برگیٹے سمیت بیس دوشیزائیں سٹیج پر نمودار ہوئیں۔ جن میں سے ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ مجھے پھر بھی برگیٹے ہی سب سے زیادہ بھاتی تھی۔ مگر میں تماشائی تھا نہ کہ جج انے ماری

کو یقین تھا کہ برگیٹے جیت جائے گی۔ انعام میں ملنے والے پانچ ہزار مارک کا مصرف بھی اس نے ڈھونڈ لیا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ ہمارا ٹولہ اس رقم سے سکیٹنگ کے لیے سوئٹزر لینڈ جائے گا۔ ہر کوئی نصف نصف رقم اپنی جیب سے دے گا۔ اوّل تو مجھے اعتبار نہیں تھا کہ پانچ ہزار کی رقم اس مقصد کے لیے کافی ہوگی دوسرے برگیٹے کے فرشتوں کو بھی اس تجویز کی اطلاع نہ تھی خدا جانے وہ خود اس رقم کے مصرف کے بارے میں کیا خیالات رکھتی تھی۔ ہم انہی جھگڑوں میں مصروف تھے کہ مقابلے کا اعلان کیا گیا۔ برگیٹے نے سچ مچ مقابلہ جیت لیا۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم اسے مبارک باد دے سکتے۔ منتظمین اسے پچھلے دروازے سے نکال کر لے گئے

برگیٹے کئی روز تک غائب رہی۔ اخباروں میں البتہ اس کی تصویریں دیکھنے میں آتی رہیں۔ پتہ چلا کہ سٹاکنگ کا ایک کارخانہ دار جس کے خرچ پر خوبصورتی کی ملکہ کے انتخاب کی محفل منعقد ہوئی تھی اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا اس نے برگیٹے کو بطور فوٹو ماڈل کام کرنے کی پیشکش کی اور اس سے معاہدے پر دستخط بھی کروا لیے۔ ان تفصیلات کا علم ان ماری کو برگیٹے کی بہن کارین کے ذریعہ ہوا۔ جو انہی دنوں ہمارے شہر میں منتقل ہوئی تھی۔ اس کی زبانی برگیٹے نے مجھے سلام بھجوایا تھا اور جلد ملنے کے لیے آنے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک روز یونیورسٹی سے لوٹا تو ہوسٹل کے سامنے ایک مرسیڈیز کار کھڑی تھی جس میں برگیٹے بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ کہنے لگی "میرے پاس وقت تھوڑا ہے۔ صرف خدا حافظ کہنے آئی ہوں۔ مس جرمنی کے انتخاب میں حصہ لینے نیورمبرگ جانا ہے۔ اگر وہاں جیت گئی تو مس ورلڈ کے مقابلے میں شرکت کا ارادہ ہے"

برگیٹے کے پاؤں زمین پر لگتے ہی نہ تھے۔ اس نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا تھا اور کارخانہ دار کے بنگلے میں منتقل ہو گئی تھی۔ بطور فوٹو ماڈل اس نے ایک لاکھ مارک کا معاہدہ کر لیا تھا۔ جس کی میعاد ایک برس تھی۔ وہ اس اچانک کامیابی پر بے حد خوش تھی اور پڑھائی جاری رکھنے کا خیال دماغ سے نکال چکی تھی۔

وہ زیادہ دیر تک نہ بیٹھی اس نے خط لکھنے کا وعدہ کیا مگر اس روز کے بعد ہم اس کی خبریں اخباروں میں پڑھتے رہے۔ اس نے مس جرمنی کا مقابلہ جیتا اور فلوریڈا میں مس ورلڈ کے مقابلے میں شریک ہوئی۔ اس مقابلے کی فلم ہم نے ٹیلیویژن میں دیکھی۔ یہ ٹائیٹل بھی اس کے حصے میں آیا۔ اس کی تصویریں اور انٹرویو دنیا بھر کے اخباروں میں چھپے۔ اس کے بطور فوٹو ماڈل کام کرنے کی خبریں دیکھنے میں آئیں۔ ایک آدھ فلم پروڈیوسر نے بھی اس کو فلموں کے لیے لینے پر آمادگی ظاہر کی۔ برگیٹے دیکھتے دیکھتے جیٹ سیٹ کا جزو بن گئی۔ اخباروں کا کہنا تھا کہ اسے فی دن دس ہزار ڈالر معاوضہ ملتا تھا۔ نیویارک میں وہ والڈورف اسٹوریا ہوٹل میں اترتی تھی۔ پلے بوائز کے ساتھ وہ کبھی ریویرا میں ہوتی تھی تو کبھی طنجہ میں۔

اس واقعہ کے دو سال بعد میری ملاقات اسنے ماری کی برتھ ڈے پارٹی میں کارین سے ہوئی۔ وہ ابھی تک ہیمبرگ میں ہی مقیم تھی۔ کبھی کبھار اسے بریگیٹے کا خط یا ٹیلیفون آجایا کرتا تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ بریگیٹے نے نیوارک جانے کے جلد بعد کارخانہ دار سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ ایک دو بار وہ جرمنی سے بھی ہو گئی تھی مگر برمین سے ہی لوٹ گئی تھی جہاں اس کی ماں اور چھوٹی بہن ایلکے مقیم تھیں۔ کارین کو میرے اور بریگیٹے کے تعلقات کا علم تھا۔ اور عرصے سے مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتی تھی۔ پارٹی کے دوران وہ سارا وقت میرے پہلو سے نہ سرکی۔

جب ہم نے اسنے ماری سے رخصت لی تو رات کافی بھیگ چکی تھی۔ میں نے کارین کو اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے کی پیش کش کی۔ جب کار اس کے مکان کے سامنے رکی تو کارین نے مجھے کافی کی ایک پیالی اپنے ہاں پینے کی دعوت دی۔ اس کے پاس ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں ہر چیز بڑے سلیقے سے سجائی گئی تھی فرنیچر بے حد مہنگا اور خوبصورت تھا۔

"کارین،" میں نے کہا "تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم بریگیٹے پر رشک کرتی ہو مگر تمہیں اس بات کا بھی علم ہے کہ اس کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو قطعاً قابل رشک نہیں ہے بریگیٹے اندر سے بے حد دکھی ہے۔"

"مجھے اس دکھ کی وجہ سمجھ نہیں آتی" کارین نے جواب دیا۔ "وہ ہمیشہ سے اپنے آپ سے، ماں سے اور ہم بہنوں سے نالاں ہے، خدا جانے کیوں؟"

"تم سے اور ایلکے سے میرے علم کے مطابق اسے کوئی شکایت نہیں ہے مگر تمہاری ماں کا نام آتے ہی جیسے اسے بچھو کاٹ جاتا ہے اس کی وجہ البتہ وہ مجھے نہیں بتا سکی۔ ہم نے اس موضوع پہ دنوں بحثیں کی ہیں مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔"

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی ماں کو دیکھا ہو کہ اس نے بریگیٹے کو پیار سے بازوؤں میں لیا یا چوما ہو۔ بریگیٹے یوں بھی جسمانی رابطے سے بے حد کتراتی تھی۔ اگر ہم سے کوئی غلطی سے بھی اسے چھو جاتا تھا تو وہ چلا اٹھتی تھی۔ ہم بہنوں کے بال خود ماں کاٹا اور سنوارا کرتی تھی۔ مگر بریگیٹے نے اسے کبھی اپنے بالوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔"

"خود میرا مشاہدہ بھی ایسا ہی ہے کہ بریگیٹے کا بوسہ لینا آسان کام نہیں۔ اگرچہ مجھے علم ہے کہ اس کی روح محبت کی پیاسی ہے۔"

"مگر اس محبت کا تقاضا وہ دوسروں سے کرتی ہے۔ ہمیشہ دوسروں سے بات بات پر ضد کرنا

اس کا خاصہ تھا۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی ہر فرمائش پوری کی جائے۔ اس کی بعض باتیں میری سمجھ سے بالا ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً ایک دفعہ ہم لوگو سلاویہ تعطیلات منانے گئے۔ ہمیں تیرنا آتا تھا مگر اس وقت تک صرف تالاب میں تیرنے کی مشق تھی۔ وہ پہلی بار تھی کہ ہم سمندر کی لہروں سے آشنا ہوئی تھیں برگیجے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے ایک ایسی جگہ سمندر میں چھلانگ لگا دی، جہاں پر لہریں بے پناہ طاقت کے ساتھ ساحل کی چٹانوں سے ٹکراتی تھیں۔ اچھے سے اچھے پیراک وہاں پر نہانے سے کتراتے تھے ماں ابھی کپڑے بدلنے سے بھی فارغ نہ ہوئی تھی کہ ہم نے چلا چلا کر اسے بتایا کہ برگیجے سمندر میں گر گئی ہے ماں فوراً پانی میں کود گئی اور برگیجے کو نیم بیہوش باہر نکالا۔ جب میں نے بعد میں برگیجے سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا۔ تو اس نے جواب دیا کہ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ماں اسے بچائے گی یا مرنے دے گی"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ ماں کی محبت کا امتحان کرنا چاہتی تھی، ہو سکتا ہے اسے ماں کی محبت کا یقین نہ ہو" میں از سر نو نفسیات کو بیچ میں لے آیا۔

کارین کے ساتھ اس کے بعد بھی گاہے گاہے میری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جن میں اکثر برگیجے ہماری گفتگو کا موضوع ہوا کرتی تھی۔ اسی کے ذریعہ مجھے برگیجے کی ہالی وڈ کے ایک فلم پروڈیوسر کے ساتھ منگنی اور پھر شادی کی خبر پہنچی۔ برگیجے کے خاوند کا تعلق ایک اطالوی خاندان سے تھا۔ اس لیے ہنی مون قدرتی طور پر اٹلی میں گزارا گیا۔

اس کے بعد میرا رابطہ برگیجے کے خاندان سے ٹوٹ گیا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ کارین نے ایکا ایکی جنوبی افریقہ میں جاکر آباد ہونے کا پروگرام بنایا۔ اس کے وہاں سے دو ایک خط بھی آئے مگر میری خط لکھنے میں روایتی سستی آڑے آئی اور یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔

سالوں کے بعد جب کہ میں برگیجے اور اس کے خاندان کو تقریباً تقریباً بھول چکا تھا ایک روز مجھے ایلکے کا خط ملا۔ اس نے خدا جانے کس طریق سے میرا پتہ دریافت کیا تھا۔ اپنے خط میں اس نے مجھے برمین آنے کی دعوت دی تھی۔ ایلکے کو میں نے اس سے قبل نہ دیکھا تھا مگر ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ سالہا سال تک میری دوستی برگیجے اور کارین کے ساتھ رہی تھی۔ جس کے سبب میں ایک طرح سے ان کے خاندان کا ایک فرد بن چکا تھا۔ ایلکے نے میرا استقبال ایک بچھڑے ہوئے دوست کی طرح گرمجوشی سے کیا۔

اس کی زبانی پتہ چلا کہ برگیجے امریکہ کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ اس کے فلم پروڈیوسر میاں نے اسے طلاق دے دی تھی۔ ایک عرصے تک وہ اس کے بعد بھی ہالی وڈ میں ہی قیام پذیر رہی مگر فوٹو ماڈل

کا کام چھوڑ کر ہپی بن گئی۔ دو برس اس نے سڑکوں پر گزارے۔ پھر ایک ہپی جماعت کے ساتھ مل کے میکسیکو میں ایک فارم خریدا اور ساتھ ایک دو سال وہاں گزارے۔ مگر گروپ میں پھوٹ پڑنے کے نتیجے میں فارم بیچ دیا گیا۔ اس وقت سے وہ دنیا کے سفر پر تھی۔ اس کا آخری خط افغانستان سے آیا تھا۔ جہاں وہ بامیان کے مقام پر دو ماہ گزارنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

میرے برمین میں قیام کے دوران بریگیٹے ہماری گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ ایلکے نے ایک واقعہ بیان کیا جو قابل ذکر ہے۔ جب ان کی کتیا سوزی بڑھاپے اور بیماری کے سبب بالکل لاچار ہو گئی تو ان کی ماں نے اسے زہر دے کر مارنے کا ارادہ کیا۔ بریگیٹے کو اس بات کا پتہ چلا تو اس نے شدومد سے اس کی مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک ذی روح کو مارنے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ اس نے ماں کو یہاں تک دھمکی دی کہ اگر اس نے سوزی کو زہر دیا تو وہ عمر بھر اس سے بات نہیں کرے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ سوزی کو اس کے پاس امریکہ بھجوا دیا جائے۔ امریکہ میں چونکہ جانوروں کی درآمد پر پابندی ہے اس وجہ سے بریگیٹے کے امریکی خاوند نے اپنے کسی ذریعہ سے سوزی کو امریکہ میں اسمگل کروایا۔ جہاں وہ ایک سال کے بعد طبعی موت مری۔

اس واقعہ سے مجھے یاد آیا کہ بریگیٹے عام طور سے جانوروں کو مارنے کے خلاف تھی۔ خود قتل کے مجرموں تک کو سزائے موت دینے کو سرکاری قتل کا نام دیا کرتی تھی یونیورسٹی کے دنوں میں ایک بار جب ہمیں ایک دوست نے شکار پر ساتھ چلنے کی دعوت دی تو بریگیٹے نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس دن کے بعد اس نے اس "قاتل" سے بات تک کرنا چھوڑ دی۔ اب ایلکے کی زبانی پتہ چلا کہ بریگیٹے نے گوشت کھانا عرصہ ہوا بند کر دیا تھا جب ایلکے نے اس کی وجہ پوچھی تو بریگیٹے نے جواب میں کہا "میں لاشیں کھانے کا دل گردہ نہیں رکھتی"۔

حسن اتفاق سے میں چند دنوں کے بعد پاکستان جا رہا تھا۔ سوچا کیوں نہ افغانستان سے ہوتا جاؤں ہو سکتا ہے۔ بریگیٹے اس وقت تک بامیان میں مقیم ہو اور اس سے ملاقات ہو جائے۔

مجھے کابل میں ایک جرمن جوڑا مل گیا جو میری آمد کے دوسرے ہی روز کار میں بامیان جا رہا تھا میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ جب ہم بامیان پہنچے تو رات ڈھل چکی تھی۔ مہاتما بدھ کے ستر ستر گز اونچے دونوں بت جیسے بستی پر پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے قدموں میں ایک چھوٹا سا بازار ہے جس میں سڑک کے دونوں طرف چائے خانوں کی جھونپڑیاں ہیں انہی میں اکثر ہپی اور دوسرے مسافر جنہیں سرکاری ہوٹل میں جگہ نہیں ملتی، رات گزارتے ہیں ہم نے بھی ان عوامی مسافر خانوں میں رات کا ٹھکانہ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر بریگیٹے بامیان میں ہوئی تو اسی بازار کی کسی کوٹھری میں مقیم ہوگی۔

دو ایک چائے خانوں کے اندر جھانکنے کے بعد ہم نے ایک مسافر خانے کو پسند کیا۔ مسافر خانہ کیا تھا

بس ایک بڑا سا چوکور کمرہ تھا۔ جس کے ایک کونے میں چائے کی کیتلی ابل رہی تھی کم و بیش چالیس افراد وہاں بیٹھے تھے کچھ لوگ اونگھ رہے تھے اور دوسرے باتوں میں مشغول تھے، میں چائے بنانے والے سے بات کرنے ہی والا تھا کہ ایک ہیولا جو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا میری طرف لپکا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ مارے خوشی کے برگیٹے کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مٹی کے لیمپ کی مدہم روشنی میں برگیٹے کا چہرہ دیکھ کے میں سہم گیا، کہاں مس مدلاڈ اور کہاں یہ عورت، اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں گال پچکے ہوئے، ہونٹ پھٹے ہوئے بال جیسے مہینوں سے نہیں سنوارے گئے تھے اس کے جسم پر ایک میلا سا خاکی رنگ کا لمبا کرتہ تھا جو ٹخنوں تک جاتا تھا اور شاید صدیوں سے نہیں دھویا گیا تھا۔ برگیٹے کے منہ سے بدبو آ رہی تھی۔ دانت پیلے پڑ چکے تھے سامنے کا ایک دانت آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھ والے میں کیڑا لگا ہوا تھا۔

ان مسافر خانوں کے پہلو میں علیحدہ کمرے بھی ہیں جو اکثر خالی رہتے ہیں کیونکہ سبھی بڑے ہال میں سونا پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کمروں میں شب خوابی کی قیمت چار گنا ہے برگیٹے کے پاس علیحدہ کمرہ تھا۔ اس نے میرے لیے اپنے کمرے میں ایک اور چارپائی ڈلوائی۔ برگیٹے نے چرس پی رکھی تھی اور اچھے موڈ میں تھی۔ مگر جونہی بات اس کی شادی اور طلاق تک پہنچی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے میں نہ تو اس کے سابق خاوند کے بارے میں کچھ ایسی معلومات رکھتا تھا نہ ہی مجھے علم تھا کہ دونوں نے کس سبب سے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ اس لیے اس بارے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

برگیٹے نے لمبا سانس بھرا اور کہنا شروع کیا "تمہیں اتنا تو علم ہو گا کہ میرا میاں ایک اطالوی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں عورت صرف اس صورت میں اس نام کی مستحق ٹھہرتی ہے جب وہ بچے جنے۔ جب کہ میرا بچپن سے یہ پختہ ارادہ تھا کہ میں اور تو سب کچھ بنوں گی مگر ماں نہیں بنوں گی۔ اب مشکل یہ پیش آئی کہ میرے میاں اور انکے خاندان کی طرف سے بچوں کی خواہش کا اظہار دن بدن شدت پکڑتا چلا گیا میں اس سے قبل اینٹی بے بی گولیاں کھایا کرتی تھی۔ میرے خاوند نے جو رومن کیتھولک تھا مجھ سے مطالبہ کیا کہ یہ گولیاں استعمال کرنی بند کر دوں۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں اندرونی طور پر کس کشمکش سے دوچار تھی۔ میرے دل کی آواز تو کہتی تھی کہ تمہیں بچہ پیدا کرنے سے انکار کرنا چاہیئے مگر میرے میاں کا اصرار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز اس نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں ایک سال کے اندر اندر حاملہ نہ ہوئی تو وہ مجھے طلاق دے دے گا"

• میرے دل میں طرح طرح کے خدشات پیدا ہونے لگے کہ اگر اس نے واقعہ میں طلاق دے دی تو

ہمارا کیا بنے گا۔ میرا فوٹو ماڈل کا کیریئر ختم ہونے والا تھا اور تعلیم میں نے ادھوری چھوڑ دی تھی ایسے حالات میں مجھے اپنا مستقبل بے حد تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ میں نے شراب نوشی شروع کر دی۔ مقدار دن بدن بڑھتی گئی۔ گاہے گاہے میں نے ایل ایس۔ ڈی اور دوسری نشہ آور چیزیں بھی استعمال کرنا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری مدافعت کی سکت کمزور پڑنے لگی۔ آخر میں نے اپنی خیریت اس میں سمجھی کہ مجھے حمل ہو جانا چاہیے یہ خواہش دن بدن شدت اختیار کرنے لگی یہاں تک کہ چند ماہ کے اندر اندر مجھے اس ایک بات کے سوا اور کسی دوسری بات کا خیال تک نہ رہا۔ پھر وہ دن آیا کہ میری ماہواری رک گئی۔ اور میرا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ مجھ سے زیادہ اس بات کی خوشی میرے میاں کو تھی۔ اس نے اپنے سارے خاندان کو اس کی اطلاع کر دی۔ اب میرے لیے سوائے ایک بچہ پیدا کرنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

" مگر بجائے اس کے کہ مجھے خوشی ہوتی، میرے خدشات بڑھنے لگے۔ ایک روز خواب میں دیکھتی ہوں کہ میں ایک گھُپ اندھیرے غار میں مقید ہوں۔ باہر نکلنے کا صرف ایک راستہ ہے جسے میری ماں نے بند کر رکھا ہے میں چلاتی ہوں، گڑگڑاتی ہوں مگر ماں کا دل نہیں پسیجتا۔ ماں کی آواز بار بار بلند ہوتی ہے اور کہتی ہے تمہیں باہر نہیں نکلنے دوں گی، تمہیں زندہ نہیں رہنے دوں گی" جب میری آنکھ کھلی تو جسم پسینہ پسینہ تھا میں نے غالباً سوتے میں چیخیں ماری تھیں کیونکہ میرا میاں جاگ اٹھا تھا اور مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے بیدار کیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ اس کا کہنا ہے کہ میں بار بار یہ فقرہ دھراتی رہی "میری ماں قاتل ہے میری ماں قاتل ہے" جب اس نے جاننا چاہا کہ اس نے کسے قتل کیا ہے تو میں نے کہا "مجھے دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے مجھے قتل کر کے رکھ دیا ہے" میرے میاں کو خطرہ تھا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے اسی وقت فیملی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا کہ آ کے مجھے دیکھے۔ مگر اس کے آنے سے قبل میری طبیعت سنبھل چکی تھی۔"

" اس دن کے بعد سے " برگیٹ نے چند منٹ کے وقفے کے بعد بیان کرنا شروع کیا " آج تک مجھے سونے سے ڈر لگتا ہے، میں نیند آور گولیاں کھا کر سوتی ہوں، قدرتی نیند جیسے اڑ چکی ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ جونہی آنکھیں بند کروں گی وہ خواب نمودار ہو جائے گا۔"

" تمہارے حمل کا کیا بنا؟" میں نے جاننا چاہا۔

" وہ داستان اپنی جگہ ہے۔" برگیٹ نے پھیکے رنگ میں جواب دیا " مہینوں بعد جا کے پتہ چلا کہ مجھے دراصل حمل تھا ہی نہیں میرے رحم میں ہوا بھری ہوئی تھی۔ میں نے اپنے میاں اور اس کے خاندان کی انتہائی خواہش سے متاثر ہو کر اپنے جسم کیلئے لاشعوری طور پر ایک ایسی صورت حال پیدا کر دی تھی کہ

اس کے لیے حمل کا جائزہ کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ جب میں نے اپنا معائنہ کروایا تو پتہ چلا کہ مجھے طبی نقطہ نظر سے حمل ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ میری رحم کو جانے والی دونوں نالیاں بند ہیں جن کے ذریعے بیضے کے رحم میں پہنچنے کا امکان ہی موجود نہیں۔"

یہاں پہنچ کر برگیٹے رک سی گئی۔ اس نے گھور کے میری طرف دیکھا "تم مرد بہت ظالم ہو" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "جب عورت بچہ پیدا نہ کر سکے تو اسے یوں کونے میں پھینک دیتے ہو جیسے وہ گندگی کا ڈھیر ہو میرے میاں نے اپنی دھمکی سچ کر دکھائی اور مجھے طلاق دے دی۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق مجھے دس لاکھ ڈالر ملے یہ گویا قیمت اس چیز کی کہ میں بطور عورت امتحان پاس نہ کر پائی تھی۔"

"تمہارے ہپی بننے کی وجہ کیا تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"میں اپنے دل میں تو ہمیشہ سے ہپی تھی۔ طلاق کے بعد چرس اور افیون کا استعمال بڑھتا گیا میری دوستی انہی حلقوں میں ہونے لگی جہاں سے ایسا مال خریدتی تھی۔ مگر میں نے اپنے دل میں قسم کھائی تھی کہ کسی مرد کے ساتھ آئندہ جسمانی تعلق نہیں رکھوں گی۔ ہپیوں کے گروہ میں دراصل ہر شخص تنہا ہے جس کا جو جی چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ کوئی اسے پوچھتا نہیں نہ روکتا ہے، میں نے سوچا اس سے بہتر فلاسفی اور ہپیوں سے بڑھ کر رواداری مجھے کہاں مل سکتی ہے۔ اس وجہ سے میں نے اپنی بقیہ زندگی ہپی بن کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔"

میں نے مشورہ دیا کہ اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس جانا چاہیئے۔ یوں دنیا کی خاک چھاننے میں بھلا کیا دھرا ہے مگر اس نے اس پہ عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ علم نفسیات اس کے روگ کا مداوا نہیں کر سکتا۔ ہماری بحث دیر تک جاری رہی۔ اس کا نشہ ٹوٹنے لگا اور اس کے انگ انگ میں درد شروع ہو گیا۔ اس نے سگریٹ میں سے تمباکو نکال کر اس میں افیون کی ایک گول رگڑی جس کے پینے کے بعد اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میرے اصرار پہ وہ بستر پر لیٹ گئی۔

جب صبح میری آنکھ کھلی تو برگیٹے غائب تھی۔ مسافر خانے والوں نے بتایا کہ وہ صبح سویرے ایک ٹرک میں بیٹھ کر کابل چلی گئی تھی۔ اس کے ساتھ دو ہپی بھی گئے تھے جو کی طرح نیپال جانے کا ارادہ رکھتے تھے مجھے حیرت اس بات پہ ہوئی کہ وہ مجھے یوں سوتا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ جب میں نے اپنا بیگ کھولا تو اس میں برگیٹے کی بائیبل دھری تھی جو اس کے باپ کی نشانی تھی۔ جب اسے روس میں جنگ کے دوران گولی لگی تو یہ بائیبل اس کی جیب میں تھی۔ میں نے اسے کھولا تو ایک کاغذ کا پرزہ نظر آیا جس پہ برگیٹے نے میرے نام ایک پیغام چھوڑا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ یہ بائیبل اس کی بہن ایلکے کے حوالے کر دوں اس کا کہنا تھا کہ اسے مجھ سے اتنے سالوں کے بعد مل کے خوشی ہوئی تھی مگر اسے خطرہ تھا کہ میں اسے واپس

جرمنی جانے کو کہوں گا۔ اس لیے اس نے مجھے سوتے ہوئے چھوڑ کر چلے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے ہمبرگ واپس پہنچ کر ایلکے کو ٹیلیفون کیا مگر کسی نے رِسیور نہ اٹھایا۔ اس کی ماں سے رابطہ قائم کیا تو پتہ چلا کہ ایلکے تعطیلات منانے جنوبی افریقہ گئی ہوئی تھی جب میں نے برگیٹے سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا تو اس نے مجھے بریمن آنے کی دعوت دی اس کا کہنا تھا کہ ایسی باتیں ٹیلیفون پر نہیں کی جا سکتیں۔

میری زبانی برگیٹے کے حالات سن کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہنے لگی "برگیٹے کو جن نفسیاتی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کا اصل باعث میں ہوں، اگر مجھے نتائج کا علم ہوتا تو میں ان غلطیوں کا ارتکاب نہ کرتی جن کے باعث آج برگیٹے کی زندگی جہنم بنی ہوئی ہے"

"میرے لیے آپ کی باتیں پہیلیاں ہیں۔ آپ کا اس بارے میں بھلا کیا قصور ہو سکتا ہے" میں نے اس کے دکھ کو کم کرنے کے کہا۔

"اصل قصور وار میں ہی ہوں جب تمہیں پوری تفصیل کا علم ہو جائے گا تو تم بھی یہی کہو گے اس قصے کی ابتداء اس وقت ہوئی جب میری ملاقات اپنے ہونے والے میاں سے ہوئی۔ جن کا نام ٹونی تھا۔ اس سے پہلے میرے کئی ایک دوست تھے بلکہ چند ایک کے ساتھ میرے جنسی تعلقات تو اس کے بعد بھی قائم رہے۔ خصوصاً ایک مصری نوجوان مجھے بے حد پسند تھا اس کے بال کالے اور گھنگھریالے تھے جسم سڈول اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس کے ساتھ میں ہر بدھ کی رات سویا کرتی تھی۔ یہ رسم تقریباً ایک سال تک جاری رہی مگر میرا یا اس کا ارادہ ایک دوسرے کے ساتھ شادی کرنے کا نہیں تھا۔ اس عرصے میں میری دوستی ٹونی سے ہوئی اور میرا اکثر وقت اس کے ہمراہ بسر ہونے لگا۔ تاہم بدھ کی رات بدستور میرے مصری دوست قاسم کے لیے مخصوص رہی۔ میں آخری بار اس سے ٹونی کے ساتھ شادی سے صرف ایک ہفتہ قبل سوئی تھی۔ یہ گویا ہماری الوداعی ملاقات تھی۔ اس کی تعلیم یوں بھی ختم ہو چکی تھی اور وہ آئندہ چند ماہ کے اندر اندر مصر واپس جا رہا تھا"

"اسی ماہ میری ماہواری بند ہو گئی۔ جب میں نے طبی معائنہ کروایا تو پتہ چلا کہ حمل سے ہوں۔ اب میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ آیا میں قاسم سے حمل سے ہوں یا ٹونی سے۔ یہی دو اشخاص تھے جن کے ساتھ میں اس ماہ میں سوئی تھی۔ میرا شبہ قاسم پہ جاتا تھا۔ خطرہ اس بات کا تھا کہ اگر بچہ اس کا ہوا تو اس کا رنگ سانولا ہوگا۔ آنکھیں کالی اور بال گھنگھریالے ہوں گے۔ ٹونی کے فرشتوں کو بھی قاسم کا علم نہیں تھا مگر بچہ کو دیکھ کر ہر کوئی سمجھ جائے گا کہ ٹونی جس کا رنگ سفید، آنکھیں سبز اور بال بھورے تھے۔ اس کا باپ نہیں ہو سکتا ٹونی ایسی صورت میں فوری طور پر مجھ سے جدائی اختیار کر لے گا۔ میں ٹونی کی طبیعت سے واقف تھی اور خوب جانتی تھی کہ وہ اس صدمے کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ اسے مجھ پہ حد درجہ اعتماد تھا اور اس

کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرے جنسی تعلقات اس کے علاوہ دوسرے مردوں کے ساتھ بھی قائم تھے۔“

”میں بھاگی بھاگی قاسم کے پاس گئی اور اسے اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ مگر اس نے الٹا مجھے الزام دیا کہ یہ میری غفلت کا نتیجہ تھا۔ اس لیے سارے نتائج مجھے اکیلی کو بھگتنے ہوں گے۔ وہ بہر صورت مصر واپس جا رہا تھا جہاں پر اس کے والدین نے اس کی شادی کا بندوبست کر رکھا تھا۔“

”میں دوبارہ واپس آ گئی۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ یہ بچہ پیدا نہیں ہو گا۔ مشکل مگر یہ تھی کہ مجھے وضع حمل کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس زمانے میں ہمارے ملک کے ڈاکٹر اس کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ یوں بھی یہ چیز قانون کے خلاف تھی۔ میری اپنی معلومات اس سلسلے میں بہت محدود تھیں۔ سن رکھا تھا کہ اونچی جگہ سے چھلانگ لگائی جائے تو حمل گر جاتا ہے اس لیے میں سارا سارا دن کودنے اور چھلانگیں لگانے میں بسر کرنے لگی۔ کسی نے بتایا کہ کونین کی گولیاں اس مقصد کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ سو درجنوں گولیاں کھائیں۔ ایک بڑھیا کے پاس پہنچی جس نے دیگچی میں کوئی چیز ڈال کے ابالی جس کے بخارات رحم تک پہنچانے کے لیے مجھے گھنٹہ بھر اس دیگچی پر گزارنا پڑا۔ جو چیز کسی نے بتائی وہ میں نے کر ڈالی مگر حمل تھا کہ گرنے میں نہ آتا تھا۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے۔ میرا پیٹ تھا کہ برابر پھولتا جا رہا تھا حتیٰ کہ بچے کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دینے لگی۔ اس کی ہر حرکت مجھے پاگل بنائے جاتی تھی میں نے بعض اوقات غصے میں آ کر اپنے پیٹ پہ مکے مارے کہ یہ بدبخت بچہ کسی طرح مر جائے مگر سب بے سود۔“

”میرے دل میں بچے کی پیدائش سے قبل ہی اس کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ مجھے اپنی بے بسی پہ غصہ آتا تھا بار بار خیال آتا کہ بچہ سامنے ہوتا تو اس کا گلا گھونٹ کے اسے مار سکتی تھی۔ مگر پیٹ پر میرا قابو نہ تھا میری خواہش کے خلاف بچہ میرے ہی خون پر پلتا رہا۔“

”جوں جوں پیدائش کے دن قریب آتے گئے، توں توں میری گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں نے بہتیرے جتن کئے کہ بیمار ہو جاؤں تاکہ اس بہانے کوئی ڈاکٹر حمل گرانے کے لیے تیار ہو جائے۔ مگر ہر تدبیر ناکام گئی حتیٰ کہ میں نے خودکشی کا پروگرام بنایا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں خود نہ مرنا چاہتی تھی بلکہ بچے سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایک روز میں نے خواب آور گولیوں کی ایک بوتل خریدی اور ہوائی اڈے پر پہنچ گئی پہلا جہاز روم جا رہا تھا اس لیے وہاں کا ٹکٹ خریدا۔ چیک ان کے بعد جب کہ جہاز کے چلنے میں صرف نصف گھنٹہ باقی رہ گیا تھا میں نے بیس خواب آور گولیاں چائے کی پیالی میں گھول کے پی لیں۔ مگر آدھ گھنٹہ تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں سر بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ آخر بنچ پر بیٹھے بیٹھے سو گئی جب جہاز کی روانگی کا اعلان ہوا اور سب لوگ گیٹ کی طرف گئے تو میں بنچ پر اکیلی بیٹھی گہری نیند سو رہی تھی جب

مجھے بیدار کرنے کی ہر کوشش ناکام گئی تو مجھے ایمبولینس میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ میرے بیگ میں خواب آور گولیوں کی خالی شیشی دیکھ کے ڈاکٹر میری گہری نیند کا سبب سمجھ گئے۔ انہوں نے فوری طور پر میرا معدہ صاف کر دیا۔"

"جب میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ میں چونکہ نہیں چاہتی تھی کہ لڑکی کو اس بات کا پتہ چلے اس لیے چپکے سے اپنا بیگ اٹھا کے ہسپتال سے بھاگ آئی۔ راستے میں مجھے احساس ہوا کہ بچہ ابھی میرے پیٹ میں ہی تھا۔"

"قصہ مختصر، برگیٹے میری مرضی کے خلاف پیدا ہوئی۔ میری چھاتیوں میں اس کے لیے دودھ تک نہیں اترا۔ جب اسے پیدائش کے بعد نرس میرے پاس لے کے آئی تو میں نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا کیونکہ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اسکے نقش قاسم سے ملتے جلتے ہوں۔ کسی سے سن رکھا تھا کہ تمام بچے پیدائش کے معاً بعد سفید فام ہوتے ہیں خود حبشی بچے بھی ابتداءً کالے نہیں ہوتے۔"

"باوجود اس امر کے کہ ایک ماہ گزرنے پر بھی برگیٹے کا رنگ سانولا پڑا نہ ہی اس کے بال گھنگھریلے ہونے شروع ہوئے۔ اس کو چھوتے وقت میرا جسم کانپ جایا کرتا تھا۔ مصیبت اب یہ تھی کہ میں نے دن رات اپنے آپ کو اس وجہ سے کوسنا شروع کر دیا تھا کیونکہ میں نے برگیٹے کی پیدائش کو روکنے کے لیے، نہیں اس کے قتل کی خاطر ہر جتن کیا تھا میرا یہ احساس ندامت آج تک موجود ہے، جب بھی برگیٹے کا خیال آتا ہے تو میرے دل پہ ایک زخم سا لگتا ہے۔ کاش میں نے اسے خوشی سے قبول کیا ہوتا۔ اور اس کی پیدائش کا استقبال کیا ہوتا۔ اس کے ساتھ میرے تعلقات کبھی بھی ایسے نہ تھے جیسے ماں بیٹی کے ہونے چاہئیں میں نے اسے اور معلوم ہوتا ہے اس نے مجھے وہ نو ماہ معاف نہیں کئے جو اس نے میرے پیٹ میں گزارے ہیں اور جو اس کے لیے اور میرے لیے جہنم کے نو ماہ تھے۔"

احمد داؤد
راولپنڈی

جھیل۔ جنگل۔ قدیم بوڑھا

"اپنی آنکھوں کے سامنے . . . . ان گناہگار آنکھوں کے سامنے، میں نے اسے پانی میں اترتے دیکھا، میرے دیکھتے ہی دیکھتے، میرے شور مچانے سے قبل ــــ اسے بچانے سے قبل۔ وہ ڈوب گئی۔ جہاں اس کا بدن پانی میں اترا وہاں تھوڑی دیر کے لیئے لہروں کے دائرے بنے اور پھر بطخوں کا شور ان لہروں پہ پھیل گیا ــــ ساری جھیل پہ، سارے جنگل میں بطخوں کے چیخنے کی آواز پھیل گئی۔ اس رات جنگل کے سارے پرندے روتے رہے۔ اور ــــ ہاں میں تمہیں بتانا بھول گیا ہوں ڈوبنے والی کے ساتھ جو شخص آیا تھا تھوڑی دیر کنارے پہ کھڑا رہا۔ حیران۔ گم سُم۔ پھر واپس پلٹا اور اپنی نیلی کار میں بیٹھ کر چلا گیا ــــ واپس چلا گیا۔"

کئی دنوں سے ہم سن رہے تھے کہ ایک شخص اپنی نیلی اسپورٹس گاڑی میں جھیل پہ آتا ہے۔ جب اس کی کار درختوں کے جھنڈ سے ظاہر ہوتی ہے تو وہ ہارن بجانے لگتا ہے جسے سن کر جھیل کے ٹھہرے پانی میں ہلچل اٹھتی ہے کہ پانی پہ تیرتی بطخیں اس کی آواز کی منتظر رہتی ہیں۔ چھٹی کے دن کی سہ پہر ان کے لیئے بلاوے کا وقت ہوتا ہے۔ جھیل کے پہلے کنارے سے لے کر بائیں طرف جہاں سنتھے اور کیکر کے جھنڈ ہیں اور راستے کے پاس جہاں لکڑی کے تختے پڑے ہیں۔ بطخوں کی ٹولیاں منتظر عاشق کی بے صبری کے ساتھ کنارے کی جانب لپکتی ہیں۔ ہارن کی آواز سن کر ان کے بوجھل بدن سبک ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ گاڑی کنارے پہ کھڑی کر کے چند بار رک رک کر ہارن بجاتا تو بطخوں کا انبوہ چونچ کھول کر، بھاری پر پھڑپھڑا کر بے چینی کے ساتھ اپنی بھدی کرخت آواز کا طوفان کھڑا کر دیتا اور پھر ایک دم وہ ہاتھ ہارن سے ہٹا لیتا۔ ماتھے پر بکھرے بالوں کو

سنوارتا اور پھر گاڑی سے باہر نکل آتا۔ اس کے باہر نکلتے ہی بطخیں ایک بار پھر زور زور سے چیخنے لگتیں تب وہ پچھلی سیٹ پہ رکھی ٹوکری اٹھاتا اور کنارے کے قریب آجاتا اور آہستہ سے ٹوکری کھول کر اس میں ہاتھ ڈالتا اور کچھ چیز نکال کر آبی پرندوں کی طرف پھینکنے لگتا۔ شور مچاتی مخلوق پرسکون ہو جاتی اور پانی کے اندر، کناروں پہ گرتے چوگے کی طرف دھیان لگ جاتا۔ تھوڑی دیر کے لیئے پانی کی سطح پر، جنگل میں اور اس شخص کے اردگرد خاموشی پھیل جاتی لیکن جونہی وہ جانے کے لیئے واپس مڑتا تو آبی پرندوں کا جھنڈ پانی سے باہر نکل آتا شور مچاتا۔ کراں کراں کے شور میں، پھیلے ہوئے پنجے اور بوجھل پر لیئے سڑک پہ آکر اس کی گاڑی کے چار چفیرے پھیل جاتا اور وہ بہت احتیاط کے ساتھ اپنی نیلی اسپورٹس سٹارٹ کر کے آہستہ آہستہ آبی پرندوں میں راہ بنا کر درختوں کے جھنڈ کے پاس جا کر پوری سپیڈ سے گاڑی دوڑاتا ہوا واپس چلا جاتا۔

اس کے جانے کے بعد ایک گھنی سنسان چپ چاروں طرف پھیل جاتی۔ نیلی اسپورٹس کار میں آنے والا شخص کون تھا۔

کسی کو پتہ نہ تھا۔

اس کی وجیہہ صورت، طویل قامت، ہستی میں جو راز پوشیدہ تھا اس کا اپنا تھا۔ سراسر اس کا اپنا ذاتی، راز جو کسی پہ عیاں نہ تھا۔

لوگوں کو صرف اتنا پتہ تھا کہ ایک شخص چھٹی کے دن سہ پہر ڈھلے جب سائے قد نکالنے لگتے ہیں وہاں آتا ہے اور اس کے ہارن کی آواز سن کر بطخیں شور مچاتی بھاگتی ہوئی کنارے پہ آجاتی ہیں اور اس کے ہاتھوں کا چوگا چگ اس کی واپسی تک خشک زمین پہ کھڑی رہتی ہیں۔

ہمیں اس شخص کو دیکھنے کی آرزو تھی۔

سنا ہے کہ یہ جھیل اور جنگل زمانوں سے قائم ہے۔ شمال کی جانب سے آنے والے راج ہنس اور بگلے یہاں تھوڑی دیر ستا کر جنوب کے تپتے میدانوں کی سمت اڑ جایا کرتے تھے۔ ان زمانوں میں قافلے سے بچھڑے لوگ، دارالخلافے کے باغی، عشقِ لاحاصل کے شکار بندے اور عشقِ خدا کے شکار درویش گاہے بگاہے اس جنگل سے گزرتے اور اس جھیل کا پانی پیا کرتے تھے۔ یہ باتیں ہمیں اس شخص نے بتائیں جس نے کہا تھا۔

"اپنی آنکھوں کے سامنے ـــــ ان گنہگار آنکھوں کے سامنے ـــــ میں نے اسے پانی میں اترتے دیکھا، میرے دیکھتے ہی دیکھتے، میرے شور مچانے سے قبل اسے بچانے سے قبل وہ ڈوب گئی۔ جہاں اس کا بدن پانی میں اترا وہاں تھوڑی دیر کے لیئے لہروں کے دائرے بنے اور پھر بطخوں کا شور ان لہروں پہ پھیل گیا۔ ساری جھیل

سارے جنگل میں بطخوں کے چیخنے کی آواز پھیل گئی۔ ڈوبنے والی کے ساتھ جو شخص آیا تھا۔ تھوڑی دیر کنارے پہ کھڑا رہا۔ اور پھر واپس چلا گیا"۔

ہم نے اس کی بات کا یقین کر لیا کہ اس کے چہرے پہ صدیوں کا پیچ جھریاں بن کر پھیلا ہوا تھا۔ قدیم بوڑھا جسے دیکھ کر ہم حیران ہو رہے تھے مگر ہمیں جنگل، جھیل اور اس شخص کو دیکھنے کی آرزو تھی جو اپنی نیلی اسپورٹس کار میں آبی پرندوں کا دانہ لے کر آتا ہے۔ لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔

آپ کو میری بات کا یقین نہیں ؟۔

میں نے خضر کی طرف دیکھا جو جھیل پہ نگاہیں جمائے مچھلی پکڑنے کا سامان کھول رہا تھا۔ جواب نہ پاکر بوڑھا بولا۔

"مچھلیاں یہاں نہیں ہوتیں۔ آپ کو مایوسی ہو گی"۔

"کیوں؟" ہمارے منہ سے اچانک نکلا۔

"پچھلے کئی سالوں سے عجیب سا ہو رہا ہے۔ شاید زمین کی حد بندی کا نتیجہ ہے۔ یا پھر پانی کی بندر بانٹ کی وجہ سے"۔

"ہم سمجھے نہیں۔"

پہلے تو جنگل جانوروں سے خالی ہوا اور گھونسلے پرندوں سے اور پھر مچھلیاں، آپ کو میری بات کا یقین نہیں آئے گا"۔

یق۔ "یقین ہے۔ ہے"۔ ہمارے لبوں سے نکلا۔

"مچھلیاں۔ مردہ مچھلیاں۔ پانی پہ تیرنے لگیں اور یوں ساری جھیل خالی ہو گئی"۔

"لیکن یہ بطخیں"۔

"یہ تو اس کا انتظار کرتی ہیں"۔

"کون۔ کہاں سے آتا ہے وہ"۔ خضر نے بے یقینی سے پوچھا۔

"کوئی پتہ نہیں۔ ناں ہی کبھی پوچھا ہے۔ میرا کیا ہے۔ مجھے خود پتہ نہیں۔ کوئی بلائے تو بات کر لیتا ہوں۔ بیٹھ جاتا ہوں۔ پہلے بہت لوگ آتے تھے۔ شہر سے۔ بچے بوڑھے۔ عورتیں۔ خاص طور پہ چھٹی کے دن تو بہت لوگ ہوتے تھے۔ پھر جنگل کٹنا شروع ہوا۔ لوگ کم ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ یہاں بیرکس بن گئیں۔ پرلی طرف جہاں بیلا تھا وہاں بگھ گھوما کرتا تھا اب وہاں چاند ماری کا میدان ہے۔ جگہ جگہ باڑھ لگا دی گئی ہے۔ وہ سامنے دیکھ رہے ہوناں باڑھ۔

"ہاں۔ہاں۔" ہم نے اُدھر دیکھ کر کہا جدھر اس نے اشارہ کیا تھا۔
رونق کم ہوگئی۔ لوگ جو کم ہوگئے تھے۔ ساری رونق تو بندوں کے دم سے ہے۔ جگہ جگہ بورڈ دیئے گئے۔ وہ دیکھ رہے ہونا سامنے۔" اس نے پھر ہاتھ پھیلا کر بازو کھول کر اشارہ کیا۔

ہم نے اس کے ہاتھ کی سیدھ میں دیکھا جہاں "ممنوعہ علاقہ" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

" اب تو کبھی کبھار کوئی آجاتا ہے یا پھر چھٹی کے دن وہ آتا ہے۔ آج بھی آئے گا مگر سنا ہے کہ اب جھیل بھی خشک کرنے والے ہیں۔ تم لوگ ادھر شہر میں بستے ہو۔ یہ خبر کتنی پکی ہے؟"۔

"ہم تو مچھلی کے شکار کو آئے ہیں یا پھر اس کو دیکھنے۔"

وہ ہنسا تو اس کا بڑھاپا چند سال آگے چلا گیا۔

"شکار ــــــ وہ تو ایک زمانہ ہوا یہاں ہوتا تھا جب شمال کے رخ علاقوں سے پرندے آتے تھے۔ جنگل میں مور ناچتا تھا اور ادھر بیلے میں۔ ہانکا لگانے والوں کو میں رستہ بتایا کرتا تھا۔ تمہیں میری باتوں کا اعتبار نہیں"۔

میں نے خضر کی طرف دیکھا جو بے یقینی سے بوڑھے کو تکے جا رہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں مچھلی کا کانٹا تھا اور بائیں ہاتھ میں ڈور کا گچھا۔ اس کے کھلے گریبان سے بال جھانک رہے تھے۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں تجسس اور بے اعتباری کا ملا جلا رنگ تھا۔ اس رنگ کے درمیان جھیل کا عکس ڈول رہا تھا۔

"اعتبار ہے۔ آپ کی باتوں پہ پورا یقین ہے۔ لیکن یہ بتلایئے کہ مچھلیاں کس حصہ میں ہوں گی۔ خضر بولا۔

"کہیں بھی نہیں۔ وہ زمانے گئے۔ جب یہاں پرندے بولا کرتے تھے اور جنگل بھیڑیوں کی غراہٹ سے کانپتا تھا۔ اب تو چاند ماری کے بارود کی بُو اور جنگل کاٹنے کے آرے کی آواز کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا۔ اب تو یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ جیسے آپ آئے ہیں یا وہ نیلی کار والا۔

"آج تو چھٹی کا دن ہے۔ ہم تو سیر کرنے آئے ہیں۔ ہم نے بہت ذکر سنا تھا اس جگہ کا اور اس شخص کا جو ــــ اور ــــ اور ــــ خضر نے آہستہ سے کہا۔" اور آپ کا ذکر تو بہت سنا تھا۔"

"جھوٹ غلط۔ مجھے پتہ تھا کہ میری باتوں کا یقین نہیں کرو گے۔ اچھا بتاؤ میرے بارے میں آپ کو کیا پتہ ہے۔

ہم دونوں نے لاجواب ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ خضر نے بوڑھے سے آنکھیں چرائیں اور

جلدی سے مچھلی کا نٹا پانی کی طرف پھینک دیا۔

"جواب نہیں دیا" بوڑھے نے کہا۔

"ہمیں کسی نے بتایا تھا" میں نے کہنا شروع کیا "کہ اس جھیل پہ ایک بہت بوڑھا شخص رہتا ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ باوجود کوشش کے وہ آپ کو یہاں سے بے دخل نہیں کر سکے۔

"بے دخل نہیں مہاجر کہو" بوڑھے نے تصحیح کی ــــ مگر کون لوگ"۔

"جنہوں نے یہاں جگہ جگہ باڑھیں لگائی ہیں۔ ہر شئے کا حسن اجاڑ دیا ہے۔ وہ آپ کو یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں مگر آپ پرانے وقتوں سے یہاں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے ؟؟۔

"کچھ پرانے وقت! نوح کی کشتی والا۔ واقعہ تو سامنے کی بات ہے۔ یہ جو تختے تم دیکھ رہے ہونا جن پہ کچھ لکھا ہوا ہے" بوڑھے نے راستے کے پاس جہاں لکڑی کے تختوں پہ "ممنوعہ علاقہ" کے الفاظ لکھے تھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تختے نوح کی کشتی کے ہیں"۔

" اور آپ اس میں سوار تھے"۔ خضر کانٹے میں مچھلی نہ لگی تو جل کر بولا۔ اور پھر آہستہ سے کہنے لگا۔ "عرصہ بعد کوئی سامع ملا ہے۔ ممکن ہے پاگل پن کی ایک قسم یہ بھی ہو کہ آدمی خود کو قدیم باشندہ جان کر پرانے واقعات سے اپنا تعلق جوڑے"۔

بوڑھے نے اس کی بات سن لی مگر برا منائے بغیر مسکرا کر بولا۔

"تمہارے کانٹے میں مچھلی نہ لگی تو خود کو لگا لینا۔ اپنا شکار کر لینا۔ ویسے احتیاط کرنا آج چھٹی کا دن ہے اور کیا پتہ وہ لوگ بھی آجائیں اور تم دونوں کو یہاں دیکھ کر پکڑ لیں۔

" ایسے وقت آپ کیا کرتے ہیں" میں نے پوچھا۔

"چھپ جاتا ہوں۔ میں اس زمین کا پرانا مکیں ہوں۔ ابھی اس جنگل میں میرے کئی گھر ہیں۔ چھپ جاتا ہوں۔ ان کی زد سے بچ جاتا ہوں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے کتوں کو میری تلاش پہ لگا دیا بو سونگھنے والے کتے۔ کئی دفعہ وہ میرے پاؤں چاٹ کر لوٹ گئے"۔

"مجھے تو اس کی فکر رہتی ہے جو بطخوں کو دانہ ڈالنے آتا ہے۔ اب تو یہاں وہ ہی رہ گیا ہے یا پھر راتوں کا رونا"۔

"کس کا رونا"۔

"جھیل کی تہہ سے رات کو رونے کی آواز آتی ہے۔ ڈوب جانے والی کی آواز۔ پانی کے اندر سے سسکیاں ابھرتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس کو یاد کر کے روتی ہے۔ اس کی اپنی ہو گی ناں۔ اپنے

ہی تو روتے ہیں اور وہ بھی تو آتا ہے یہاں اسی کی خاطر۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں"۔

"بالکل۔ بالکل"۔

خضر کی ڈور پانی میں ساکت تھی۔

اس وقت سورج دھیرے دھیرے درختوں کی اوٹ میں جا رہا تھا۔ دور شہر کی آوازیں رک رک کر گھٹ گھٹ کر ہوا کے طشت پہ تیرتی ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ معاً مجھے واپسی کا خیال آیا۔ شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ خضر کو بھی یہاں آنے کی کیا سوجھی۔ یہ وقت مچھلی پکڑنے کا تو نہیں اور پھر بوڑھے کی باتیں کیا پتہ سچ ہوں۔ پچھلے کئی دنوں سے ہم شہر سے باہر نکلنے کی سوچ رہے تھے، باہر جانے کے لئے اجازت نامہ ضروری تھا جس کی درخواست ہم نے بہت پہلے دے دی تھی۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی تھی۔ جگہ جگہ بنی چیک پوسٹوں پہ روک کر تلاشی لی گئی۔ بڑی کوفت سے یہاں تک پہنچے اور اب واپسی کا مرحلہ درپیش تھا۔ کہ شام سے پہلے گھر پہنچنا ضروری ہے، جب سے اپنوں اور عزیزوں کی پہچان ختم ہوئی ہے شہر میں شبہے کی دہشت گشت کرتی رہتی ہے۔ کسی وقت بھی روکا جا سکتا ہے۔ سلاخوں کے پیچھے بند کیا جا سکتا ہے لہٰذا وقت پر گھر پہنچنا ضروری ہے کہ واپسی کا وقت نزدیک تھا۔

"واپسی کا وقت ہو رہا ہے خضر، آؤ چلیں"۔ میں نے زور سے کہا۔ اس وقت سورج دھیرے دھیرے غروب کی سیڑھی اُتر رہا تھا۔ سائے لمبے ہونے لگے تھے اور فضا میں پھیلی اداسی مساموں کی راہ سے بدن میں ذخیرہ ہو رہی تھی میں نے خضر کو پھر پکارا۔

اس نے پلٹ کر بوڑھے کو دیکھا پھر مجھے اور سرگوشیوں میں بولا۔

آوازیں۔ سن رہے ہو؟؟۔

ہوا کے طشت پر آوازوں کی کپکپاہٹ تھی۔

"پیچھے۔ چلو۔ چلو۔ چھپ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔ بوڑھا ہاتھ ہلا کر بولا اور پھر ایک طرف کو تیزی سے بھاگ اٹھا۔ ہم نے صرف اس کی پشت دیکھی جو سنتے اور کیکر کے گھنے جھنڈ کے پاس کہیں غائب ہو گئی تھی۔

خضر نے ہاتھ پر ڈوری لپیٹی اور بولا۔

"آؤ چھپ جائیں۔ دیکھیں وہ کیا کرتے ہیں"۔

"واپس چلو شام ہو رہی ہے۔ مصیبت آ جائے گی"۔

میری بات پہ کان دھرے بغیر اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور جھیل کے ایک طرف پتھروں کے ڈھیر کے پاس لے گیا۔

نوکیلے کھردرے پتھر ہماری کہنیوں اور ٹانگوں میں چبھ رہے تھے۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے چاند ماری میدان سے جیپوں کا قافلہ نمودار ہوا۔ بڑی بڑی سرچ لائٹیں، سروے کے آلات، آرہ مشینیں، جال اور بارود سے بھری پیٹیوں کا قافلہ جھیل کے پرلے کنارے پہ آکر رک گیا۔ پھر اگلے حصہ سے چند آدمی نکلے۔ انہوں نے کمال سرعت کے ساتھ آبی پرندوں پہ جال پھینکا نہ کوئی شور مچا نہ کسی پرندے نے آواز نکالی۔ ایک ہولناک چپ سہ پہر کے آخری دموں پہ پھیل گئی۔ آبی پرندوں سے بھرا جال انہوں نے کنارے کی طرف کھینچا اور پھر واپس ہو لیے۔

قافلے نے جھیل کے پرے کنارے پہ پڑاؤ کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جھیل کی سطح پر نچے ہوئے پر تیر رہے تھے۔

نوکیلے کھردرے پتھر ہماری کہنیوں اور ٹانگوں پہ چبھ رہے تھے۔

ہم خوف کے مارے ایک دوسرے کی پناہ میں بیٹھے تھے کہ اچانک ہارن کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ نیلی اسپورٹس کار درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوئی۔ ہارن کی آواز جنگل میں پھیلی مگر اس کا جواب جھیل کی طرف سے گہری خاموشی کی صورت میں آیا۔

کنارے پر آکر رکی کار سے وجیہہ صورت طویل قامت شخص جسے دیکھنے کی آرزو تھی باہر نکلا۔ حیران گم سم۔ جھیل کی سطح پر تیرتے پروں کو دیکھ کر اس نے پچھلی سیٹ پہ رکھی ٹوکری اٹھائی اور چند قدم آگے بڑھ کر جھیل کے کنارے پہ پانی کے پاس آ رکا۔

حیران گم سم آنکھوں کے ساتھ اس نے جنگل کو دیکھا اور پھر جھیل کی طرف بڑھنے لگا۔

درختوں کی اوٹ سے طلوع ہوتی شام میں ہم نے دیکھا کہ ایک شخص نہایت سکون کے ساتھ، ہاتھوں میں ٹوکری لیے، دھیرے دھیرے جھیل کے پانی میں اتر رہا ہے۔ ایک ایک قدم اٹھا کر، بغیر کسی خوف، ہچکچاہٹ کے، رتی بھر شبہے کے بغیر، ایک اولیائی شان کے ساتھ۔ پانی میں گم ہو رہا ہے۔

ڈوب جانے والوں کی سسکیاں، جھیل، جنگل اور قدیم بوڑھے کی آہیں ــــ اس وقت ہمیں کسی کے رونے کی آواز آرہی تھی۔

ہرچرن چاولہ
ناروے

گھوڑے کا کرب

"تو تو گھوڑا ہے۔ تیرا کام دوڑنا اور بوجھ ڈھونا ہے" میرے دل نے سوچا

دور سامنے ان پہاڑیوں پر ہری بھری گھاس آنکھوں کو کتنی سہانی لگتی ہے۔ اس کی ہریالی آنکھوں کی راہ پیٹ میں بھوک جگا دیتی ہے۔ پیٹ تو یہاں کی سوکھی سڑی گھاس سے بھی بھر جاتا ہے۔ مگر کچھ اور قسم کی بھوک اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے

وہاں اگر میں پکڑا گیا تو یہی ہوگا نا کر جو بھی میرا نیا مالک ہوگا مجھ پر بوجھ ڈھوئے گا یا کوئی چھکڑا ایکہ یا گاڑی کھچوائے گا۔ یہاں کون سا آرام ملتا ہے۔ روز ٹخوں ٹخوں تانگہ کھینچنا پڑتا ہے۔ اس مالک کو تو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ بھر بھر تک سواریوں سے لاد دیتا ہے اور گالیاں بھی بے شمار میرے سر پر لادنا رہتا ہے۔ سواری نہ ملے تو غصہ مجھ غریب پر۔ بیوی سے جھگڑا تو چھانٹا میری پیٹھ پر۔ ساتھی تانگے والوں سے تو تو میں میں تو سزاوار میں۔ کوئی ڈھنگ ہے جینے کا بھلا۔ یہ نہیں کہ میری سزا اپنی کمو بس ہر وقت گالی گلوچ۔ ہاں وہاں کوئی کہاں تک برداشت کرے ہر وقت بھی یہاں کوئی نہیں بندھا ہوا کام کا۔ ابھی آنکھ بھی پوری طرح نہیں کھلتی کہ لگام منہ میں اور پھر دونوں کمر پر۔ شہر سٹیشن، سٹیشن شہر رات گئے تک ایک چکر سا بندھا رہتا ہے پاؤں میں۔ پھر نہ اتوار چھٹی نہ تہوار چھٹی۔

نئی جگہ شاید اچھی نہ ہو مگر اس سے بری کیا ہوگی۔ چل مانا اسے بھی دیکھ۔

کتنی دور نکل آیا ہوں۔ آدھا رستہ تو آ چکا ہو گا۔ وہ جو آنکھوں کو بر ماتی تھی وہ ہریالی جانے اور کتنی دور ہے۔ وہ جو نظروں کے قریب تھا قدموں سے کتنا دور ہوتا جا رہا ہے۔ کیا واپس لوٹ چلوں یا آگے بڑھوں۔ یہاں تک مالک ڈھونڈنے پہنچے گا ہی۔ پھر تو وہ پٹائی ہوگی کہ بس خدا یاد آ جائے گا۔ کئی چھانٹے میری کمر پر توڑ دے گا ظالم۔ جتنا پیچھے جانا ہے اتنا آگے کیوں نہ بڑھوں۔ شام تک ضرور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں گا۔ بس ذرا رستے کے گھوڑا چوروں سے خود کو بچانا ہے۔

اُف خدایا۔ کتنا دور ہے وہ دیس۔ وہی جو سامنے نظر آتا ہے۔ جس کی طرف میں سرپٹ پانچ دن سے دوڑ رہا ہوں۔ اور وہ سرپٹ میرے آگے آگے دوڑتا مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ خیر چل منا اب تو نہ پیچھے جانے کا یارا ہے نہ رکنے کا چارا ہے۔

لے بھئی۔ کچھ تو نزدیک پہنچے۔ واہ کیا خوبصورت ندیاں ہیں۔ پہاڑ ہیں۔ ہر طرف ہریاول ہی ہریاول ہے۔ بس کوئی مناسب اور شریف سا مالک مل جائے تو باقی زندگی یہاں گزار دوں۔ کیا ضرورت ہے خواہ مخواہ بھاگتا چلوں۔ آگے اور آگے۔ اور اس سے آگے، اس سے خوبصورت بھلا اور کیا ہو گا۔

اس سے پہلے کہ کوئی شیر بگھیار چیر پھاڑ ڈالے۔ چل منا۔ خود ہی خود کو کسی کے حوالے کر دے۔

میرا نیا مالک تو ٹھیک آدمی ہے۔ بس ذرا ساتھی گھوڑے تھوڑے سے مختلف ہیں۔ میں ہنستا ہوں وہ ہیں ہیں کرتے ہیں۔ اپنے ہاں تو کتے بھونکتے تھے یہاں تو بس ذرا سا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے بڑبڑا لیتے ہیں۔ شریف اتنے ہیں کہ بلیاں اور مرغیاں تک ان کے اوپر سے نکل جاتی ہیں۔ تو اُف تک نہیں کرتے۔ مرغے اپنے ہاں ککڑوں کوں کی آواز سے بانگ دیتے تھے تو سارا محلہ جاگ اٹھتا تھا۔ یہاں ککلوکی بولتے ہیں جیسے کوئی ملیا پھلکا راگ گا رہے ہوں خیر جو بھی ہے ٹھیک ہے میرا دل یہاں خوب لگ گیا ہے۔ مالک بھی اچھا ہے۔ بس کبھی کبھی ایک گاڑی سی مجھ سے کھچوا لیتا ہے۔ سامان اس میں کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ پہیے اتنے ہلکے پھلکے ہیں کہ گاڑی کشتی کی طرح پانی پر تیرتی سی محسوس ہوتی ہے۔ شہر جاتا ہوں تو لوگ حیرانی اور خوشی سے میری طرف دیکھتے ہیں۔ ذرا سی دُلکی چلتا ہوں تو بڑے خوشی سے نعرے مارنے لگتے ہیں بچے تالیاں بجاتے ہیں اور میرا مالک بڑی شان سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے جیسے وہ کسی بہت بڑی کار کا اکیلا مالک ہے جو اس بازار میں نایاب ہو۔ یہ بوجھ بھی بس ذرا کھلے موسم میں ڈھونا پڑتا ہے۔ سردیوں میں تو بس اندر کھڑے رہنا ہوتا ہے اور ساتھی گھوڑوں سے گپ شپ کرنی ہوتی ہے۔ باہر برف میں نہ کھیتی ہو سکتی ہے اور نہ ہی گاڑی چلائی جا سکتی ہے۔ اس لیے لمبی چھٹی مل جاتی ہے۔ بس کھاؤ پیو اور موج اڑاؤ۔ بس ساتھی گھوڑوں کی زبان سمجھنی ذرا مشکل لگتی ہے۔ مگر میں بھی ایک گھاگ ہوں ان کی ہر بات پر یوں مسکراتا ہوں جیسے مجھے سب کچھ سمجھ میں آتا ہو زمانے کے ساتھ چلنے کے لیے تھوڑی اداکاری تو کرنی ہی پڑتی ہے۔

میرے پرانے مالک یہاں بھی پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر اپنی ملکیت جتانے کی کوشش کی ہے مگر میرے مالک نے پیروں پر پانی تک نہیں پڑنے دیا۔ کہا ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ تمہارا گھوڑا ہے کوئی رسید ہے؟ وہ بھلا کیا رسید پیش کرتے۔ ان کی رسید تو میں اٹھا لایا ہوں۔ ایک نہیں کئی۔ میری پیٹھ پر ان کی مار کے نشان

کئی تو مندمل ہو گئے ہیں مگر کچھ ابھی باقی ہیں مگر ڈرتا ہوں کہیں میری فریاد خود ہی میری مصیبت کا کارن نہ بن جائے

چھوڑ یار تجھے کیا پڑی ہے مست رہ۔

میرے پرانے مالکوں نے بھی میرے نئے مالک کے ہاں مال ڈھونے کا کام شروع کر دیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ وہ بھی اب میری طرح گھوڑے ہی بن گئے ہیں۔ بوجھا ڈھوتے ہیں اور مالک کے لہراتے ہوئے آنکھ کے چھانٹے سے ڈرتے ڈھینچوں ڈھینچوں بھاگتے رہتے ہیں۔ میرا کیا ہے میں تو گھوڑا ہوں مگر انہیں بوجھ ڈھوتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ارے بھئی تکلیف ہوتی ہے تو چھوڑ دو اور واپس جاؤ میرے جیسے گھوڑوں کی روزی کیوں کھوٹی کرتے ہو۔

میرے کچھ گھوڑے بھائی اور بھی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ بھی میری طرح گھوڑے ہی لگتے ہیں مگر کہتے سب یہی ہیں کہ وہ وہاں کسی راجہ یا نواب کی سواری میں تھے۔ پانچ کو میرے مالک نے اپنے ہاں پناہ دے دی ہے کچھ اس پاس کے گھروں اور کسانوں کے ہاں ٹک گئے ہیں۔ کبھی کبھی کھیتوں اور پہاڑوں پر چرنے نکلتا ہوں تو ان سے دعا سلام ہو جاتی ہے۔ لگتا ہے سب ہی یہاں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا یہ سلسلہ روزگار قائم رکھیو اور ہمیں نظر بد سے بچائیو۔

اب آپ سے کیا چھپانا شروع شروع میں یہاں کا کام تھوڑا مشکل لگتا تھا یعنی سمجھ نہیں آتا تھا۔ میں مشکل کہہ رہا ہوں۔ بھاری نہیں۔ بس یہ بات ذرا ذہن میں رکھئیے گا۔ ہوتے ہوتے سب ٹھیک ہوتا گیا گھاس کا ذائقہ کچھ اور سا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ بھی اچھی لگنے لگی۔ کچھ ہم بدلے کچھ مختلف رہے۔ گاڑی چل پڑی۔ زندگی کی گاڑیاں تو بیچ کے راستے سے ہی چلا کرتی ہیں نا۔

ایک دن ہمارے پرانے مالکوں نے کہا کہ ہم مختلف قسم کے گھوڑے ہیں اس لیے ہمیں دوسرے گھوڑوں سے الگ رکھا جائے مگر ہمارے مالک نے یہ بات نہیں مانی۔ اسے تو ہم میں کوئی بہت بڑا اختلاف نظر نہیں آیا وہ کیا کرتے بچارے چپ مار گئے۔

دکھ سکھ تو رب نے ہر جاندار کے ساتھ رکھا ہے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک بار ہم بیمار پڑ گئے نجانے یہ کیسی بیماری تھی کہ جو صرف ہمارے ہی بھائیوں تک محدود رہی۔ بس آنکھوں سے پانی بہتا جاتا تھا رکتا ہی نہیں تھا ہمارے مالکوں نے ہمیں دوسرے گھوڑوں سے الگ ایک اور اصطبل میں رکھ دیا اور اپنے طور پر علاج کرنے لگے مگر ہمیں کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ ہم خود حیران کہ کیا کریں۔ کہاں جائیں مگر یقین کی ایک چمک سی دل میں موجود کہ چند روز کا دکھ ہے آپ ہی آپ دور ہو جائے گا۔

ہمارے پرانے مالکوں کو بہانہ ہاتھ لگا۔ بولے: "دیکھا ہم نہ کہتے تھے کہ یہ مختلف قسم کے گھوڑے ہیں اب آپ کو انہیں الگ رکھنا ہی پڑا نا۔ بہتر یہی ہے کہ ان کے لیے ایک الگ اصطبل منظور کیجیے"

" اور ہمیں ان کا دارو غہ اسپاں بنا دیجئے" یہ بات دارو غہ اسپاں والی اللہ کے دل میں تھی مگر ہم تاڑ ہی گئے

آخر آدھی زندگی ان ہی کے ساتھ ہی تو گذاری تھی۔
ہمارا مالک بولا۔ ہم تو اپنے ہاں ہر بیمار گھوڑے کو الگ ہی رکھا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہو جائیں گے تو پھر سب کو ایک ساتھ رکھ دیں گے۔
ہمارے پرانے مالک بچارے کیا کرتے۔ بس چپ مار گئے۔ ادھر ہماری بیماری زور پکڑنے لگی ادھر ہمارا مالک گھبرایا پرانے مالکوں نے پھر کہا۔ دیکھا۔ ہم نہ کہتے تھے؟
مگر خود ہمیں پتہ تھا کہ یہ وقتی بیماری ہے موسم بدلتے ہی اپنے آپ دور ہو جائے گی۔ اسی بیچ ہمارے پرانے مالک جانے کہاں سے جھوٹے سارٹیفکیٹ لاکر خود کو "گھوڑا اسپیشلسٹ" ظاہر کرنے لگے اور مالک اور ہماری خیر خواہی کے بہانے ہمیں الگ اور اپنی زیر نگرانی رکھنے کا مطالبہ کرنے لگے ہیں۔
ہمارا مالک ان کے مطالبات پر غور کر رہا ہے۔ اور ہم سوچ رہے ہیں کہ ہم اسے کیسے سمجھائیں۔ کہ یہ لوگ کچھ بھی سپیشلسٹ نہیں محض ہماری طرح کے ہی گھوڑے ہیں اگر یہ سپیشلسٹ ہوتے تو ان کی پریکٹس کا میدان تو وہاں زیادہ وسیع تھا جہاں سے یہ اور ہم لوگ آئے ہیں۔ بہر حال زیادہ تعداد ہم جیسے گھوڑوں کی وہیں ہی تو رہتی ہے۔
خدایا تو تو سب کچھ جانتا ہے ہمیں ان گھوڑا سپیشلسٹوں سے محفوظ رکھیو۔ ہماری بولی ہمارے مالک کو سمجھ آتی تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ اب ہم یہ سب اُسے کیسے سمجھائیں ہم تو گھوڑے ہیں۔

(۲)

میں تو گھوڑا ہوں اور گھوڑے کا کام کرتے ہوئے مجھے کچھ برا تھوڑے ہی لگے گا۔ ہاں گھوڑے سے گدھے کا کام لیا جائے تو دکھ تو ہوگا ہی۔

جب میں وہاں سے بھاگا تھا تو میں سمجھا تھا کہ میرے دکھوں کا اَنت ہو گیا۔ میں ناشکرا نہیں ہوں۔ واقعی میرے وہاں کے کئی دکھ ختم ہو گئے۔ دراصل وہ دکھ یہاں تھے ہی نہیں۔ وہ تو وہیں پیچھے ہی رہ گئے تھے۔
یہاں آکر وہاں کے دکھوں سے تو چھٹکارہ مل گیا مگر یہاں اور قسم کے دکھ جاگ اُٹھے۔ یہ کیسے دکھ ہیں جن کا پہلے مجھے احساس تک نہ تھا مگر دور کہیں وہ میرے ہی ذہن کے ڈھکے چھپے کونے میں دُبکے پڑے تھے۔
بات یہ ہے کہ اب جبکہ یہاں رہتے ہوئے مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ مجھے کئی نئی باتوں کی جانکاری ہوئی ہے۔ پہلے میں ہر سمجھی یا نا سمجھی بات پر مسکراتا تھا، سر ہلاتا تھا اور اداکاری کرتا تھا۔ بھائی کوئی آپ کو گالیاں بھی دے رہا ہو اور بات آپ کو سمجھ نہ آئے تو آپ ہنس سکتے ہیں مگر سمجھ آجانے کے بعد منہ توڑ جواب آپ بھلے ہی نہ دے سکیں مگر کم از کم مسکرا تو نہیں سکتے۔ سیدھی سی بات ہے۔ اتنا عرصہ یہاں رہنے کے بعد اب میں ساتھی گھوڑوں کی زبان سمجھنے لگا ہوں۔ بس ساری بات یہیں سے بگڑتی ہے۔ میرے دکھوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

باہر جاکر دوسرے گھوڑوں سے ملنے کے بعد مجھے کئی باتوں کے سننے کا موقعہ ملا ہے۔ ہم بڑے گھوڑے ہیں۔ ہمارا رنگ صاف ہے۔ جلد سنہری ہے۔ بال گھنے ہیں۔ نسلیں بڑی اچھی ہیں۔ ہم نے بڑی بڑی جنگوں میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں۔ ہمارے بزرگ ڈربی کی ریسز دوڑتے اور جیتتے رہے ہیں۔ ہم ہیک (Hack) ہیں۔ ہنٹر (Hunter) ہیں۔ ہیکنی (Hackney) ہیں۔ ہم نے ریس کورسز کے فرنچ ٹراٹرز کو جنم دیا ہے۔ ہمارے وطن عالیشان ہیں۔ جانے کون کون سے ملکوں کے وہ لوگ نام لیتے ہیں مگر اُن ملکوں کا ذکر وہ بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر گول کر جاتے ہیں جن کے گھوڑوں کے ملاپ سے گھوڑوں کی کئی نسلوں کو سدھارا گیا ہے اور جنہوں نے کیا سواری، کیا اسپورٹس اور کیا دوڑوں کے مقابلوں میں کمالات فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ فرانس کی تاریخ اب بھی اس بات کی گواہ ہے۔

میں طعنہ نہیں دے رہا ہوں اور نہ ہی طعنہ زنی سے کبھی کوئی بات بنی ہے۔ بات کام کرنے اور کچھ کرکے دکھانے سے بنتی ہے۔ ایک دن میں نے سوچا۔ بھلے گھوڑے! اب کچھ کرکے ہی دکھا۔ اگر تیرے اندر کچھ بات ہوگی تو سامنے آجائے گی ورنہ گھوڑا ہوکر بھی گدھا بنا رہے گا۔ میں گدھا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے گھوڑا بننے اور ڈینگیں مارنے کا کوئی شوق نہ ہوتا مگر دکھ تب ہوتا ہے جب گدھوں کو بھی گھوڑا بنے دیکھتا ہوں تو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ سوچتا ہوں کیا میری آنکھوں کی غیرت مرگئی ہے کہ میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اپنی شناخت نہیں دے سکتا۔

وہ جو میں ہلکے پھلکے پیئوں کی گاڑی کھینچتا ہوں اور جو کشتی کی طرح پانی پر تیرتی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل ایک ایسی گاڑی ہے جس میں ایک گھوڑا لدا ہوا ہوتا ہے۔ میرا فرض ہے اسے گھوڑوں کی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے ریس کورس پہنچانا۔ ایک بار میرے دل نے سوچا کہ میں دوڑ کر نہ دوں اور گھوڑے کو ریس میں لیٹ پہنچا کر اسے دوڑ میں حصہ لینے سے محروم کر دوں مگر پھر میرے ذہن نے مجھے سخت لعنت ملامت کرنی شروع کردی۔ ارے بھلے گھوڑے! اپنی درتھ ہی دکھانی ہے تو کسی مثبت طریقے سے دکھا جو تیرے بھی کام آئے اور تیرے مالک کے لئے بھی مفید ہو۔ تو بس میں ایسے موقعے کی تلاش میں رہنے لگا اور کرنا خدا کا کیا ہوا کہ یہ موقع جلد ہی میرے ہاتھ لگ گیا۔ ہوا یوں کہ میرے مالک اور اس کی بیٹی میں کسی بات پر تکرار ہوگئی۔ دراصل وہ آج کل گھوڑوں پر کئی مشہور مصنفوں کی کتابیں مثلاً گھوڑے، کھیلوں کے بادشاہ' سواری قدم بہ قدم' گھوڑ سواری تصاویریں' ننھے ننھے سوار' گھوڑوں پر کتاب' گھوڑ سواری کے طریقے وغیرہ وغیرہ پڑھ رہی تھی اور کبھی کبھی مجھے باہر گھمانے کے بہلنے لے جاتی تھی تو مجھ پر سواری بھی کر لیا کرتی تھی۔ وہ مجھے کئی قسم کے کھیل تماشے اور چھلانگیں وغیرہ لگانی بھی سکھاتی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں گھوڑوں کے کمالات ہی نہیں سیکھ سکتا تو پھر اور کیا سیکھوں گا۔ بس میں نے اس کا دل خوش کرنے کو بہت کچھ سیکھ لیا۔ آج وہ مجھے کسی مقابلے میں لے جانا چاہتی تھی اور اِدھر میرے مالک کو اچانک ریسز میں شمولیت کی دعوت مل گئی تھی۔ شاید کوئی دوڑنے والا گھوڑا بیمار پڑ گیا تھا یا خدا جانے کیا بات تھی کہ اسے اچانک ہی جانا پڑ گیا۔ باپ بیٹی کی تکرار نے میرے مالک کو کافی لیٹ کر دیا اور جب باہر آکر اس نے چابک لہرا کر مجھے تیز دوڑانا چاہا تو میرے دل

میں کہا مجھے ہاتھ مت لگانا۔ سیدھی طرح چابک ایک طرف دھر دے اور دیکھ کر میں تجھے تیری منزل پر دس منٹ پہلے پہنچاتا ہوں کہ نہیں۔ مالک نے میری چال دیکھی تو اس کے ہاتھ کا چابک ہاتھ میں ہی رہ گیا اور اس کی زبان سے واہ اوئے شیرا اور بلے بلے کے تعریفی الفاظ نکلنے لگے۔ اپنی تعریف سن کر ایک بار تو میرے دل میں غرور کی ایک لہر جاگی مگر میں نے دل کو سمجھا لیا کہ ابھی تو میں اپنے مقصد کے پاس آدھا قدم بھی نہیں پہنچا ہوں اور تو خواہ مخواہ پھولنے لگا ہے۔ قدرت خدا کی۔ اس دن ہمارا گھوڑا ریس میں بری طرح ہار گیا۔ واپس آتے ہوئے میں نے مالک کی اداسی کو نوٹ کر لیا جو آہستہ آہستہ غصے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نہیں جانتا اسے یہ غصہ اپنی بیلی پر تھا، اپنے ہارنے والے گھوڑے پر، یا اپنی قسمت پر۔ مگر میں نے سوچا کہ میں اس کی قسمت بدلنے میں ضرور ایک اچھا پارٹ بحسن و خوبی انجام دے کے دکھاؤں گا۔ واپسی پر جب اس نے چابک لہرایا تو میں نے چال پکڑی اور دکھا دیا کہ چال کیا ہوتی ہے۔ تب قسم خدا کی اگر ریل کا انجن بھی مقابلے پر ہوتا تو اسے بھی ایک قدم آگے نہ جانے دیتا۔

اوپر والے کی نظر سیدھی ہو تو راستے بنتے جاتے ہیں۔ موقعے آتے ہی رہتے ہیں اور میرے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ موقعہ جلد ہی فراہم کر دیا۔ غرور کا سر نیچا۔ بڑی بڑی ڈینگیں مارنے والا اور مجھے اور میرے جیسے دوسرے گھوڑوں کو منہ نہ لگانے والا گھوڑا ایک کے بعد ایک ریس ہارنے لگا مگر نجانے میرے مالک کو کیا مسئلہ درپیش تھا کہ اس نے مجھے نہیں دوڑایا۔ میں ٹھہرا عزت مند گھوڑا۔ میں کیوں منہ چڑھ کر کہتا کہ بھلے آدمی! ایک چانس مجھے بھی دے دیکھ

ہمارے دوڑنے والے گھوڑے کا نام گولڈن ایرو ہے۔ ایک دن گولڈن ایرو نے شام کی ریسز میں حصہ لینا تھا مگر اس دن اس کی طبیعت صبح سے ہی ناساز ہو گئی۔ مالک نے اس کی بہت منتھی چاپی کی۔ ٹانگوں کو سہلایا۔ اس کے جسم پر قسم قسم کے برش رگڑے۔ ہلکی پھلکی ورزشیں کرائیں۔ بڑھیا دوائیاں اور ٹانک دیئے مگر دوپہر تک وہ اور بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ اب تو میرے مالک کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھی چپ کر دیکھ اوپر والا کیا کرتا ہے اور اوپر والے نے جانے کیا اس کی کھوپڑی میں بٹھا دیا کہ اس نے میری منتھی چاپی شروع کر دی۔ اب تک سب کچھ جو اس کے ساتھ کیا تھا، میرے ساتھ کرنا شروع کر دیا۔ اب میں ہوں اور میرا مالک اور اس کے تین نوکر۔ دے سیوا پہ سیوا۔ دے رگڑائی پہ رگڑائی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کر کر سیوا کھا میوہ۔ میں نے کہا بھیا سیوا کا پھل میٹھا ہی ملے گا تجھے۔

جب وہ سب کچھ کر چکا جو اسے کرنا تھا تو اسے اچانک پھر کچھ یاد آ گیا اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر جانے کچھ دیر بعد اسے کیا سوجھی کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور قریب ہی کے کھیتوں سے ایک جڑی بوٹی کے پتے توڑ لایا اور انہیں پیس کر اور ان کا لیپ بنا کر میرے جسم پر تھوپنے لگا۔ اسی بیچ اس نے گھڑی دیکھی تو گھبرا گیا۔ وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے مجھے جلدی جلدی نہلایا اور لیپ دھویا اور گاڑی کی طرف لے چلا۔ راستے میں اصطبل کے ایک کونے میں ایک گھوڑ قد آئینہ لگا ہوا تھا جس میں گھوڑے اپنا منہ دیکھتے تھے۔ میں نے جب اس میں اپنا عکس دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بیچ میں اب ایک مختلف گھوڑا تھا۔ مجھے گاڑی پر چڑھا کر اس نے دروازہ بند کیا اور جب گاڑی

چلی تو ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اب میں گاڑی میں سوار تھا اور میرا ہی کوئی بھائی اسے کھینچ رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا۔ واہ زندگی تیرے رنگ۔

دوڑ کے میدان میں پہلی ہی دوڑ میں میری باری تھی۔ اسلئے ریس کھیلنے والوں کو دکھانے کے لیئے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ میری پیٹھ پر میرا آٹھ نمبر لکھا ہوا کپڑے کا بورڈ سا لگا کر مجھے دوسرے گھوڑوں کے ساتھ ایک چکر میں گھمایا گیا۔ میں نے دیکھا کر جنگلے کے باہر کھڑے لوگ میری پروقار چال دیکھ کر نعرے لگا رہے ہیں۔ مجھے شاباشی دے رہے ہیں۔ میرے نمبر پر ٹکٹیں خرید رہے ہیں۔ پیسہ لگا رہے ہیں اور آٹھ نمبر آٹھ نمبر کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ہمیں ریس کے میدان میں ایک ایک مستطیل خانے میں ٹھہرایا گیا۔ جن پر ہمارے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ کل دس نمبر تھے۔ میں اپنے آٹھویں نمبر کے خانے میں کھڑا تھا۔ پھر ہمارے خانوں کے دروازے ہٹ گئے اور جب میرے جاکی نے ایڑھ لگائی تو میں تیسرے نمبر پر دوڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ پہلوان آج ہار گیا تو مرجائے گا۔ زندگی بھر گدھگی ہی کرنی پڑے گی۔ اگر تجھ میں کچھ بھی گھوڑیائی ہے تو دکھا دے کہ تجھ میں بھی کچھ ہے —— یہ سوچتے ہی میری غیرت ایکدم جاگ اٹھی اور پھر میں نے جو چال پکڑی ہے تو ہوا پیچھے اور میں آگے۔ دوسرے گھوڑوں کو تو میری خاک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی اور باہر سے تو بس یک آپ آٹھ نمبر اور یک اپ گولڈن ایرو اور واہ واہ اور شاباش کے علاوہ اور کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ جب ہم گھر سے چلے تھے تب کالے کالے بادل گھرے ہوئے تھے۔ اب دوڑ کے میدان میں ابھی ہم آدھا فاصلہ ہی طے کر پائے تھے کہ موسلا دھار بارش ہونے لگی حالانکہ کل ہی ریڈیو پر بادلوں کے گھر آنے مگر بارش نہ ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ خیر مجھے کیا۔ کیا بارشوں سے گھوڑے رکتے ہیں یا شہسوار پیچھے ہٹا کرتے ہیں —— نیت صاف تھی۔ ہمت جوان تھی اور سامنے چیلنج تھا۔ میں فرسٹ آ گیا۔ پھر وہ شور مچا کہ آسمان پھٹنے لگا۔ وہ عزت ملی مجھے کہ میرا سینہ خوشی سے پھول گیا۔

تماشا گاہ میں جنتا کے عین درمیان ایک گول گھاس کے خطے کے آس پاس ایک جنگلہ لگا ہوا تھا جس میں جیتنے والے گھوڑے کو بمعہ جاکی لایا جاتا تھا تاکہ حاضرین اپنے فاتح کو قریب سے دیکھ سکیں مجھے وہاں لایا گیا تو بہت شور مچا۔ اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ لوگ خوشی سے چیخ رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ ٹوپیاں ہوا میں اچھال رہے تھے اور میں اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا کہ بھائی اب تیرے دن بدلے۔ کوئی ایک کام کسی ایک کے لیئے رینرو تھوڑے ہی ہو جاتا ہے۔ دوسرے کو موقعہ دیا جائے تو دوسرا بھی اپنی ورتھ دکھا سکتا ہے۔ مگر یہ کیا۔ وہ خوشی کی چیخوں اور نعروں میں غصے کا عنصر کیوں در آیا ہے۔ یہ تو آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ میرے مالک کی آواز بہت اونچی ہے مگر دوسرے لوگوں کی آوازیں اس سے کہیں زیادہ کرخت اور اونچی ہیں۔ کچھ لوگ میری پیٹھ پر ہاتھ پھیر پھیر کر اور ایک کتابچہ دکھا دکھا کر میرے مالک سے تو تو میں میں کر رہے ہیں۔ کچھ الفاظ جو میرے پلے پڑے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

یہ گولڈن ایرو نہیں ہے۔ بارش نے اس کا نقلی رنگ اتار دیا ہے۔ کتابچے میں گولڈن ایرو کا رنگ چمکدار سنہری لکھا ہے۔ اسے اندھا بھی دیکھ کر کہہ سکتا ہے کہ یہ پھیکا سنہری ہے جیسے جڑی بوٹی کے لیپ سے چمکدار سنہری بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت لے دے کے بعد میرے مالک کی آواز دھیمی پڑتی جا رہی ہے اور جج لوگ فیصلہ سنا رہے ہیں جو سیکنڈ آیا ہے اسے فرسٹ کر دیا جائے۔ جو تھرڈ آیا ہے، اسے سیکنڈ اور اسی طرح آگے۔ میں سب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں۔

میں سوچ رہا ہوں۔ میں دوڑایا گیا ہوں اور میں نے دوڑ جیت کر دکھائی ہے۔ اس سے رنگ کا کیا تعلق ہے۔ نسل کا کیا واسطہ ہے۔ مگر میں کس سے کہوں، کیسے کہوں، کون سنے گا۔

علی حیدر ملک
کراچی

بڑھتے فاصلوں کے درمیان

چلتے چلتے ایڑیاں دکھنے لگی ہیں۔ ماں کہتی تھی جب ایڑیاں دکھنے لگیں تو سمجھو کہ سفر ختم ہوا ـــــ لیکن یہ تو پرانا قصہ ہے ماں کی بات بھی پرانا قصہ ہو گئی۔ کیسی ہنسی کی بات ہے۔ ہنستے ہنستے مجھے رونا آ جاتا ہے۔ رونا تو مجھے اس وقت بھی آیا تھا جب میں پہلی بار سفر پر روانہ ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" ـــــ میرے باپ نے اپنی بھاری بلغمی آواز میں پوچھا تھا۔

"سفر پر"۔ بھائیں بھائیں کرتے گھر پر نظر دوڑاتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

"کیا تم نے یقین کر لیا ہے کہ یہ سفر ضروری ہے؟"

"ہاں! ضرورت نے مجھے یقین پر مجبور کر دیا ہے۔"

میرا باپ اپنی انا کی چوٹی پر چڑھ کر خاموش ہو گیا۔

ماں میرے سر پر اپنے آنچل کا سایہ کیے کھڑی رہی۔ اس نے نہ تو مجھے جانے کو کہا نہ رکنے کو ـــــ مگر اس کی ممتا کا آب حیات میرے وجود پر پھوار کی مانند برستا رہا۔

"ماں مجھے اجازت دو" ـــــ میں نے التجا کی۔

اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے لرزتے ہاتھوں سے میرے بازو پر امام ضامن باندھ دیا۔

"پاک پروردگار قدم قدم پر تیری حفاظت کرے" ـــــ اس کے ہونٹوں نے کہا یا نہیں لیکن میرے کانوں نے سنا۔ میرے دل نے بھی۔ میرے دماغ نے بھی ـــــ میرے روئیں روئیں نے :

سفر کی سمتیں تو شاید چار ہی ہیں لیکن جب میں نے پہلا قدم اٹھایا تو محسوس ہوا کہ سمتیں صرف چار نہیں چار سو ہیں یا چار ہزار ہیں یا چار لاکھ ہیں ـــــ اور ہر سمت سے آواز آ رہی ہے ـــــ ادھر آؤ ۔ ادھر آؤ ـــــ ادھر

معلوم نہیں وہ کون سی سمت تھی جدھر میں نے پہلے پہل قدم بڑھائے تھے اور بڑھاتا رہا تھا ـــــ کبھی آہستہ کبھی تیز۔ کبھی تیز کبھی آہستہ ۔ یوں ایک سفر میرے اندر جاری تھا اور ایک سفر میرے باہر۔

چلتے چلتے پاؤں تو نہیں تھکے لیکن ایسا محسوس ہوا کہ جسم سے توانائی کا ذخیرہ ختم ہونے لگا ہے ـــــ چال سست پڑنے لگی ۔ آنتیں ایندھن کی کمی کے باعث جلنے لگیں۔

ماں کہتی تھی ـــــ " سفر پر روانہ ہونے سے پہلے زادِ راہ کا انتظام ضرور کر لینا چاہیئے " ـــــ

مگر میں نے زادِ راہ کا انتظام نہیں کیا تھا سو......

سو میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی ـــــ اردگرد صرف ایک ویرانہ تھا ـــــ اُجاڑ اور بے منظر۔

دور بہت دور گندم کے دانے کی مانند ایک بستی نظر آ رہی تھی ۔ ہانپتا کانپتا ، گرتا پڑتا میں اس بستی تک پہنچا اور ایک گھر کے دروازے پر دستک دی ۔ ایک آدمی نے دروازے سے باہر نکل کر پوچھا ـــــ " کیا ہے ؟"

میری زبان میں نقاہت کے کانٹے چبھے ہوئے تھے ۔ مجھ سے کچھ بولا نہ گیا اور میں نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا ۔ ہاتھ پھیلاتے ہی ایسا لگا کہ میرا قد اچانک بالشت بھر کا رہ گیا ہے ۔

وہ آدمی زیرِ لب مسکرایا اور اندر سے دو روٹیاں لا کر میرے سامنے رکھ دیں ۔

میں نے جلدی جلدی وہ روٹیاں چٹ کر لیں ۔

" مسافر معلوم ہوتے ہو "

" ہاں "

" مگر زادِ راہ تمہارے پاس نہیں " ـــــ اس آدمی نے اپنے لہجے کے تمسخر کو چھپاتے ہوئے کہا ۔

" مجھ سے غلطی ہو گئی یا شاید میرے بزرگوں سے " ـــــ اب میری آنکھوں میں چمک آ گئی تھی اور میں بولنے کے قابل ہو گیا تھا ۔

" زادِ راہ کی ضرورت تو تمہیں آئندہ بھی پڑے گی ۔ کیوں ؟ "

" ہاں ! "

" تو پھر خالی ہاتھ خالی پیٹ زمین ناپنے کی بجائے تم یہیں کوئی کام کیوں نہیں کرتے ؟ "

" کام ؟ کیسا کام ؟ " ـــــ الفاظ اچانک میری زبان سے پھسل گئے ۔

وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے مکان کے عقب میں لے گیا اور ایک بہت بڑے گودام کے آہنی دروازے پر کھڑا ہو کر بولا —— یہ دیکھتے ہو۔ یہ گندم کی بوریاں ہیں۔ تمہیں یہ بوریاں اٹھا اٹھا کر یہاں سے بازار لے جانا ہوں گی۔ بازار کچھ زیادہ دور نہیں کوئی ڈیڑھ کوس ہوگا۔ ہر بوری سے ایک مٹھی گندم بازار پہنچتے ہی تمہیں مل جائے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کتنی بوریاں روز بازار پہنچاتے ہو"

میں راضی ہو گیا اور سورج اُگنے سے ڈوبنے تک بوریاں ڈھونے لگا۔

سورج ڈوبنے کے بعد مزدوری کے گندم لے کر میں اپنی جھونپڑی میں آتا اور رات گئے تک انہیں چکی میں پیستا رہتا۔

جب گندم کا آٹا کستروں میں محفوظ ہو گیا تو ایک دن گودام اور بازار کے درمیان میں نے محسوس کیا کہ میری چال سست پڑنے لگی ہے۔ اس دن میں نے معمول سے کم پھیرے لگائے —— پھر اکثر ایسا ہونے لگا۔

مجھے محسوس ہوتا کہ پورا بدن ٹوٹ رہا ہے اور رگوں میں دورانِ خون سے بھی زیادہ تیزی سے چیونٹیاں دوڑ رہی ہیں۔

طبیعت بہت اچاٹ ہو گئی تو ایک دن میں گودام جانے کے بجائے بستی سے باہر نکل گیا اور چلتا رہا —— چلتا رہا ......

"دو گھونٹ پانی پلا دو" —— کنوئیں سے پانی بھرتی ہوئی عورت کے سامنے ہاتھوں کی اوک بناتے ہوئے میں نے درخواست کی۔

پانی پی کر جب میں نے آستین سے اپنا منہ پوچھ لیا تو اس عورت نے کھنکتی آواز میں پوچھا —— "پیاس بجھ گئی ؟"

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے صرف ممنونیت کی نظر سے اسے دیکھا۔

"صرف دو چلو پانی سے پیاس بجھ گئی —— بس ؟" عورت کھِل کھِلا کر ہنسی۔

میرے پورے وجود میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

شام کا جھٹپٹا ہو رہا تھا۔ پرندے جوڑوں کی شکل میں تیرتے اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا رہے تھے۔

عورت نے گاگر اٹھا کر کمر پر رکھی اور زلفوں کو پیچھے جھٹک کر چلنے لگی۔ وہ چلی تو جیسے زمین بھی اس کے ساتھ چلنے لگی آسمان بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ساری کائنات اس کے ساتھ چلنے لگی۔

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

لذت کے نشے میں سرشار اور کئی دن کئی راتیں میں نے اس عورت کے ساتھ گزاریں تب مجھے محسوس ہوا کہ رگوں میں چیونٹیوں کی دوڑ تو بند ہو گئی ہے مگر سائیں سائیں کرتے ایک بے رنگ بے نام خلا نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ہے —— اور ہر آن کوئی چیز میرے احساس کے بدن میں کانٹے کی طرح چبھتی ہے۔ دکھ کی ایک کالی رات میں نے اس عورت کو سوتا چھوڑا اور اس کی کشش کے دائرے سے باہر آ گیا۔ پو پھٹے جب کہ چڑیاں چہچہاتی ہوئی اپنے آشیانوں سے نکل رہی تھیں۔ میں ایک پہاڑی کے پاس پہنچا۔ پہاڑی کے دامن میں ایک گھنے درخت کے نیچے جس کی بے شمار جڑوں میں یہ معلوم نہ ہوتا تھا کہ اصل جڑ کون سی ہے، میں آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ تب دنیا کی ہر چیز نے مجھ سے پردہ کر لیا۔ صرف روشنی کا ایک ہالہ تھا جو مجھے اپنی آغوش میں لئے

تھا۔ میرے اندر سائیں سائیں کرتا بے رنگ بے نام خلا ابھی دودھیا روشنی سے بھر گیا۔ پھر نہ جانے کتنے چاند کتنے سورج میرے گرد چکر کاٹ کر گزر گئے ـــــ آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ دنیا ابھی ابھی تخلیق ہوئی ہے یا میں نے ہی ابھی ابھی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

ہاتھ پاؤں جھاڑ کر چلنے لگا تو پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ آنتیں جلنے لگیں جیسے تیسے گرتا پڑتا پھر اسی گودام پر پہنچا اور گودام سے بازار، بازار سے گودام کے درمیان گردش کرنے لگا۔

بدن پھر ٹوٹنے لگا۔ رگوں میں چیونٹیاں دورانِ خون سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑنے لگیں ـــــ پھر وہی کنوئیں سے پانی بھرنے والی عورت اور لذت کے نشے میں شرابور دن اور رات۔

پھر وہی سائیں سائیں کرتے بے رنگ، بے نام خلا کی اذیت ناک گرفت اور پہاڑی کے دامن میں گھنے درخت کے نیچے روشنی کا ہالہ ـــــ مگر پھر وہی جلتی ہوئی آنتیں اور گندم کا گودام......

گودام، کنوئیں اور درخت کے درمیان میں مستقل سفر میں ہوں لیکن ان کے درمیان کا فاصلہ کسی طرح کم نہیں ہوتا بلکہ روز بروز ایسا لگتا ہے کہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

چلتے چلتے پاؤں کی ایڑیاں دکھنے لگی ہیں۔ ماں کہتی تھی ایڑیاں دکھنے لگیں تو سمجھو کہ سفر ختم ہوا ـــــ

مگر؟

فہیم اعظمی
ریاض ۔ سعودی عرب

ڈرائنگ روم

حربی کو جب میں نے ڈرائنگ روم کی باتیں کرتے سُنیں تو مجھے اپنی اور اُس کی زندگی میں زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔ کوٹھری اور بیٹھک اور دیوان خانہ اور پھر ڈرائنگ روم اور ان تمام خانوں نے ترقی کی ہے۔ کوٹھری کمرہ بن چکی اور اب پرولتاریت کے ساتھ بھی اسکا کوئی رشتہ نہیں رہا۔ بیٹھک جس کا تعلق وسطی طبقہ کے گلّے سے تھا شاید اب بھی استعمال ہوتی ہے لیکن ڈرائنگ روم کی رفعت پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنی افادیت کھودی ہے اور دیوان تو ایسا لفظ ہے جس کے بہت سے معنی ہیں اور بغیر سیاق و سباق کے اس کا سمجھ میں آنا بھی مشکل ہے اور لبورژوا اور فیوڈل تہذیب کے زوال نے اس کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی ہے اور اب تو نہ کوئی اپنے شعری مجموعے کو دیوان کہتا ہے اور نہ ریونیو آفیسر کو دیوان صاحب۔ اور حجرے کے ساتھ تو روحانیت اس طرح منسلک ہوگئی ہے کہ معمولی آدمی کی کہانی میں اُس کا نام بھی نہیں آتا۔ رہ سہہ کے ایک ڈرائنگ روم ہے جو ہم دونوں استعمال کرتے ہیں لیکن حربی نے ابھی دیتھ ڈرا نہیں کیا اور اس لیے ہم دونوں کے نظریہ میں فرق ہے۔

اور جب حربی نے مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں مدعو کیا تو میں نے اندر داخل ہونے کے بعد سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ ڈرائنگ روم کے لوازمات میں عام طور سے ایک صوفہ سیٹ ہوتا ہے کیونکہ اس کے بغیر بیٹھک کی ترقی ناممکن ہے۔ اور یہ صوفہ سیٹ حربی نے خرید لیا تھا۔ کچھ کرسیاں

تھیں اور ایک میز جس پر حربی کے کالج کے زمانے کا ایک میلا کچیلا کپ رکھا تھا جسے وہ انٹر کالجیٹ ڈبیٹ میں جیت کر لایا تھا۔

میں نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کوئی تصویر نہیں تھی اور میں بغیر تصویر والے ڈرائنگ روم کو ڈرائنگ روم نہیں سمجھتا کیوں کہ میرے نزدیک تصویر اور ڈرائنگ روم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف لینس مانع آتا ہے اور اس میں سے نکلا ہوا روپ بھی ڈرائنگ روم کا محتاج ہوتا ہے ورنہ اصلی روپ تو نگیٹو میں ہوتا ہے لیکن منطقی ڈرائنگ روم میں اُس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ حربی میرا بے تکلف دوست تھا۔ میں نے اس سے کہہ ہی دیا۔

"تمہارے کمرے میں کوئی ڈرائنگ تو ہے نہیں"۔

اور حربی نے مجھے غور سے دیکھا جیسے وہ میری بات نہ سمجھا ہو۔

"ڈرائنگ بھئی۔ تصویر۔ کچھ نہیں تو جمیل کا اینٹی آرٹ لٹکا دیا ہوتا۔ وہ خوفناک سہی لیکن اوریجنل تو ہے"۔

"ہاں تصویر تو نہیں ہے"۔

"تو پھر اسے ڈرائنگ روم کیوں کہتے ہو؟"

حربی نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر سر نیچا کیا۔ پھر زیرِ لب مسکرایا اور پھر مجھے دیکھا اور خاموش رہا۔

اور حربی کے سامنے بہت سی ڈرائنگ تھی اور بہت سے رنگ اور بہت سے خطوط داخلی اور خارجی۔ دائروں کی شکل میں۔ مثلث کی شکل میں۔ قوس قزح کے رُوپ میں اور سستے کنویس پر پھیلے ہوئے بے ہنگم رنگوں کی شکل میں اور وہ ان سب سے گزر کر آیا تھا اور ایک دائرے سے دوسرے دائرے میں بھاگتا رہا اور ہر دائرہ اژدہے کی طرح بَل کھاتا ہوا اُس کی ہڈیوں کو توڑنے کی فکر میں تھا اور وہ چیختا رہا لیکن شکاری کتوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا اور اس کے مکان کے چاروں طرف جو پہاڑیاں تھیں اُن پر شکاری کُتے پالنے والے رہتے تھے اور وہ طرح طرح کے رُوپ دھارتے تھے۔ قارون کا، فرعون کا، یاجوج کا، کاہن کا، راہب کا، جُوڈا کا، ہرقُل کا۔ لیکن کُتے سبھی پالتے تھے اور دائرے سبھی بناتے تھے اور دائرے میں ان کی قائم کی ہوئی دنیا ہوتی تھی۔ ہنستی کھیلتی۔ قہقہے لگاتی۔ ارادی اور شعوری اور منطقی۔ ورنہ دائرے کے چاروں طرف کھڑے ہوئے شکاری کتوں کی غراہٹ اور تلملاہٹ اور گھُرکی اور دھمکی کے سائے اور سپرا گو کے ہوتے ہوئے فطری برجستگی

کہاں قائم رہ سکتی ہے۔ اور اگر کوئی دائرے سے نکلتا تھا تو کہاں، کب اور کیسے کے مثلث کی انیوں پر پڑا رہتا تھا اور پھر اس کی ٹانگیں جواب دے دیتی تھیں اور وہ دائرے میں بیٹھ کر شکاری کتوں کی سرخ آنکھیں دیکھتا رہتا تھا اور دوسرے لوگ بھی دوڑتے دوڑتے تھک چکے تھے اور دائرے میں اپنے کو محفوظ پا کر ایک دوسرے کا منہ چڑھاتے تھے اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔ اب یہی تھکے ہارے ہوئے لوگ حرب کی دنیا میں باقی رہ گئے تھے اور جو مضبوط بانہوں اور طاقت ور ٹانگوں والے تھے وہ غوطہ کرنے چلے گئے تھے۔ سمندر کے کنارے سوتے تھے اور سمندر کا کھارا پانی پی کر اپنی عقلی رَو کو صرف ایک ٹریک پر لگا دیتے تھے اور جو ابھی سمندر تک نہیں پہنچے تھے وہ کیو میں کھڑے ہوئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے تھے اور براہِ راست یا بالواسطہ اپنا رابطہ غوطہ خوروں سے قائم رکھتے تھے اور دائرے میں خواب آور گولیاں کھا کر کتوں کے بھونکنے سے غافل رہتے تھے۔

اور شکاری کتوں کی یلغار میں بہت سی پہاڑیوں کے دامن میں بنے ہوئے مکان تباہ ہو گئے تھے اور دائرہ توڑنے والوں کو کتے چیر پھاڑ کر کھا گئے تھے۔ ڈھلوان پر کھڑے ہوئے گنے چنے مجاہد چھاتیوں سے جہاد کر رہے تھے اور پہاڑیوں کے دوسری طرف والے لفظوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ اور آرتھر کوئیسلر پکار رہا تھا

"جنگیں الفاظ سے لڑی جاتی ہیں۔۔ الفاظ آدمیوں کے سب سے خطرناک ہتھیار ہیں۔ اور الفاظ ایٹم بم سے زیادہ تباہ کُن ہیں۔"

لیکن کوئیسلر تو ننگے الفاظ کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ یہ الفاظ تو مہذّب تھے اور جامہ زیب تھے۔ اور محفوظ فصیلوں سے نکلتے تھے اور پھر ٹی وی، ریڈیو، سیاروں اور کاغذوں میں جھید کرتے تھے اور اطراف کے لوگ صحن میں بیٹھے جشن منا رہے تھے اور واہ واہ کے آنسو بہا رہے تھے اور ایک دوسرے کے گلے میں ہار پہنا رہے تھے اور بے گھروں کو گھروں سے نکالنے والا آزادی اور سخاوت کے بڑے بھگوان سے نائٹ ہُڈ حاصل کر رہا تھا۔ جلی ہوئی لاشیں اور نوچے ہوئے بدن پہاڑی کے دامن میں پڑے تھے اور گرجاؤں اور مندروں کے گھنٹے بج رہے تھے اور مسجد کی اذانیں کھوئے ہوئے شخص کو مٹی میں ملانے کیلئے کوّوں کو پکار رہی تھیں اور قابیل جام جم میں دنیا کا نقشہ دیکھ رہا تھا۔

لیکن حربی وستھو ڈرا کرنا پاپ سمجھتا تھا اور ایک دائرے سے دوسرے دائرے پر بھاگ رہا تھا اور پھر ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر پہاڑوں کے بیچ سے نکلنے والی سورج کی کرنوں کو دیکھتا تھا اور یہ کرنیں ایک خوبصورت پیکر میں ڈھل جاتی تھیں اور دھنک کے رنگ میں رنگی ہوئی ایک لڑکی اس کی

طرف بھاگتی ہوئی آتی تھی اور اُس کے آنے سے ساری فضا معطّر ہو جاتی تھی اور رات کی رانی اپنی زُلفیں نیچے کر کے اُسے سلام کرتی تھی اور کُتّے اپنا منہ دوسری طرف کر کے دھیرے دھیرے غرّاتے رہتے تھے اور حربی کے لیے یہی زندگی تھی اور اسی سے اسے اپنے وجود کا یقین ہوتا تھا۔ اور آج جب وہ آئی تو جوزف کونراد اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے حربی سے پوچھا۔

"ڈرتے ہو؟"

"ہاں۔ میں محدود ہوں اور کُتّے لامحدود۔"

اور جوزف کونراد نے کہا۔

"ڈر ہی تو وہ چیز ہے جو تمہارے وجود کے ساتھ ہمیشہ رہتا ہے۔ تمہاری محبت، تمہاری نفرت، تمہارے احساسات، تمہاری جُستجو، تمہاری مایوسی، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مگر ڈر باقی رہے گا جب تک کہ تم آخری سانس لے کر سرد نہیں ہو جاتے۔ پھر ڈر سے کیا ڈرنا۔ اس سے تو مانوس ہو جانا چاہیئے۔"

اور لڑکی نے اپنی باہیں حربی کے گلے میں ڈال دیں اور بولی۔

"اب بھی ڈرتے ہو؟"

"نہیں اس لمحہ نہیں۔"

"پھر انتظار کرو۔"

اور یہ کہہ کر لڑکی چلی گئی۔ پھر آنے کا وعدہ کر کے اور ڈر واپس آ گیا اور کُتّے اپنے منہ حربی کی طرف کر کے پھر بھونکنے لگے اور اب اُسے وِہتھ ڈرا کرنا پڑا۔ اپنے ڈرائنگ روم میں اور اس کے بہت سے ساتھی وِہتھ ڈرا کر کے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ فی الحال یہی ایک محفوظ مقام تھا جہاں کُتّے نہیں آتے تھے اور حربی کے ڈرائنگ روم میں تو سب کچھ ہوتا تھا۔ بچّے ہوتے تھے۔ جوان ہوتے تھے، بوڑھے ہوتے تھے اور زندگی کے یہ تمام فیز آن کی آن میں گزر جاتے تھے۔ صرف کنڈیشننگ کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ ساری کنڈیشننگ سالڈ اور سیّال نکوٹین کے ذمے تھی۔ اور پھر حربی کے ڈرائنگ روم میں جوالامکھی پھٹ کر اپنے قلب کی آگ اور راکھ اُگلنے لگتا تھا۔

"یہ شکاری کُتوں والا جوالو ریسٹ پر رہتا ہے مکان نہیں بدلے گا؟"

"ان کے شکاری کُتّے کیا کھاتے ہیں؟ نسل بڑھتی جا رہی ہے۔"

"مکان بنانے سے پہلے نہیں سوچا کہ یہاں تو زیادہ اصلی نسل کے شکاری کُتّے ہوتے ہیں یا پھر گیدڑ۔"

"ایسے کلمات نہیں بولتے۔ ایسے الفاظ نہیں لکھتے۔ ایسی باتیں نہیں سوچتے۔ ایسے کپڑے نہیں پہنتے۔ یہ اُنگلی نہیں دکھاتے۔ یہ کلمے کی اُنگلی ہے۔"

"رَبِّ اشْرَحْ لِی صَدْرِی ٥ وَحْلُلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِی ٥ یَفْقَهُوْا قَوْلِی ٥ صدق اللہ العظیم۔"

"آج ریبیز کے کتنے انجکشن لگائے گئے؟"

"میکسکو والے سارا تیل پی گئے۔"

"کارل مارکس نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ یہ اقتصادی نظام نہیں چلے گا۔"

"ابھی ابھی تو سیٹھوں کا سایہ ہے۔ پے لگی مہاراج۔"

"اب حق اور فرض میں کوئی فرق نہیں۔ سارا حق ہمارا سارا فرض تمہارا۔ ہاتھ ملاؤ۔"

"ادب اور آستین۔ لاٹھی اور لٹریچر۔ بس کئی کالموں کے لیے مواد تیار ہے۔"

"وَاِذَا رَاَیْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ یَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ط یَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَیْحَةٍ عَلَیْهِمْ ٥ (صدق اللہ العظیم)

"اور حقوق العباد۔ ہیومن رائٹس؟"

"مگر ہیومن کون ہے؟ ہیومن تو صرف وہ کُتّے ہیں جو باہر کھڑے غرّا رہے ہیں۔"

"اور تم مجھے دوشی ٹھہراتے ہو تو سنو۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ ہے اور لاشریک ہے۔"

"اور آخری بشیر منذر نے دین کو مکمل کر دیا۔ اب لوگ آہورا مزدا اور اہرمن کو اچھی طرح پہچان گئے۔ اب کسی بھجوانے والے کی ضرورت نہیں اور اب آدم کو کسی درخت کے قریب جانے کے لیے کوئی نہیں کہے گا۔ وہ امرت اور زہر کو جانتا ہے اور آزاد ہے۔"

"پھر دانشور کیوں نہیں توڑتے۔ کُتّے کیوں نہیں ہٹاتے۔ مکان کیوں نہیں بدلتے پہاڑیاں کیوں نہیں گراتے؟"

"چُپ رہو۔ ادر کانی چلے گی۔ یہ لو سگریٹ۔"

اور وہ ڈرائنگ رُوم کے صوفے سے اٹھی اور حربی کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

"مجھے نہ بھولو۔ میں ضرور آؤں گی۔"
اور پھر کسی نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔
"بھئی ایک بات تو ہے۔ یہ سب کتنے وفادار ہیں۔ مگر کیا یہاں بھی گرے فرائیر کی قبر بنے گی۔ اور کیا یہاں بھی ان کے کُتے چودہ برس سال ان کے مقبرے پر بیٹھ کر اس کی حفاظت کریں گے اور پھر ہمیشہ کے لیے سو جائیں گے؟"
"ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا اور وہ تو سمندر پار کی باتیں ہیں۔ ہر جگہ لاگو نہیں ہوتیں۔"
اور حربی سوچنے لگا کہ کانی کا اِسٹاک ختم ہونے والا ہے۔ جیسنے کے بہی تو سہارے ہیں۔ کانی اور ڈرائنگ روم اور عید کی سوئیاں اور بقرعید کا گوشت اور الفاظ کی دکان جس کے پُرانے اِسٹاک کا اب کوئی خریدار نہیں ہے۔ یک بیک اُس نے کہا۔
"چلو حربی چلتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے۔"
"مگر باقی تو چلے گئے۔"
"ہوتے بھی تو کیا کرتے۔ وہ تو بھگوڑے ہیں۔ دائرہ پار ہی نہیں کر سکتے۔"
"تو میں کیسے چلوں، وہ کُتے!"
"وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ وہ مجھے کچھ نہیں کہتے تمہاری طرح وہ بھی میرا انتظار کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ میں آؤں گی۔"
اور حربی اس کے ساتھ ہو لیا۔ دائرہ پار کرتا ہوا پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ کتوں نے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ سورج کی کرنوں کا سامنا نہیں کر سکتے تھے اور صرف بادلوں میں شیر تھے۔ پہاڑی کے اُوپر کُتے پالنے والے کھڑے تھے۔
"یہ کس کو ساتھ لائی ہو؟"
"یہ حربی ہے۔ میرا چاہنے والا۔ میری راہ دیکھتا رہتا ہے۔"
"مگر یہاں کیوں آیا ہے؟ یہاں ہم کسی اور بھونکنے والے کو نہیں آنے دیتے۔"
"یہ نہیں بھونکے گا۔ یہ صرف اپنے ڈرائنگ روم میں بھونکتا ہے۔"
"نہیں یہ پرانا پاپی ہے۔ کُتوں کو بھونکتے دیکھ کر اس کی جبلّت عود کر آئے گی۔ یہ ضرور بھونکے گا۔"
"اچھا تو ایسا کرتے ہیں۔"
اور ایک نے اُس کے منہ پر پلاسٹر لگا دیا اور دوسرے نے اُس کا ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔"

اور حربی صرف دیکھتا رہا اور سنتا رہا اور گھورتا رہا تھوک گلے سے نکالتا رہا اور نگلتا رہا

اور صبح ہو گئی۔ اذان کی آواز آئی۔ اس نے کہا۔

"چلو نماز پڑھیں۔"

اور حربی نے آنکھوں سے اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا اور پلاسٹر کی طرف اشارہ کیا اور بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا۔

"تو کیا ہوا، تمہیں کچھ بولنے اور پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ امام جو ہے۔ جو پڑھے اُسے سُنتے رہنا۔ اور ہاتھ۔ اس میں کیا حرج ہے۔ بندھے ہوئے تو ہیں۔ آگے یا پیچھے۔ اب چلو۔"

حربی مسجد سے نکلا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کہا۔

"کیا دیکھتے ہو۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ابھی صبح کاذب ہے مگر صبح صادق بھی ہو گی۔"

"مگر کب؟" اُس نے آنکھ کے اشارے سے کہا کیوں کہ اس کے ساکت جسم میں صرف آنکھیں حرکت کر رہی تھیں۔

اور اب حربی کی کہانی ختم ہوتی ہے اور میری کہانی شروع ہوتی ہے اور میرا قلم میرے ساتھ بھاگ رہا ہے۔ الفاظ کی لکیریں بکھیرتا ہوا۔ سب مُبہم الفاظ ہیں۔ صرف ایک جُملہ سمجھ میں آتا ہے اور وہ ہے میری تاریخِ وفات۔

انور خلیل شیخ
ہملٹن - کینیڈا

ببّر شیر

چیرنگ کراس سے گزرتے ہوئے میں نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ پنجاب اسمبلی کے سامنے اس چبوترے پر ڈالی جہاں کسی زمانے میں ملکۂ انگلستان وکٹوریہ کا بُت نصب ہوا کرتا تھا۔ اب یہاں طلائی حروف سے لکھا جانے والا قرآنِ حکیم کا ایک نسخہ بطور نمائش رکھا ہوا ہے۔ ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ اللہ کی کتاب جس میں کوئی شک نہیں جس کی حفاظت کا ذمّہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ بطور نمائش رکھے جانے والے اس نسخے کی حفاظت پر سینے تانے بندوق تھامے چاق و چوبند فوجی مامور ہیں۔ ذرا آگے ہوٹل انڈس (INDUS) شاید واقعات و حالات کے ریلے میں اب بہہ چکا ہے۔ آج کل یہاں ایک بین الاقوامی ہوائی کمپنی کا دفتر ہے جس کے باہر بیرونِ ملک پر تولنے والوں کے ٹھٹ لگے رہتے ہیں۔ کیسینو (CASINO) لارڈز (LORDS) بنا اور اب وہ بھی بند ہوا۔ شاید یہ بھی کسی ہوائی کمپنی یا ٹریول ایجنسی کا مسکن بنے گا۔ بیڈن روڈ کے کونے والا ٹیزان عرصہ ہوا بند ہوا۔ واپڈا ہاؤس بلڈنگ کے سامنے گارڈینیا (GARDENIA) ریستوران پر بھی اب خاک سی اُڑ رہی ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ کے برابر بڑے ڈاک خانے کے گھڑیال کی سوئیاں ایک دوسرے کا تعاقب سا کرتی ہوئی ہر آنے جانے والے کو شاید یہ باور کراتی ہیں کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ کمرشل بلڈنگ کے نکڑ والا سینڈوچ پہلوان پان والا چل بسا۔ پان کی گلوری بنا کر بہ اصرار انتہائی شفقت و خلوص سے خود گاہکوں کے

منہ میں رکھنے والا سینڈو پہلوان۔ ملک الموت کو بھی شاید یہی اڑ کھی اور منفرد ادا بھا گئی۔ ورنہ ہر روز صبح شاہی قلعہ کی سیڑھیوں پر ایک ہی نشست میں سینکڑوں بیٹھکیں لگانے اور ڈنڈ پیلنے والے پہلوان جی یوں جانے والوں میں سے نہ تھے۔

زمزمہ اور کربلا گامے شاہ کی مسافت طے کرتے ہوئے حضرت علی ہجویریؒ المعروف گنج بخش کے روضہ پر حاضری دی۔ وحدہٗ لاشریک کے علاوہ کسی اور کی نگرانی سے بے نیاز روضۂ گنج بخش جہاں پچھلی کئی صدیوں سے فاتحہ خواہوں کے ہجوم اُسی شوق و عقیدت سے اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔ راوی روڈ اور مینارِ پاکستان سے ہوتے ہوئے مصورِ پاکستان علامہ اقبال کے مزار کی راہ لی۔ شاہی قلعہ اور حضوری باغ کے بالمقابل اور بادشاہی مسجد کے پہلو میں یہ محسن ملت ہزاروں من مٹی تلے دبا دنیا و مافیہا سے بے خبر ابدی نیند سو رہا ہے۔ اُس مسلح فوجی سے بھی بے خبر جو مزار کے باہر پہرہ پر متعین ہے۔ یہاں سے فاتحہ خوانی کے بعد براستہ سرکلر روڈ عازم انارکلی ہوا۔ سرکلر روڈ سے تماشہ دکھانیوالے مداری اور قسمت کا حال بتانے والے نجومی اب اٹھائے جا چکے ہیں۔ شاید تماشۂ زیست دیکھنے یا اپنی قسمت آزمانے خود ہی بیرونِ ملک سدھار گئے ہوں۔ لاہوری تانگوں اور ریہڑہ بانوں کی جگہ اب زناٹے بھرتی ہوئی کاروں اور موٹر سکوٹر رکشاؤں نے لے لی ہے۔ مشین نے جانور کیا انسان کو بھی پچھاڑ دیا۔ اور آج کا انسان تو جانوروں سے بھی زیادہ مجبور اور لاچار ہو گیا ہے۔ لیکن لاہور بہر حال لاہور ہے جہاں شمع ہر رنگ میں سحر ہونے تک جلتی ہے جس کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی کوئی اجنبی، اجنبی نہیں رہتا۔ جس کے شہریوں کے کشادہ سینے ہر مہمان کو سمو لینے کے لیے منتظر رہتے ہیں اور جن کے دلوں میں پیار کا "راوی" ہر دم موجزن رہتا ہے۔ قرار دادِ پاکستان کا میزبان دو شہنشاہوں اور ایک ملکہ کی آخری آرام گاہ داتا کی نگری شہر لاہور۔ علی الصبح حلوائی کی دکان پر کھڑے کھڑے تازہ پوری حلوہ سے ناشتہ کرنے والوں، کسی کونے کھدرے میں کھڑے گرم گرم حلیم اور چٹ پٹے نان کبابوں کا مزہ لینے والوں، فرطِ مسرت سے بے قابو ہو کر سینما ہال میں بے اختیار خوشی کا نعرہ لگا دینے والے زندہ دلوں کا شہر لاہور۔ ہم سب کا لاہور جو پاکستان کا دل ہے اور جس کی محبت سے کیا اپنے کیا غیر سب ہی سرشار ہیں۔

انارکلی میں بخشی مارکیٹ کے سامنے والی گلی کے موڑ پر ایک تنومند کسرتی بدن کا دیہاتی دونوں بغلوں میں کتے کے پلے دبائے "لے لو جی ببر شیر۔ لے لو جی ببر شیر" کی صدا نہ جانے کب سے لگا رہا تھا۔ ایک راہگیر چلتے چلتے اچانک رک گیا اور ان پلّوں کو بغور دیکھنے لگا اور پھر اُس دیہاتی سے یوں گویا ہوا۔

"یہ کیسے شیر ہیں جو نہ ہلتے جُلتے ہیں اور نہ ہی کچھ بولتے ہیں۔"

" انہیں ہونگ پلار کھی ہے۔" قریب ہی ایک دکاندار نے گلی میں بوری جھاڑتے ہوئے آوازہ کسا۔ ساتھ ہی فروٹ جوس کی دکان کے باہر غٹ غٹ تازہ جوس پیتے ہوئے ایک فربہ اندام خاتون کو دکاندار کی اس طرح بوری جھاڑنے والی حرکت بہت بُری لگی اور اُس نے جھٹ سے دوپٹے کا پلو اپنی ناک پر رکھ لیا۔

دکاندار کی بات سُنتے ہی کتوں کے مالک نے فوری دفاع کیا۔" نہیں بادشاہو یہ تو اس وقت اپنے مالک کے کلیجے سے لگے ہیں اسی لیے خاموش ہیں۔ بڑی اونچی نسل ہے بالکل ببر شیر۔" راہگیر نے کچھ سوچ کر دونوں پلّے اپنے ہاتھوں میں لے لیئے اور بڑے پیار سے انہیں "پچ پچ" کرنے لگا۔ مالک سے اجنبی ہاتھوں میں آنے کے باوجود پلّوں کی ظاہری حالت میں کوئی نمایاں فرق نہ آیا اور وہ اسی طرح آنکھیں موندے گُم سُم سے تھے۔ دیہاتی بدستور کہے چلا جا رہا تھا" ببر شیر ہیں یہ ببر شیر۔" راہگیر نے جو ان" سوتے ہوئے شیروں" سے قطعاً متاثر نہ ہوا تھا انہیں مالک کو لوٹاتے ہوئے مایوسی کے عالم میں کہا۔" ہوں گے ببر شیر مگر فی الحال سوئے ہوئے ہیں۔" دیہاتی کچھ نہ بولا اور اسی طرح" لے لو جی ببر شیر لے لو جی ببر شیر کی صدا لگانے لگا۔

انار کلی سے باہر نکل کر میں ایک کتابوں کی دکان میں جا گھسا۔ ایک لمبی فہرست میرے ہاتھ میں تھی۔" کیا آپ کے پاس پاکستان کے قومی لیڈروں کی تصاویر ہیں" ایک خوش پوش نوجوان انتہائی شستہ لہجے میں دکاندار سے مخاطب تھا۔

" جی ہاں۔" دکاندار نے جواب دیا۔" قائدِاعظم کی ہے ایوب خان مرحوم کی ہے اور .... کی ہے۔" دکاندار کا لہجہ کچھ مدھم ہو گیا تھا۔

"کس کی ؟" نوجوان تیرا نام اچھی طرح نہ سُن سکا تھا۔

" .... کی۔" دکاندار کا گلا نہ جانے کیوں رُندھا ہوا سا تھا۔

" مجھے اُس .... کی تصویر نہیں چاہیے۔" نوجوان اچانک غیر شائستہ ہو گیا اور وہ غصّہ سے جھنایا ہوا دکان سے باہر نکل گیا۔

کتابوں کا ایک بڑا بلندہ ہاتھوں میں تھامے چائے پینے کے خیال سے میں قریب کے ایک ریستوران میں داخل ہوا۔ ایک خالی میز پا کر میں نے کتابیں اُس پر رکھیں اور ویٹر سے چائے لانے کے لیے کہا۔" اگر آپ اسکول ٹیچر نہیں تو غالباً کتابوں کے سیلز مین ہیں۔" سوال کرنے والے کی اچانک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دائیں ہاتھ میری میز سے ملحق میز پر ایک صاحب بڑی

بے تکلفی سے بغیر اجازت طلب کیے میری کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب تھے۔
"نہیں جناب نہ تو میں اسکول ٹیچر ہوں اور نہ ہی کتابوں کا سیلز مین۔" میں نے جواب دیا۔
"تو پھر اتنی ڈھیر ساری کتابوں کا کیا کریں گے؟ کیا شغل ہے آپ کا؟" اُس نے ایک ہی سانس میں دو سوال کر دیئے۔
"میں پاکستان سے باہر مقیم ہوں اور آج کل یہاں چھٹیوں پر آیا ہوں۔ یہ کتابیں ذاتی مطالعے کے لیے ہیں۔" میں نے بات کو مختصر کرنا چاہا۔
"خوش کیتا ای۔" وہ اچانک خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ "تعجب ہے کہ آپ چھٹیوں پر پاکستان آتے ہیں۔ یہاں تو ہر شخص ملک سے باہر جانے کی فکر میں ہے۔ یہ جو لوگ اپنی مرضی سے باہر ملکوں میں بس گئے ہیں آخر کون سی چیز ہے جو انہیں بار بار یہاں واپس کھینچ لاتی ہے؟" اُس نے سوال کیا۔
مجھے اس کے اس طرح کے طرزِ گفتگو سے تعجب تو ضرور ہوا لیکن میں نے قدرے متانت سے جواب دیا۔ "پاکستان میں عزیز و اقارب، دوست و احباب اور سب سے بڑھ کر وطن کی محبت جس کا شدید احساس وطن سے باہر رہ کر ہی ہوتا ہے۔"
"خوش کیتا ای۔" ایک بار پھر اُس نے اپنے خوش کن ردِ عمل کا فوری اظہار کیا مگر میں یہ بات اب پورے طور پر سمجھ گیا تھا کہ اُسے بات بے بات "خوش کیتا ای" کہنے کی عادت ہے۔ "لیکن یہ سمجھ نہیں آتا..." اُس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا کہ باہر کے ملکوں میں مقیم لوگوں کو جو پاکستان سے باہر رہنے کے سبب ایک طرح سے یہاں کے معاشرہ اور مسائل سے لاتعلق سے ہو گئے ہیں، یہاں کے اندرونی مسائل سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور اُنہیں پاکستان کا اتنا فکر کیوں لاحق رہتا ہے؟"
"اگر یہ جاننا ہو تو غمِ روزگار اور فکرِ معاش کی تلاش میں سرگرداں بیرونی ممالک میں مقیم اپنے بچھڑے ہوئے ہم وطنوں کی نم دار آنکھوں میں جھانک کر دیکھیے کہ انہیں پاکستان کتنا عزیز ہے۔ پاکستان کی حدود تو اب پاکستان سے باہر نکل کر مشرقِ وسطیٰ، یورپ، سکینڈے نیویا بلکہ شمالی امریکہ تک پھیل گئی ہیں۔ جہاں انتہائی محبِ وطن پاکستانی آباد ہیں اور جو اسی شخص سے جانے پہچانے جاتے ہیں لہٰذا اپنے ماں جایوں سے وابستگی اور اپنے آبائی وطن کا فکر ایک قدرتی امر ہے۔" میں اب اُس کے اس طرح بال کی کھال نکالنے کے اندازِ گفتگو سے اُکتا گیا تھا۔
"اگر محبِ وطن پاکستانی پاکستان سے باہر آباد ہو گئے ہیں تو پھر آپ کے خیال میں یہاں پاکستان میں کون آباد ہیں؟" اُس کے لہجے سے طنز جھلک رہا تھا۔
"بہتر شیرت" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں تنگ آکر اُٹھنے کی تیاری کرنے لگا۔
"خوش کیتا ای۔" وہ ایک بار پھر جھوم گیا مگر میں اتنے عرصے میں ریستوران سے باہر جا چکا تھا۔

نظمیں

فیض احمد فیض

خواب بسیرا

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حُسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا ممکن ہے سُنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اِک بیر نہ اک مہر نہ اِک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمّت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے

میں خدا سے کیا کہوں؟

قتیل شفائی
لاہور

حضرت عیسےٰؑ کو جب مصلوب کرنے آئے لوگ
تاج کانٹوں کا سجایا اُن کے سر پر
پاؤں اور ہاتھوں میں کیلیں گاڑ دیں
کچھ نے تھوکا اُن کے منہ پر
کچھ نے ان کو گالیاں دیں
جب یہ سارے ظلم اُن پر ہو رہے تھے
آپ نے
آسماں کی سمت دیکھا اور کہا
اے خدا —!
تو انہیں کر دے معاف
ان کو اتنا بھی نہیں معلوم
یہ کیا کر رہے ہیں

اور اب صدیوں کے بعد
میں کہ صرف اک شاعر معتوب ہوں
عیسےٰ نہیں
ایک چوراہے میں سب کے سامنے مصلوب ہوں
میرے درپے بھی برا ماحول ہے
میرے ہاتھوں اور پاؤں میں بھی کیلیں گڑ چکی ہیں
اور میرے منہ پہ تھوکا جا رہا ہے
مجھ کو بھی دی جا رہی ہیں گالیاں
آسماں کی سمت میں بھی دیکھتا ہوں
دیکھتا ہوں — اور دل میں سوچتا ہوں
میں خدا سے کیا کہوں
میں — کہ جو عیسےٰ نہیں

نیّر جہاں
لاس اینجلس

تابہ کے؟

ہم اپنے ذہنوں کے مقتلوں میں
جواں امیدیں حسیں تمنّائیں
قتل کرتے رہے ہیں اب تک —
کہ ہر زمانے کا یہ چلن ہے
وہ بات راہِ سخن نہ پائے
وہ بات لب تک پہنچ نہ جائے
روایتوں کی روش سے ہٹ کر
وہ جس میں جینے کے حوصلے ہوں
وہ جس میں رنگِ حنا ہو شامل
وہ جس میں چاہت کے ذائقے ہوں
جو ملک و ملّت — جو نسل و رنگت
کی سرحدوں سے عظیم تر ہو
بغاوتوں کے علم اٹھائے
بشارتوں کی پیامبر ہو

روایتوں کے عذاب سہہ کر
وہ بات اشکوں میں ڈھل تو جائے
مگر وہ شکلِ سخن نہ دیکھے
مگر وہ رنگِ عمل نہ پائے

ہم اپنے ذہنوں کے مقبروں میں
جواں امیدیں، حسیں تمنائیں
دفن کرتے رہیں گے کب تک !!!

عبدالاحد ساز
بمبئی

آخری دور کے انساں

حشر بپا ہے
دور تلک پھیلے میداں میں گرمی، شور، گھٹن، ہیجان
ہنگامہ سا جاری ہے
ہر اک دور کے لوگوں کے
لاکھوں گروہ استادہ ہیں
اپنے چہروں پر لیے
اپنے اپنے دور کے ان گنت نقوش
سہمی سہمی آنکھوں میں — ایک تجسّس
سانسیں تیز،
دل میں اندیشوں کا ہر دم پیچ و تاب — ہر جنبش میں اضطراب
بے چینی اور انتشار کا عالم ہے!

دور مگر
حشر کے دور تلک پھیلے میداں کی آخری صف میں
حال عجب ہے
کوئی تذبذب ہے نہ ہراس
نفسا نفسی نہ بے چینی
رُکی ہوئی مشینوں کی سی خاموشی ہے
انسانوں کے گروہ کھڑے ہیں
ایسے گویا دھرے ہوئے ہوں

بے حس، ساکت اور جامد
چہرے — بے اظہار، سپاٹ
آہنی پیکر، میکانیکی حُلیے —

بند کُھلی پلکیں
— 'آف' اور 'آن' سوئچ
نتھنے — گیسوں کے دو پائپ
جن سے آکسیجن اندر جایا کرتی تھی
کان کے پردے — مقناطیسی 'ڈرم'
ہونٹ — کہ جیسے ٹیپ رِکارڈر کے اسپیکر
ہاتھوں کی دس اُنگلیاں
— بجلی کے کنڈکٹر
دل کی جگہ 'پاور کنٹرول'
— سُرخ تیل کی سپلائی کے مرکز
بھُورے اور سفید دماغی خلیے
— کمپیوٹر کے خانوں جیسے
جن میں اعصاب کی برقی حرکت سے
مُبہم نقش مُنقّش ہوتے رہتے تھے

ہر اِک کے دائیں / بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کے ناخُن کی 'پن' سے
جُڑا ہوا ہے'
اِک سادہ سا کاغذ
اعمال کا کورا صفحہ
— دونوں کالم خالی
— کوئی گُنہ نہ کوئی ثواب!
نیچے 'کراماً کاتبین' نے بس اتنا سا لِکھا ہے

کوئی عمل تحریر کے قابل تھا ہی نہیں
لکھنے کا کچھ کام نہیں ہوتا تھا
ہم اِن لوہے کے کاندھوں پر بیٹھے اُکتایا کرتے تھے
ہم اِن لوہے کے کاندھوں پر بیٹھے اکتایا کرتے تھے

عرفانہ عزیز
ونی پیگ۔ کینیڈا

سفید پھولوں کی وادیوں میں

سفید پھولوں کی وادیوں میں

وہ شنگرفی صبح کا تبسم
کہ سرمئی شام کی فضا ہو
وہ چشم خورشید کی تجلّی
کہ حسن مہتاب کی ضیا ہو

وہ نجم روشن کی ہوں شعاعیں
کہ رودِ مژگاں کے نرم دھارے

میں چل رہی ہوں ترے خد و خال کے سہارے

سفید پھولوں کی وادیوں میں

وہ نوبہاروں کا سُرخ آنچل
کہ برگ ریزاں کی چاندنی ہو
وہ تیری یادوں کا نرم لہجہ
کہ آبشاروں کی راگنی ہو

صدا مرے نغمہ ریز دل کی
رُکی ہے دریاؤں کے کنارے
میں چل رہی ہوں ترے خد و خال کے سہارے

سفید پھولوں کی وادیوں میں

گداز ہاتھوں کی روشنی کو
چٹکتے غنچے ترس رہے ہیں
ہر ایک دریدہ جگر مہک پر
جفا کے ناوک برس رہے ہیں

فضائے چشم و نظر سے دیکھیں
نگارِ گل کب لہو اتارے

میں چل رہی ہوں ترے خد و خال کے سہارے

سفید پھولوں کی وادیوں میں

وہ قرب کا نور ہو سرِ جاں
کہ فرقتوں کا سیہ اندھیرا
وہ آرزو کا سنہرا موسم
کہ جگمگاتا ہوا سویرا

وہ نیلگوں آسماں کے موتی
کہ دیدۂ نم کے ہوں ستارے

میں چل رہی ہوں ترے خد و خال کے سہارے

سفید پھولوں کی وادیوں میں

وہ درد کی مشعلِ درخشاں
کہ تیرے دامن کی جستجو ہو
وہ نورِ خورشید کا تقدّس
کہ روئے زیبا کی آبرو ہو

تصوّرِ عہد آفریں پر
گہر لبِ مشکبو نے وارے

میں چل رہی ہوں ترے خد و خال کے سہارے

انور احسن صدیقی
کراچی

سوال

کیا تمہاری آنکھیں بھی دیکھتی ہیں وہ منظر
خوابِ آخرِ شب کے نقشِ دھوت کی مانند
جو حصارِ فردا کی پُر غضب فصیلوں پر
میری چشمِ بینا کے سامنے ہویدا ہے؟

کوئی برق سی چمکی، کوئی تیغ لہرائی
شاید اس کے پیچھے ہے کوئی فوجِ نامعلوم
یہ لہو کے چھینٹے ہیں یا شفق کی رعنائی؟
دور افق کے آنگن میں وہ غبار سا کیا ہے؟

یہ ہوا کا جھونکا ہے یا کسی نے سسکی لی؟
بہہ رہی ہے کوئی شے گرم سانس کی مانند
یا یہ سرسراہٹ ہے بے سکوں فضاؤں کی؟
ہے یہ چشمۂ حیواں یا لہو کا دریا ہے؟

آ رہے ہیں وہ کچھ لوگ دست و پا رسن بستہ
اُن کے سر کے زرّیں تاج اس کی ٹھوکروں میں ہیں
منفعل، خجل، مجہول، سرنگوں، دہن بستہ
جس ہجومِ خلقت نے اُن کو گھیر رکھا ہے

اس غضب کی شدّت سے سنگ پگھلے جاتے ہیں
آفتاب نے شاید آسماں پہ کروٹ لی
چاند اور ستاروں کے رنگ پگھلے جاتے ہیں
کھولتا ہوا لاوا ہر طرف برستا ہے۔

اک عقاب سا جھپٹا یا فضا نے پر کھولے
یا کوئی بلا چیخی پا برہنہ سر کھولے
آہنی کواڑوں کی کھڑکھڑائی اک زنجیر
شاید اب درِ توبہ بند ہونے والا ہے۔

رضی مجتبیٰ
پیرس

حکایت

آج کے درد میں ڈوبے ہوئے موسم کا نشاں
گلِ صد چاک سہی شبنم گریاں بھی سہی
مہرِ کم تاب بھی اور صبح پریشاں بھی سہی
اک خموشئ سرِ مجمع یاراں بھی سہی
رقص اک گردِ سرِ کوچۂ جاناں بھی سہی
سایۂ یاس میں خود اپنے دل و جاں بھی سہی
ہم جو لکھیں گے بعنوانِ طرب لکھیں گے
داستاں آج کے ہر درد بھرے لمحے کی
ہم کہ ان ہاتھوں پہ بیعت بھی جنہوں نے کی ہے
جو گلے گھونٹنے نکلے تھے انہی خوابوں کے
جن کی آواز کو چاہا تھا کہ اک روز بنے
سب کے ہونٹوں کی صدا
سب کی نگاہوں کی نوا
ہم کہ اُن لوگوں کی عزت بھی جنہوں نے کی ہے
جن کی نظروں میں ہماری کوئی وقعت ہی نہیں
جن کو جز اپنے کسی اور کی حرمت ہی نہیں

آج کے رنج میں پہلوئے طرب ہے سو یہی
نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھ کھلی
اور ملی
چشمِ بینا کو نئی آگاہی
ہم سے جو بھول ہوئی تھی سو ہوئی
اس کا کیا ذکر کریں
کل کے بارے میں کوئی بات کریں
کام کرنا ہے جواب اس کی شروعات کریں
کل کسی صبحِ درخشاں کی نگاہوں پہ کبھی
اپنی بپتا کی بیاضیں جو کھلیں
گُلِ خنداں سے کہے گی تو سرِ صحنِ چمن
کوئی گلنار کرن
ربطِ فردا سے جنہیں عرصۂ امروز میں ہوں
ان کو افتادِ خزاں
موسمِ مرگ کہاں
بلکہ اک عرصۂ آزارِ نمو پیرا ہے
نو بہاروں کا نیا مژدہ ہے

صلاح الدین محمود
لاہور

معراج

پہلی اُڑان

ہم نے کل
جب آنکھیں موندیں
اونچے اونچے
ہوا میں اڑتے
ہم جیسے اک طائر تھے
دھیمے دھیمے
روشن ہوتے
گم راتوں کا ظاہر تھے

واں سے دیکھا
اک سالم
دریا میں ڈوبے
چاند کو پانی بنتے
بہتی رات کے آئینے میں
شب کو سورج بنتے

واں سے دور
شجر بھی دیکھے
جن کی نم
نازک شاخوں سے
دیکھا
چھاؤں چھنتے

دوسری اُڑان

کل ہم نے اک اونچے تن سے
شجر کی جانب دیکھا
کل ہم نے اک طائر بن کر
دور شجر کو
اُگتے تھمتے، بہتے پھلتے،
تھمتے چلتے دیکھا

کل ہم نے اک تارا بن کر
اک سورج، دو چاند پرے
اک ساگر جلتے دیکھا
پھر ہم نے اک خلا کے خم سے
اک تارا، اندھا بےچارا
اک اجیالا دیکھا،
دو آئینے وا دیکھے
اور دو کو تنہا دیکھا

پھر ہم نے دوہرے تاروں میں
اپنا چہرہ دیکھا

کل ہم نے اک اونچے تن سے
شجر کی جانب دیکھا

ہوا تھی واں
اور ہوا کے تن میں
سمتوں کا چالک تھا
صدا تھی واں
اور صدا کے بن میں
ہر بتیا بالک تھا

پھر مرتی
آوازیں دیکھیں
جیتے آئینوں میں
دریا کے چہرے
خم دیکھے
ساگر کے سینوں میں

اک طائر پھر اڑتا آیا
اونچائی کی چھور
آئینوں میں گا اٹھے
دو بینائی کے مور

ابرار الحسن
آٹوا

دائرے کا عذاب

صفر پہ آئی
وہ سُوئی ۔ وہ سوزنِ تخیّل ۔
جسے فقط سمت کی طلب ہے
جو ناپنا چاہتی ہے لمحوں کے جسم سے فاصلے ابد کے

اے آبشارِ نیاگرا
تیری بیکراں سرگرانیوں سے سفر عیاں ہے
بہاؤ سے سمت ہے ہویدا
میں تیرے ساحل پہ دائرے سے پناہ لینے کو آگیا ہوں

وہ دائرہ جو زماں سے ارفع ، مکاں پہ حاوی
سدا مگن اپنے آپ میں ہے
وہ دائرہ جس کو وقت کی بس یہی ضرورت
کہ آج اور کل کا تفرقہ بھی بہت گراں ہے
وہ دائرہ جو حیات کی آگہی کو لمحوں میں بانٹ کر
مستقیم رستے کا روپ دے کر
سبک روی سے ہنکا رہا ہے
کبھی کبھی خواب سے اُبھر کر
حقیقتِ دائرہ کے جنجال دیکھ کر

سوزنِ تخیّل
صفر پہ رُک کر سفر کا آغاز چاہتی ہے

لکیر اور دائرے کی آپس کی یہ تذبذب
سدا تشنج
یہی ازل کی مخاصمت ہے
لکیر چلتی رہے تو جانے کہاں رُکے گی —
زمیں کی سرحدوں کے باہر
خلا کی لا انتہا حدوں پر —
لکیر چلتی رہے تو شاید زماں کی خفتہ رگوں میں پھر روح لوٹ آئے
سیاہیوں کے غلاف پر اک جواب کی صبح پھیل جائے!

اے آبشارِ نیاگرا
تیری سرپٹکتی، سفر پہ آمادہ برق لہروں کی پستیوں سے
یہ دُھند سی کیسی اُٹھ رہی ہے؟
یہ دُھند، بادل
جو پھر سے برسے گا
دائرے کا عذاب بن کر

خالد اقبال یاسر
اسلام آباد

سفرنامہ - ۱

کڑے عذابوں کی سرزمیں تھی
جہاں سے میرا گزر ہوا تھا
سیاہ جھلسی ہوئی اس آتش فشاں کی مٹی
یہ جلتے سورج کے ساتھ لامختتم سفر میں
عجیب دہشت تھی جس نے مجھ کو جکڑ لیا تھا
قیام کیسا کہ ساتھ دیوار و در نہیں تھے
اُمید اچھے دنوں کی کیسی
کہ سانس کا اعتبار معدوم ہو چکا تھا
مگر مرے نیم جان ہونٹوں پہ
تپتے پاؤں کے آبلوں کے لیے دعا تھی
جنہوں نے اپنے وطن کے کانٹوں کی قدر کرنا سکھا دیا تھا
مجھے مرے گھر کی روکھی سوکھی پہ صبر کرنا سکھا دیا تھا

سفرنامہ - ۲

اے وطن میں نے تیرے لیے
تیری مسکان کی گمشدہ تتلیوں کے لیے
تیری آنکھوں کی بجھتی ہوئی چمنیوں کے لیے
تیرے چہرے کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے لیے
میں نے ہجرت سہی
اپنے آسودہ گھر سے عزیز و اقارب سے، دوری کی وحشت سہی
میں کہ زرخیز مٹی کا
دریاؤں کے میٹھے پانی سے مس ہو کے آتی ہواؤں کا پروردہ تھا
ایک سے موسموں، بے نمو ریگزاروں، سمندر کے تیزابی جھونکوں
میں کھلنے کی خواہش میں ناکام رہتے ہوئے
تیری آغوش میں لوٹ آیا ہوں
پھر بھی نذرانوں میں تری
ایک درہم بھی کیوں میرا حصہ نہیں؟
تیری سیرابیوں میں سے کیوں میرے سوکھے لبوں کے لیے
کوئی جرعہ نہیں
خوانِ نعمت میں تیرے
مرے نام کا کوئی لقمہ نہیں

—

عذرا احمد

مانٹریال

اجنبی شہر

اجنبی شہر نازاں نہ ہو
ہم غریب الوطن، تیرے دامن میں آئے تو ہیں
تیرے عاشق نہیں
جگمگاتی ہے تیری جبیں ہم کو اقرار ہے
تیری رونق سے کب ہم کو انکار ہے
تیرے ماتھے کے برقی ستارے بہت خوبصورت سہی
جانے کیوں ہر قدم پر یہ احساس ہے
اک نئی کار، بنکوں کے قرضے
کیا یہی اپنی میراث ہے؟
اِک خلش دل میں رہتی ہے کیوں
کہ یہ ڈالر ہمارا خدا تو نہیں
اجنبی شہر کیسے بتائیں؟
تیرے دامن کی رنگینیاں دیکھ کر
یاد آتے ہیں کیوں اپنے وہ ہم وطن
جن کے چہرے دھواں، جسم لاغر، خمیدہ کمر، زندگی رائیگاں
اجنبی شہر اب کیا بتائیں
ہم نے کیوں چھوڑ دی، اپنے آنگن کی عسرت زدہ عافیت
اپنے گھر، اپنے موسم، اپنے نغموں کی مستی
تند بادِ مخالف کے جھونکوں سے بچ کر
آ چھُپے تیرے دامن میں ہم
ہم میں ہمت نہیں تھی جو لڑتے
کس کو الزام دیں؟
خود کو، حالات کو، زندگی کی نئی تیز رفتار کو
یا کہ ان کرگسوں کو
جو سیاست کی گدی پہ ہیں جلوہ گر
اس لیے اجنبی شہر نازاں نہ ہو
تیرے دامن میں آئے تو ہیں
تیرے عاشق نہیں

—

حسنین سید
کراچی

تعبیر کس کے ہاتھ ہے؟

کسی ہز ہائنس ظلّ اللہ کی
نسل میں ہونا مبارک ہے بہت

یہ دنیا بھی کسی جنّت کا خاکہ ہے
یہاں کی نعمتیں ساری تمہارے ہاتھ پر لکھی ہوئی ہیں

"وہ عزّت اور ذلّت بانٹنے میں عادلِ کُل ہے"

چلو چل کر کبھی دیکھیں
جو بچّے گاؤں کے کچّے گھروندے چھوڑ آتے ہیں
اُنہیں ماؤں کی شفقت کون دیتا ہے

گزرتے دن کی ہر اک شام میں
اپنے جواں بیٹوں کے چہروں سے فروزاں تھیں جو آنکھیں
اب کئی سالوں سے پتھر ہو گئی ہیں

زمیں بھی سب کی ماں ہے
شکم میں اسکے جتنے بھی خزانے ہیں
وہ بیٹا ہو کہ بیٹی
عرب ہو یا عجم
سب کا حق ان پر برابر ہے

"وہ عزّت اور ذلّت بانٹنے میں عادلِ کُل ہے"

"محبت میں نے بھی کی ہے"
مگر وہ کچھ کہ جو مائیں اٹھاتی ہیں
جواں بیٹوں کے گھر کو چھوڑ دینے پر
فقط خالق کا حصہ ہیں

میں شاعر ہوں!
سوائے پس ماندگانِ لمحۂ موجود
تم سب کے لیے اک خواب لکھ دوں
"مگر تعبیر کس کے ہاتھ ہے"؟

—

مضامین

فیض احمد فیض

پچھلے شمارے میں "یادرفتگاں" کے عنوان سے ایک مختصر سا حصّہ ترتیب دیا گیا تھا۔ خواہش یہ تھی کہ گزشتہ سال بچھڑنے والے چند ہم عصر اہل قلم کے بارے میں فیض صاحب کے تاثرات شائع کیے جائیں۔ ازراہ مہربانی فیض صاحب نے اپنے تاثرات قلمبند کروا دیے تھے مگر موزوں وقت فراہمی نہ ہونے کے سبب اسے گزشتہ شمارے میں شائع نہ کیا جاسکا۔ اس مختصر سے تاثراتی مضمون کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک عظیم شاعر کا اپنے ہم عصر ارباب قلم کے بارے میں پُرخلوص تاثر ہے، جسے قارئین یقیناً پسند کریں گے۔

جوش وفراق، چند یادیں

گزشتہ برس جو قافلہ دنیائے ادب سے ملکِ عدم کو سلسلہ وار روانہ ہوا اس میں کیا کیا صورتیں تھیں جو اب نظر سے پنہاں ہو گئیں، جوش، فراق، احسان دانش، خدیجہ مستور، غلام عباس، حفیظ جالندھری۔ ان سبھی اہل کمال سے برسوں صحبت رہی اور انہیں خلوت اور جلوت میں بارہا دیکھنے کا لطف حاصل ہوا اور رہا سوا حفیظ صاحب کے جو آخری عمر میں نہ جانے کس وجہ سے مردم بیزاری اور دست آزاری پر تُل گئے تھے۔ یہ سلسلہ کبھی منقطع نہ ہونے پایا۔ جوش صاحب سے پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں ہوئی جب لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے دوران اس انجمن کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی۔ جب تک لکھنؤ والوں کے کان میں ہماری شاعری کی بھنک نہیں پڑی تھی اور انجمن کے ان دو چار

اراکین کے علاوہ جو اتفاق سے ہمیں جانتے تھے کسی کو ہمارے بارے میں کچھ بھی علم نہیں تھا۔ چنانچہ جب کانفرنس کے اختتام پر محفلِ مشاعرہ برپا ہوئی تو ہمیں غالباً آخری بار سامعین کی صف میں بیٹھ کر مشاعرہ سننے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بعد چائے کی ایک دعوت پہ جوش صاحب سے رسمی سا تعارف ہوا لیکن بات کچھ آگے نہیں بڑھی۔ دو چار برس بعد دہلی میں ایک سرکاری قسم کا مشاعرہ تھا جس کا اہتمام ہر سالی وزارتِ خزانہ کی جانب سے ہمارے سابق گورنر جنرل غلام محمد مرحوم کیا کرتے تھے۔ یہیں وہ واقعہ پیش آیا تھا جب ہمارے ایک بزرگ دوست ملے ڈی اظہر مرحوم نے بھولے سے کہہ دیا کہ جوش صاحب مشاعرے میں خواتین بھی ہوں گی اس لیے ذرا احتیاط کیجیے گا۔ جوش صاحب فوراً بگڑ گئے اور مشاعرے میں جانے سے انکار کر دیا، بعد میں بہت منت سماجت کے بعد راضی ہوئے۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں مقیم تھے۔ جوش صاحب مجھے دیکھتے ہی برس پڑے یہ لکھنؤ میں آپ نے کیا حرکت فرمائی تھی۔ میاں تم کوئی ناکتخدا لڑکی ہو کہ تمہیں مردانے میں آنے سے ڈر لگتا ہے یا شعر کہنا کوئی ایسا معیوب فعل ہے کہ آپ اس سے شرمندہ ہیں۔ آخر ہاں نہیں کیوں محروم رکھا۔ ان کی ادا ہی یہ تھی کہ کم عمر لکھنے والوں پہ شفقت بھی فرماتے تھے۔ ڈانٹ بھی دیتے تھے۔ شعر کی داد دینے میں جتنے فراخدل تھے، زبان پہ گرفت کرنے میں اتنے ہی سخت گیر، جب وہ اسلام آباد وارد ہوئے تو ہم کہیں پوچھ بیٹھے جوش صاحب آپ کی رہائش کہاں ہے؟ فوراً تنک کر کہا ہائیں کیا فرمایا، یہ رہائش کون زبان کا لفظ ہے، اب آپ کہیں گے کہ آپ کی لائش کہاں ہے؟

مشاعروں میں کچھ یوں تھا کہ اگر کسی سخن ناشناس مجمع سے پالا پڑا جیسے اکثر اوقات ہوتا رہتا تھا اور جوش صاحب نے اپنی مرصع اور پرشکوہ زبان میں کوئی سنجیدہ نظم شروع کی اور ادھر سے صدائے برخواست تو کسی عقیدت مند نے لقمہ دیا جوش صاحب کوئی موٹا مال للہ اور جوش صاحب منغض ہونے کے بجائے فوراً اپنی مزاحیہ رباعیوں پر اتر آئے اور ہمارا نام پکارا گیا تو بولے لے بیٹا اب تو چڑھ جا سولی پہ۔

جوش صاحب اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ بقولِ شاعر میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا، اگر اس پر وہ یہ اضافہ کرتے کہ میرا مزاج لڑکپن سے جارحانہ تھا تو تصویر مکمل ہو جاتی اس لیے کہ ان کا کلام اور ان کا مزاج انہی دو صفات سے مرکب ہے۔ اس لیے کہ ان کی عاشقی بھی عاجزانہ نہیں جارحانہ ہے اور اُن کی انقلابیت، بھی انقلابانہ کم اور رومانوی یا عاشقانہ زیادہ ہے۔ عشق کے مقامات آہ و فغاں کا مضمون تو خیر آپ نے سرے سے اپنایا ہی نہیں لیکن عقل و خرد کے بارے میں بھی جو ان کا مرغوب موضوع ہے فلسفہ اور سائنس کی باریکیوں میں جانے کے بجائے چند حکیمانہ کلیے بیان کرنے پہ اکتفا کی اور انقلاب کی تلقین میں بھی جو ان کا مرغوب موضوع ہے سیاسی اور معاشرتی اسباب و عوامل پر نظر ڈالنے کے

بجائے دعوتِ جدال و قتال پر فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا اس لیے کہ علامہ اقبال کی زبان میں "یغما زدہ ترکانہ" کی روایت یہی تھی

فراق صاحب سے سنہ ۳۸ء میں پہلی بار ملاقات تو نہیں کہہ سکتے صرف سامنا ہوا۔ منٹو پارک میں جو اب اقبال پارک کہلاتا ہے غالباً یوم اقبال کی تقریب پر ایک بہت بڑے پنڈال میں کل ہندوستان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جمنا پار کے چند اساتذہ کی پہلے پہل زیارت ہوئی جن میں فراق صاحب کے علاوہ یاس یگانہ، سیماب اکبر آبادی اور مولانا سہا وغیرہ شامل تھے۔ میں نے اپنی نظم (رقیب سے) پڑھ کر سنائی جو ایک آدھ دن پہلے ختم کی تھی۔ مشاعرے کے خاتمے پر واپس جاتے ہوئے فراق صاحب نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا واہ میاں کیا نظم کہی ہے۔ کچھ دن بعد غالباً ادبی دنیا میں ان کا بہت مبالغہ آمیز تبصرہ شائع ہوا جس میں لکھا تھا کہ کیٹس اور شیلے بھی اس سے بہتر کیا کہہ سکتے تھے، ہمیں جب تک اس سے بڑا سرٹیفکیٹ کہیں سے نہیں ملا تھا۔ اگلے پانچ سات برس میں دہلی، لکھنؤ اور الٰہ آباد کے مشاعروں میں ملنا ہوتا رہا اور وہ اسی طور شفقت فرماتے رہے۔ اس مرحمت کا آخری دلپذیر اظہار ان کی آخری ملاقات سے وابستہ ہے جس کے نقوش ابھی تک یاد میں تازہ ہیں۔ کوئی دو برس پہلے ہندوستان میں بعض دوستوں نے ہماری سترہویں سالگرہ کا مختلف شہروں میں اہتمام کیا تھا۔ الٰہ آباد میں مقامی یونیورسٹی کی جانب سے تقریب کی دعوت تھی، ہم چند دوستوں کے ہمراہ جلسے کے مقررہ وقت سے ایک آدھ گھنٹہ پہلے فراق صاحب کی قیام گاہ پر سلام کرنے پہنچے، جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے لیکن ذہن ویسے ہی شگفتہ اور ترو تازہ تھا اور زبان ویسے ہی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ بہت مزے کی باتیں ہوئیں۔ ہم نے رخصت چاہی تو کہنے لگے میں بھی چلوں گا۔ ایمبولینس گاڑی اور پہیوں والی کرسی کا انتظام کرو۔ چنانچہ اسی سواری پر وہ پہنچے۔ اپنی کھنک دار آواز میں تقریر بھی فرمائی۔ شعر بھی سنائے اور جب مقطع پر پہنچے جو پہلے فراق کو دیکھا ہوتا اب تو بہت کم بولے ہے۔ تو کہیں سے آواز آئی، یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ فراق صاحب نے اسی پر بس نہیں کی، اگلے دن مسلم ہوسٹل کی تقریب میں جلتی دوپہر کے دوران پھر اسی گاڑی میں تشریف لائے۔ ظاہر ہے کہ یہ روائتی وضع داری کی بات نہیں تھی ان کے اپنے مزاج اور شخصیت کا عکس تھا۔

اگرچہ جوش اور فراق ایک ہی خطے کے رہنے والے، ایک ہی زبان کے رسیا اور ایک ہی معاشرے کے افراد تھے لیکن ان کے ذاتی اور تخلیقی اوصاف میں اشتراک کم تھا اور اختلاف زیادہ۔ حق گوئی اور بے باکی، ذہانت اور لسانی دونوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کے سیاسی اور معاشرتی نظریات

بھی بہت حد تک مشترک تھے۔ لیکن جوشؔ صاحب کی تربیت ایک قصباتی رئیسانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ فراقؔ صاحب کی ایک شہری متوسط گھرانے میں۔ جوشؔ صاحب کا ذہنی اور ادبی رشتہ ترکی اور فارسی خطیبانہ اور بلند بانگ روایت سے تھا، فراقؔ صاحب کا ہندوستانی مطربانہ اور مدھر روایت سے، چنانچہ ان کے موضوعات، کیفیات، شاعرانہ لغت اور تکنیک میں بھی یہی فرق ہے۔ جوشؔ صاحب کو حدیثِ دل کی نزاکتوں اور داخلی احساسات کی لطافتوں سے بہت کم واسطہ تھا۔ اسی طرح ان کی شاعرانہ لغت اور لہجے میں بھی لوچ اور رس کے بجائے گھن گرج اور طنطنے کو زیادہ دخل تھا۔ وہ بیشتر بڑے کینوس پر موٹے برش سے آئل پینٹ کرتے تھے اسی سبب سے تنگنائے غزل کے بجائے قصیدہ نما نظم سے رجوع کیا۔ اور اس کے برعکس فراقؔ صاحب جذبات و احساسات کے ادراک میں باریک بینی میں اور پیرایہ و اظہار کے بارے میں کشیدہ کاری کے مشتاق تھے، اس لحاظ سے کلی طور سے نہ سہی بہت حد تک ان کا سوداؔ اور میرؔ سے تقابل کر سکتے ہیں۔

احسان دانشؔ، غلام عباسؔ اور حفیظؔ صاحب سے اپنی طالب علمی کے دنوں سے صحبت رہی، خدیجہ مستور سے قیام پاکستان کے بعد رابطہ ہوا، ان کا ذکر آئندہ سہی۔

احمد ندیم قاسمی
لاہور

سورج پر دستک

ایک مطالعہ

"سورج پر دستک" ایک ایسی نسل کی شعری اور نثری تخلیق کاری کا نمونہ ہے جو شدید فرسٹریشن کی شکار ہے، جسے ماضی سے شکایت ہے کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے اور جسے حال سے گلہ ہے کہ اُسے فریب دیا گیا ہے اور اُسے سنگین اندھیروں کے پاٹوں میں مَسلے جانے کے لیے بے سمت چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ ہماری نوجوان اور سوچتی ہوئی نسل ہے، جو جھوٹ سے انحراف کی اور سچ کے جرأت مندانہ اظہار کی کوشش کر رہی ہے۔ شائستہ حبیب اسی نسل کی ترجمان ہے جسے مخاطب کر کے وہ کہتی ہے کہ آؤ، مل کر رد میں تاکہ ہماری آنکھیں، ہماری زبانیں بن کر باہر لٹک پڑیں۔

آخر ہم کب تک اس خود فریبی میں مبتلا رہیں گے کہ اس انداز سے سوچنے والی نسل کا وجود صرف کاغذ پر ہے، اور حقیقت میں یہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ ایسا سوچنا اپنی نوجوان نسل کے خلوصِ نیت پر شبہ کرنے کے مترادف ہے جبکہ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ نسل، ہمارے مقابلے میں، جھوٹ بہت کم بولتی ہے۔ شائستہ حبیب کے انداز میں سوچنے والی نسل کے افراد ہمارے چار طرف موجود ہیں اور ان کا، اور ساتھ ہی ہمارا، المیہ یہ

ہے کہ ہم ان کے وجود کی نفی پر تلے بیٹھے ہیں محض اس خوف سے کہ اس طرح خود ہمارے اپنے وجود کی نفی نہ ہوجائے۔ یہ ایک ذہین نسل ہے اور ذہین نسل کی سوچوں کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بھی کچھ ذہانت درکار ہوتی ہے۔ پرانوں کو اس نسل کی نفی کرکے اپنے آپ کو کند ذہن اور غبی ثابت کرنے کی کوشش میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ شائستہ حبیب کی سوچیں ہماری سوچوں سے بدرجہا مختلف ہیں، اور اگر اتنی مختلف نہیں ہیں تو ان کا اظہار ایک ایسے مختلف اسلوب میں ہوا ہے جس کے ہم عادی نہیں ہیں۔ لیکن جب بقول علامہ اقبالؔ، کائنات میں مسلسل تخلیق اور تعمیر ہو رہی ہے تو ہمارے مزاجوں کو بھی اتنا بے تحریلا نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں بھی روحِ عصر کے ساتھ ساتھ مثبت انداز میں بدلتے رہنا چاہیے کہ ہم اس کے بغیر شعر و ادب کے بدلتے ہوئے معیاروں کی صحیح تفہیم و تحسین سے محروم رہ جائیں گے۔

میں "نثری نظم" کی اصطلاح کا قائل بھی نہیں ہوں اس لیے عادی بھی نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ اصطلاح ہی تضاد کی شکار ہے۔ میں مُصر ہوں کہ یہ مثبت اختلاف ہے۔ مجھے یہ طرزِ اظہار سنسنی پھیلانے کی ایک کوشش لگتا ہے اور بس۔ یورپ کا حوالہ اس میں کوئی توانائی پیدا نہیں کرسکتا کیونکہ یورپ اس طرح کے کئی کرتبوں کا مظاہرہ کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے اور یہ قطعی ضروری نہیں کہ یورپ جو بھی کر رہا ہوتا ہے ٹھیک کر رہا ہوتا ہے۔ البتہ جب میں "نثری نظمیں" کے نام سے چھپنے والی تحریریں پڑھتا ہوں تو مجھے کئی مقامات پر محسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں میں گہرائی بھی ہے اور سچائی بھی۔ چنانچہ مجھے ہمیشہ ان تحریروں کے نفسِ مضمون سے غرض رہی ہے اور نفسِ مضمون میں اگر حسن اور صداقت ہو تو نثر کی اصناف اس کے لیے "آؤٹ آف باؤنڈز" نہیں ہوجاتیں۔ اس صورت میں "نثری نظموں" کو زیادہ سے زیادہ "شاعرانہ نثر" کہا جا سکتا ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں شاعری میں موضوع کے ساتھ ہی اس آہنگ کا بھی عادی ہوں جس کے دم سے پوری کائنات گنگناہٹ سے بھر جاتی ہے۔ بعض "نثری نظموں" کے موضوعات کی صداقت اور شدت اپنی جگہ، مگر مجھے ان کی لفظیات میں کہیں بھی بیرونی یا اندرونی آہنگ محسوس نہیں ہوا۔ اسی لیے میں شائستہ حبیب کی اس کتاب کے صرف چند موضوعات اور ان کے اظہار کے سلیقے کی بات کر رہا ہوں، صنفِ اظہار یا طریقِ اظہار سے مجھے فی الوقت بحث نہیں ہے۔

"سورج پہ دستک" میں بے بحر تحریروں کے علاوہ بابحر نظمیں بھی شامل ہیں۔ ان میں کسی تخصیص کو روا نہیں رکھا گیا اس لیے میرے ساتھ یہ المیہ ہوتا رہا کہ میں بابحر نظم کو نثر سمجھ کر پڑھتا رہا، اور جب بحر کا انکشاف ہوا تو اگلے بے بحر نثری ٹکڑے میں بحر بھرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یوں میں الجھ گیا مگر پھر میں نے یہ ساری کتاب نثر کی طرح پڑھ ڈالی اور میں شائستہ کے اس طرح کے بہت نازک، بہت حساس رویّے سے چونک چونک پڑا کہ:

(ہمارے خوابوں کی) تعبیریں ہماری دہلیزوں پہ لٹکی
ہمیں ملامت کر رہی ہیں

محبت ایک بڑا عمل ہے اور چھوٹے لوگ اس سے
پرہیز کریں تو اچھا ہے۔

میں بے سرمایہ ہوں۔ نہ کسی کو خرید سکوں، نہ کوئی
مجھے خرید سکے، چنانچہ میں انمول ہوں۔

بغیر محبت کے، نہ مرنا ورنہ حساب دینا
پڑے گا۔

پہرہ دار اس لمبی جیب میں اک اک لفظ کو سونگھ
رہے ہیں۔

تم قطرہ قطرہ اپنے ہی اندر گرتی رہتی ہو۔

آنکھوں سے خوشبو کو چکھو۔

لوگوں کو اتنا تنگ کرو کہ وہ تمہارے LEVEL
پر آکر جینا شروع کر دیں۔

آنے والے لمحوں کو وقت سے پہلے فوکس کرنے
کی کوشش میں، تمہارے حال کے لمحے دھندلائے
جاتے ہیں۔

شائستہ کی اس طرح کی دانائیاں اور سچائیاں، یوں ہی اس کے ہاتھ نہیں لگ گئیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے، ان کے لیے وہ تجربوں، مشاہدوں اور محسوسات کے کتنے ہی جہنموں میں سے گزری ہے۔ حال کا لمحہ اس کے لیے سب سے بڑا سچ ہے۔ ماضی اس کے لیے بدذائقہ اور مستقبل دھندلا اور ادھورا ہے۔ وہ حال کو بھی "ڈِس اون" کر دیتی ہے کیونکہ حال کے اس لمحے میں اسے فی الحال بیشتر بے سمتی اور معین دائروں میں بے مقصد بھٹکتے پھرنے ہی کا تجربہ حاصل ہوا ہے۔ وہ سبھی معاشرتی اداروں پہ ٹوٹ ٹوٹ کر برستی ہے۔ خونی رشتوں تک کو سمجھوتے قرار دیتی ہے۔ انسانوں کی کمینگیوں اور نامردیوں کو کوستی ہے۔ عزت مندی اور سنجیدگی کو اضافی اور مصنوعی قدریں قرار دیتی ہے وہ بار بار خون تھوکتی ہے مگر اہم تر نکتہ یہ ہے کہ وہ بار بار دستک بھی دیتی ہے کہ شاید کوئی دَر کھُلے۔ شاید سنّاٹے کے اس گنبد میں آواز کی کوئی جھری پیدا ہو! اس کے اندر اُجلے سویروں کے معنی جاننے کی امنگ مری نہیں ہے۔ وہ بستیوں کے کوڑھ زدہ وجود پر محبّت کی بارشوں کے انتظار میں ہے۔ محبّت — محبّت — اور محبّت —! یہی شائستہ کا محبوب موضوع ہے۔ یہی محبّت اس کے نزدیک ہر کرب کا علاج ہے، اور یہی محبّت انسانی زندگی کو مثبت اور با معنی بنا سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پہنچ کر تلخی اور طیش سے بھری ہوئی یہ فن کار، ساری تلخی اور تمام طیش کا راز فاش کر دیتی ہے کہ یہ تلخی اور طیش، انسانی رشتوں میں محبت کے فقدان کی پیداوار ہیں۔ محبت عام ہو تو شائستہ کے ہاں نہ جسم ہراساں اور بے اماں رہیں، نہ وہ اس سوال سے خوفزدہ ہو کہ کل کیا ہوگا، اور نہ وہ اس حیرت میں مبتلا رہے کہ استحصالی معاشرے کی اس بھول بھلیاں میں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ کیوں نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محبت کا علم بلند کر کے شائستہ نے غیر شعوری طور پر، یا شاید شعوری طور پر، ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا کوئی بھی مسئلہ سراسر اندرونی نہیں ہوتا، بیرونی بھی ہوتا ہے۔ انسان صرف اپنی ذات تک محدود نہیں ہے، اس کا تو پوری کائنات کے ساتھ ناتا ہے۔ سوال صرف اس کائنات کو بدلنے اور اس میں محبّت کے گلشن اُگانے اور محبت کے چشمے رواں کرنے کا ہے۔ سو میں اس سے کہوں گا کہ — شائستہ! بدصورت حال کو محض "ڈِس اون" کرنے سے بات نہیں بنتی، "حال" کو سراسر بدل ڈالنے سے بات بنتی ہے اور تم اس تغیّر کی مخالف نہیں ہو، ورنہ تمہارے اندر اُجلے سویروں کے معنی جاننے کی امنگ نہ ہوتی اور تمہیں کوڑھ زدہ بستیوں پر محبّت کی بارش کا انتظار نہ ہوتا۔ تم بابحر شاعری کر دیا بے بحر تحریریں لکھو، بس "کنفیشن" اور "ننھے فرشتو" کے سے فن پارے تخلیق کرتی جاؤ۔ اور جب اہلِ ثروت پر برسو (اور یقیناً برسو کہ یہ غصّہ سراسر جائز ہے) تو لمبی سیاہ کارمیں

میں لڑے ہوئے تابوتوں کے محاورے میں گفتگو کرنے سے گریز کیا کرو کہ انگریزی ان لوگوں کی بولی نہیں ہے جو تمہاری طرح سوچتے ہیں۔ تمہاری نسل اور میری نسل کے درمیان کوئی "کمیونیکیشن گیپ" (یہ تمہاری ایک تحریر کا عنوان ہے) نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تمہیں کیا کہنا ہے اور کیسے کہنا ہے۔ اس صحت مندر دیئے سے تو نسلوں کے درمیان کوئی گیپ رہتا ہی نہیں۔ تم نے اپنی پہچان اپنے آس پاس کے حوالوں سے کی ہے۔ تمہاری سطروں میں سے تمہارے اپنے وطن کا لینڈ سکیپ جگہ جگہ نہ صرف جھانکتا ہے بلکہ انسان اور فطرت کے درمیان باقاعدہ ایک رشتہ داری قائم کر لیتا ہے۔ یہ سب حقائق تمہیں اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں اور تم سدھر اور نکھر رہی ہو۔ میں تمہیں فن کی دنیا میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

وزیر آغا
سرگودھا

مرتضیٰ برلاس

مرتضیٰ برلاس صاحب کی دو حیثیتیں ہیں اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ دونوں حیثیتیں بظاہر متصادم لیکن بباطن باہم مربوط ہیں۔ ان کی ایک حیثیت تو سرکاری افسر کی ہے اور دوسری حیثیت ایک شاعر کی۔ چونکہ بالائی سطح پر ان دونوں میں افہام و تفہیم کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی اس لئے مرتضیٰ برلاس بار بار اس کرب کی زد میں آئے ہیں جو ان دونوں کے تصادم سے پھوٹا ہے اپنے ایک شعر میں انہوں نے اس صورت حال کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ؎

دوستوں کے حلقے میں ہم وہ کج مقدر ہیں
افسروں میں شاعر ہیں شاعروں میں افسر ہیں

اپنے اس شعر میں مرتضیٰ برلاس صاحب نے دوستوں کے دو حلقوں کا ذکر کیا ہے ایک تو ان کے افسر دوستوں کا حلقہ ہے جس نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو بنظر تحقیر دیکھا ہے جیسے کہہ رہا ہے کہ افسری تو آپ کیا کریں گے بس شعر و ریکھ لیا کریں۔ میرا خیال ہے کہ مرتضیٰ برلاس نے ہمیشہ اپنے افسر دوستوں کے اس استہزائی رویے کو خندہ استہزا میں اڑایا ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ افسر تو ایک اڑتا پھرتا بادل ہے آج یہاں کل وہاں چنانچہ اس کی چھاؤں بھی سدا متحرک رہتی ہے جبکہ شاعر اس شجر سایہ دار کی طرح ہے جس کی گھنی اور ٹھہری ہوئی چھاؤں میں خلقِ خدا صدیوں تک آرام کر سکتی ہے ان کے دوستوں کا دوسرا حلقہ ان شاعر بھائیوں پر مشتمل ہے جنہوں نے بھائیوں کی قدیم روایت کا احترام کرتے ہوئے یہ کہہ کر انہیں چاہ یوسف کی تنہائی کے سپرد کرنے کی کوشش کی کہ آپ شاعری تو کیا کریں گے بس افسری و فسری کر لیا کریں۔ مرتضیٰ برلاس صاحب کا مندرجہ بالا شعر اس بات کا غماز ہے کہ انہوں نے اپنے شاعر بھائیوں کے اس رویے کو بہت محسوس کیا ہے کیونکہ وہ اصلاً شاعر ہیں افسر نہیں ہیں اور اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ انہیں شاعروں کی برادری سے خارج سمجھا جائے مگر میرا خیال ہے کہ شاعروں کا انہیں افسر کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہیں البتہ شاعروں کا انہیں محض افسر سمجھنا زیادتی ہے ہاں اگر وہ انہیں افسر شاعر کہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جس طرح معاشرے کا تمام تر نظم و ضبط ایک بڑی حد تک سوسائٹی کے اس کارندے یعنی افسر کا مرہونِ منت ہوتا ہے جو سوسائٹی کو ایک بکھرے ہوئے جم غفیر میں تبدیل ہونے سے روکتا ہے اور قانون کی بالادستی قائم کر کے انسانی روابط کو توازن اور اعتدال سے ہمکنار کرتا ہے بالکل اسی طرح فرد کے بطون میں بھی ایک افسر سدا سے موجود ہے جس کا کام فرد کے قول و فعل کے تضاد کی نشان دہی کرنا نیز اسے ان اقدامات سے روکنا ہے جو اس کی ساری شخصیت کو تار تار کر سکتے ہیں پھر جس طرح سوسائٹی میں جب افسر اپنے فرائض منصبی سے غافل ہو جاتا ہے یا اس کے قول و فعل میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے تو پورا معاشرہ منافقت کی زد میں آجاتا ہے اور اس کی قدریں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں بالکل اسی طرح جب فرد کے بطون میں چھپا ہوا افسر خواب خرگوش میں مبتلا ہوتا ہے یا بکارِ خویش ہوشیار رہو جاتا ہے تو فرد کی ساری شخصیت ہی داغ داغ ہو جاتی ہے سوسائٹی کے افسر کے لئے لفظ افسر ہی موزوں ہے لیکن فرد کے اعماق میں چھپے ہوئے افسر کو "ضمیر کی آواز" کا نام دینا چاہیئے ایک عام سے شخص کے ہاں تو زیادہ تر ضمیر کی آواز کا شخصی پہلو ہی ظاہر ہوتا ہے مگر شاعر کے ہاں اس کا اجتماعی پہلو بھی برآمد ہوتا ہے اور پوری قوم کے ضمیر کی آواز بن جاتا ہے ؂

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

چونکہ مرتضیٰ برلاس کے کلام میں قوم کے ضمیر کی آواز سنائی دیتی ہے اس لئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ افسری ان کا لبادہ نہیں بلکہ ان کے تخلیقی باطن کا ایک رنگ ہے۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جو ان کے اشعار کے ذریعے فضا میں پھیلتی ہے اور پوری قوم کو اس کی کوتاہیوں اور فرو گزاشتوں کا احساس دلانے کی کوشش کرتی ہے اسی لئے میں نے کہا کہ انہیں افسر شاعر کہنا چاہیئے کیونکہ ان کی شاعری میں افسر کا کردار اپنی ساری فعالیت اور دیانتداری کے ساتھ ابھرا ہے۔

ضمیر کی آواز مرتضیٰ برلاس کی شاعری کا مرکز اور محور ہے یہ آواز محض ان کے اپنے زمانے کی ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں ہی کا ردِ عمل نہیں بلکہ ہزاروں برس پر پھیلی ہوئی انسانی زندگی کی بے اعتدالیوں اور کوتاہیوں کے خلاف اس ردِ عمل کا علامتی اظہار بھی ہے جس کے علمبردار سقراط، عیسیٰ اور دوسری مقتدر ہستیاں تھیں یہ سب ہستیاں دراصل ضمیر کی آواز ہی کے مختلف روپ تھے جو انسان کو اس خواب غفلت سے بیدار کر رہے تھے جس میں وہ بار بار مبتلا ہو جاتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے عام طور سے اس آواز کو اچھا نہیں سمجھا اور اسے زہر، صلیب یا تلوار سے دبا دینے کی کوشش کی مگر یہ آواز کبھی مر نہ سکی اور زمین کے شگاف سے، بادلوں کے چاک سے، ہونٹوں کی درز سے، قلم کی جھری اور بانسری کے سوراخ سے برابر اٹھتی اور انسان کو نیند سے بیدار کرتی رہی۔ آج یہی آواز مرتضیٰ برلاس کے اشعار میں موجزن ہے اور خاصی بلند آہنگ ہے۔ بلند آہنگی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مرتضیٰ برلاس کا دور بلند اور بھدی آوازوں کا

دور ہے۔ اس دور میں یکایک ہر شے اونچی آواز میں چیخنے لگی ہے حتیٰ کہ مادّے کی قلیل ترین صورت یعنی جوہر بھی اپنی دھماکہ خیز آواز کا مظاہرہ کرنے لگا ہے مگر یہ سب آوازیں معنی سے محروم ہیں لہٰذا اس دور میں کسی بلند آہنگ لیکن معنویت سے لبریز آواز کی اشد ضرورت ہے جو آوازوں کے کہرام میں بھی سنائی دے جائے۔ مرتضیٰ برلاس کی شاعری نے ایک ایسی ہی آواز کو ابھارنے کی سعی کی ہے ؎

اب میں ہی سہی کوئی تو شب جاگ کے کاٹے
جو جاگنے والے تھے وہ سب غرقِ طرب ہیں

کوئی باعزم جب سوئے منزل بڑھا راہ میں حسرتِ بد نصیب آ گئی
دستِ سقراط میں جامِ سم آ گیا۔ ابنِ مریم کے آگے صلیب آ گئی

جب میں نہ تھا تو میرے زمانے میں گونج تھی
اب میں ہوں اور سارے زمانے کا درد ہے

میں ہی اب زہر پئے لیتا ہوں سچ کی خاطر
کوئی تو سنتِ سقراط کی تجدید کرے

کوئی صلیب پہ لٹکا کسی نے زہر پیا
مرا بھی گر یہی انجام ہو گیا تو کیا

وقت شب خوں کے لئے لیس ہے ہتھیاروں سے
شہر کا شہر ہی سویا ہے جگائیں کس کو

اگر مرتضیٰ برلاس کے کلام میں ضمیر کی آواز اپنی کرختگی اور تحکم کے ساتھ ابھرتی یا اصلاحِ احوال کا کوئی پنج سالہ منصوبہ اس کے پیشِ نظر ہوتا تو اس میں کبھی وہ معنویت، خستگی اور کومل تا پیدا نہ ہو سکتی جو ان کے کلام کی پہلی قرأت ہی میں محسوس ہونے لگتی ہے خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے ہاں ضمیر کی آواز نے اپنے اظہار کے لئے ایک علامتی پیکر بھی اختیار کیا ہے اور یہ علامتی پیکر سورج کا ہے۔ سورج، مرتضیٰ برلاس کے نزدیک شخصی اور اجتماعی دونوں وضع کے ضمیروں کا علامتی روپ ہے۔ جب سورج سوا نیزے پہ ہوتا ہے تو سایے قدموں میں سمٹ جاتے ہیں (سایے بے اعتدالیوں، کوتاہیوں، دھاندلیوں اور ناہمواریوں کی علامت ہیں) مگر جب سورج روبہ زوال ہوتا ہے تو سایے لمبے ہوتے ہوتے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں

لے لیتے ہیں مراد یہ کہ جب قوم اور شخص کے ضمیر کا سورج نصف النہار پر ہو تو معاشرہ بھی صحت مند، قوی اور جرأت مند ہوتا ہے مگر جب ضمیر کا یہ سورج ڈھل جاتا ہے اور بالآخر مردہ ضمیر بن جاتا ہے تو ہر طرف اضمحلال، مردنی، بے راہروی اور منافقت عام ہو جاتی ہے مرتضیٰ برلاس لکھتے ہیں سہ

سجا کر سر پہ سورج کو جسے پیروں میں روندا ہے
وہ سایہ جسم سے بڑھ جائے گا جب وقتِ شام آیا

غروب کے نہیں آثار یہ تو پھر کیا ہیں ۔ا
کہ جسم سے بڑے لگتے ہیں اب تو سایے مجھے

سورج کی تو خواہش تھی ہم اس کی کرن ہوتے
ہم خود کو فضاؤں میں تحلیل نہ کر پائے

پاس اگر سرمایۂ دل ہے سایے سے ہوشیار رہو
ان راہوں میں بھیس بدل کر چور لٹیرے پھرتے ہیں

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ مرتضیٰ برلاس کے کلام نے عصر کو آئینہ بھی دکھایا ہے اور راستہ بھی! آئینہ اس اعتبار سے کہ ہمیں اپنے تضادات صاف نظر آنے لگے ہیں اور راستہ یوں کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ضمیر کی آواز کی بازیافت ہی ہمارے لئے نجات کا باب کھول سکتی ہے۔ یوں دیکھئے تو یہ شاعر محض قبیلۂ مردہ ضمیر کا شاعر نہیں بلکہ اس کی جرأتِ گویائی نے دلوں پر پڑے ہوئے تالوں کو کھولنے کی بھی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر شارب ردولوی

دہلی

"اردو شاعری میں نئے تجربے"

جدّت پسندی ایجاد و اختراع، نئی راہیں نکالنا یا رواج عام سے الگ چلنے کی کوشش انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ اپنے احاطۂ کار اور دائرۂ عمل میں طرح طرح سے اس بات کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اسے اپنے پیش رُووں اور ہم عصروں سے الگ پہچانا جائے اور اسی جذبے کے تحت وہ مختلف قسم کے تجربات کرتا رہتا ہے۔ تجربے کا لفظ گو کہ سائنسی، کاروباری، علمی اور ادبی ہر جگہ ایک ہی انداز اور استعمال کی کثرت کی وجہ سے رسوا ہو گیا ہے لیکن تبدیلی کی ہر ابتدائی کاوش اور روایت سے انحراف کو جب تک کہ وہ قبول عام کی سند حاصل نہ کر لے تجربے ہی کا نام دیا جاتا رہا ہے اس لیے ایسی تمام تبدیلیوں کی کوششوں اور روایت سے انحراف کے مطالعے کے لیے اس لفظ کا استعمال ایک مجبوری بن گیا ہے۔ اگرچہ قدیم اساتذہ کے یہاں فکر و فن یا ہیئت و اسلوب میں جدّت اور تبدیلیوں کے لیے اس لفظ کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ بہرحال اس جدّت کو اگر ہم تجربہ ہی کہیں تو ادب میں تجربات ایک مسلسل عمل کی حیثیت رکھتے ہیں جو ابتدا سے آج تک جاری ہیں۔ یہ ایک زیریں لہر بھی ہے اور سطح سے اوپر نظر آنے والی موج بھی جو ایک دوسرے سے الگ بھی ہے۔ ایک دوسرے میں پیوست بھی اور ایک دوسرے پر منحصر بھی۔

شاعری میں ان تجربات کی تین سطحیں نظر آتی ہیں جس کی پہلی سطح شعری تجربہ ہے۔ جہاں تخلیقی عمل جذبے، فکر اور محسوسات کو مخصوص انداز میں پیش کرتا ہے۔ شعری تجربہ چونکہ انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے اس لیے ہر شاعر کے یہاں اس کی صورت مختلف ہوتی ہے۔ یہی چیز شاعری میں تنوع اور رنگا رنگی پیدا کرتی ہے۔ ایک ہی واقعہ، احساس یا تصور مختلف اشخاص کے ذہنوں پر مختلف اثرات مرتب کرتا ہے۔ اور اس کے بیان کرنے کا انداز ایک دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ واقعے یا مشاہدے میں آنے والی چیز نے انہیں کس طرح متاثر کیا ہے ایک شخص اسے راست واقعے کی شکل میں بیان کر سکتا ہے لیکن دوسرے کے لیے اس طرح کا بیان سپاٹ اور غیر دلچسپ ہو سکتا ہے اور وہ بیان کے لیے

کوئی دوسرا طریقہ اختیار کر سکتا ہے یا کسی دوسرے پہلو کو نمایاں کر سکتا ہے کوئی اشارے یا رمز و کنایے میں بات کر سکتا ہے کوئی استعاراتی انداز میں اور علامتوں کے سہارے اپنی بات کو پیش کر سکتا ہے۔

شعری تجربے کی دوسری سطح ہیئتی تجربہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی شعری اظہار کے لیے ایک ہیئت کی ضرورت ہوتی ہے اسی ہیئت کے سہارے شاعر اپنی فکر اور محسوسات کو پیش کرتا ہے۔ ہیئت اس کے خیال، فکر، احساس، تصور، تجربے یا مشاہدے کے جسم کی حیثیت رکھتی ہے، جسے وہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ شاعر کبھی اس خام مواد کو مروجہ اسالیب میں پیش کر دیتا ہے لیکن کبھی محسوس کرتا ہے کہ جس جذبے یا خیال کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے اس کے لیے مروجہ اسالیب مناسب نہیں ہیں یا وہ اظہار میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں بہتر اظہار کے لیے وہ بہتر ذریعۂ اظہار کی تلاش کرتا ہے اور رائج اسالیب میں تھوڑی سی آزادی لے کر کچھ ردّ و بدل کرتا ہے یا کوئی نیا اسلوب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

شعری تجربے کی تیسری سطح لسانیاتی تجربہ ہے۔ شاعری میں خیال یا مواد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت زبان کی ہے ہر اچھے شاعر کو اظہار کے لیے ایسی زبان کی ضرورت پڑتی ہے جو اس کے محسوسات اور جذبات کو اس شکل میں کامیابی کے ساتھ پیش کر سکے جس طرح کہ وہ چاہتا ہے۔ کبھی شاعر یہ محسوس کرتا ہے کہ رائج لفظیات یا ان کی ظاہری معنوی سطح اس کے جذبات یا محسوسات کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے علاوہ نئے موضوعات اور نئے فکری سانچے نئی زبان کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ بڑا شاعر اپنے فکری مطالبات کے مطابق زبان کو ڈھال لیتا ہے اور الفاظ کو نئے معنی دیتا ہے۔ وہ نئے الفاظ، نئی تراکیب، استعارے، علامتیں اور تشبیہات تخلیق کر کے زبان کو اپنے تخلیقی عمل کے تیز دھارے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاعری میں ان تجربات کی ضرورت کیوں پڑتی ہے؟ دراصل بعض اسباب اور حالات میں اس طرح کے تجربات وقت کی ضرورت اور فن کا مطالبہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً ہر بڑی سیاسی و سماجی تبدیلی، انسانی زندگی، اس کے رہن سہن، اس کی تہذیب اور اس کی فکر کو متاثر کرتی ہے جس کا واضح اثر اس کے مجموعی برتاؤ Behaviour اور نقطۂ نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ اثرات ہمارے ادب میں نمایاں طور پر دونوں عالمی جنگوں، ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریکِ آزادی، انقلابِ روس، ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی، تقسیمِ ملک، فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت اور مشینی و صنعتی دور کی طرف پیش قدمی کے سبب پیدا ہونے والے حالات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح کی سیاسی و سماجی تبدیلیاں نئے انفرادی و اجتماعی مسائل اور نئے موضوعات لے کر سامنے آتی ہیں، جن کے بیان کے لیے فن کے روایتی سانچے کبھی کبھی ناکافی محسوس ہوتے ہیں اور نئے تجربات اور نئے سانچوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

یہ نئے تجربات ادب میں نئے علوم سے واقفیت کی بنا پر بھی ہوتے ہیں۔ ہماری معلومات میں جتنا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ نفسیات، سائنس اور دوسرے سماجی علوم سے واقفیت جتنی بڑھتی جاتی ہے شاعرانہ پیرایۂ اظہار میں بھی فرق آتا جاتا ہے علوم سے واقفیت کی بنا پر وہ نئے نئے حقائق اور انکشافات سے دوچار ہوتا ہے اور انہیں بیان کرنے کے لیئے اسے نئی لفظیات اور نئی ہیئت کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

اسی طرح تجربات کی ایک وجہ تبدیلئ زماں بھی ہے۔ جس میں شاعر کا مخاطب اور قاری بدل جاتا ہے۔ ابتدا سے آج تک اصناف اور زبان میں تبدیلیوں کا ایک بہت بڑا سبب تبدیلئ زماں رہی ہے۔ قاری اور مخاطب کی ذہنی سطح، علم اور حالات کی تبدیلی شاعر کو اپنے اظہار میں نئے تجربات کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

شاعری میں تجربات کا ایک سبب شاعر کی جدّت طبع اور جودتِ فکر بھی ہے جس کے تحت وہ بنی ہوئی پگڈنڈیوں پر نہیں چلنا چاہتا اور کسی کے نقشِ قدم کے سہارے منزل تک پہنچنے میں ہتک محسوس کرتا ہے وہ اپنی راہ خود بنانا چاہتا ہے اور اپنے فکری سانچے خود وضع کرتا ہے۔

شعری تجربات کی ایک نوع فیشن اور نقل بھی ہے۔ اس طرح کے تجربات کسی اندرونی مطالبے یا فکری ضرورت کے تحت نہیں ہوتے بلکہ ان کا مقصد لوگوں کو چونکانا اور خود کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں تجربات کی روایت خاصی طویل ہے لیکن مغربی زبان وادب سے واقفیت نے اس کی رفتار کو تیز تر کر دیا۔ اگر ہم ماضی کی طرف دیکھیں تو یہ تیز رفتار تبدیلیاں، موضوع اور ہیئت دونوں کے نقطۂ نظر سے، گزشتہ سو سال میں زیادہ شدّت سے آئی ہیں۔ جب آزاد اور حالی نے بندھے ٹکے اصولوں اور ضابطوں کے خلاف آواز اٹھائی اور نئے انداز، نئی فکر، نئے موضوعات، اور نئی ہیئت پر زور دیا اور "کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے" کی عملی تعبیر تلاش کرنے کی جستجو کی۔ یہ سلسلہ اپنے محدود دائرے میں چھوٹی چھوٹی کوششوں کی شکل میں جاری رہا یہاں تک کہ شرر نے پہلی بار "نئی شاعری" کی اصطلاح سجاد حیدر یلدرم کی نظم، انتہائے یاس، کے سلسلے میں استعمال کی۔ اردو شاعری میں تجربات کے سلسلے میں یہ ایک انقلاب انگیز قدم تھا جس میں اردو شاعری کی روایتوں اور اصولوں کو توڑ کر انگریزی کے اسٹینزا فارم کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور قوافی کو صوتی بنیاد پر نظم کیا گیا تھا

رفتہ رفتہ تجربات کا یہ سلسلہ تیز تر ہوتا گیا۔ غزل اور دوسرے شعری اصناف میں بحر، ارکان، ردیف اور قوافی کی پابندی لوگوں کو اظہار کے راستے میں رکاوٹ محسوس ہونے لگی تھی اور وہ ان پابندیوں سے باہر آنا چاہتے تھے۔ اس لیے بہت جلد اس قسم کے تجربات شروع ہو گئے جن میں ایک نظم کے لیے کسی مخصوص بحر یا ارکان کی پابندی لازمی نہ ہو۔ شوق قدوائی نے مثنوی، عالم خیال، کو چار مختلف بحروں میں نظم کیا۔ عظمت اللّٰہ خاں نے اپنی نظموں میں ہیئت کے

مختلف تجربے کیے اور اردو میں ہندی پنگل کے اصولوں کے تحت نظمیں لکھیں۔ بعد میں مغربی شعری اصناف کے اثرات کے تحت بہت سے تجربے کیے گئے جن کا سلسلہ دورِ جدید سے مل جاتا ہے۔ ہیئت کے ان تجربوں میں سانیٹ، ترائیلے، آزاد نظم، اور مختصر نظم کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

سانیٹ انگریزی ادب کی قدیم شعری ہیئت ہے جس کی تین قسمیں پیٹرارکی سانیٹ، شیکسپیرین سانیٹ اور اسپنسری سانیٹ ہیں۔ بنیادی طور پر سانیٹ ۱۴ مصرعوں کی نظم ہوتی ہے جس میں بندیا حصوں کی مختلف تقسیم اور قوافی کے فرق سے مذکرہ تین قسمیں بن گئی ہیں۔ اس وقت کی تحقیق کے مطابق اردو میں اختر جوناگڑھی نے سب سے پہلے سانیٹ لکھنے کا تجربہ کیا۔ اس صنف کو فروغ دینے میں ن م راشد، اختر شیرانی، احمد ندیم قاسمی عزیز تمنائی اور سلام مچھلی شہری کے نام بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ عزیز تمنائی نے سب سے زیادہ سانیٹ لکھے لیکن اردو میں یہ تجربہ کامیاب نہ ہو سکا اس کی خاص وجہ اس کا سخت عروضی اور ہیئتی نظام تھا۔ مصرعوں اور قوافی کی پابندی اور خاص ترتیب اس لیے بھی برداشت نہ ہو سکی کہ اردو شاعری اس طرح کی پابندیوں سے خود ہی آزادی حاصل کرنا چاہتی تھی اور سانیٹ کی پابندیاں اور شعری ہیئتوں اور اصناف سے زیادہ سخت محسوس ہوئیں۔ کیونکہ سانیٹ میں ایک خیال کو ۱۴ مصرعوں میں ۵ یا ۶ قوافی کی مدد سے اور ان کی خاص ترتیب سے ہی نظم کرنا تھا اس سبب سے یہ تجربہ تجربے کی حد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اردو شاعری میں جدید ترین تجربات کے سلسلے میں ترائیلے کا نام آتا ہے۔ ترائیلے، فرانسیسی شاعری کی تقریباً چھ سو سال پرانی ایک مخصوص ہیئت ہے جس کا انیسویں صدی میں فرانس میں احیاء ہوا۔ اردو میں عطا محمد شعلہ نے سب سے پہلے ترائیلے کا تجربہ کیا۔ نریش کمار شاد اور قاضی سلیم نے بعض خوبصورت ترائیلے لکھے۔ فرحت کیفی نے اپنے ترائیلوں کا مجموعہ "پتہ پتہ بوٹا بوٹا" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ انہوں نے ایک بیرونی صنفِ سخن میں غزل کے رنگ و آہنگ کو سمونے کی کوشش کی۔ ترائیلے کی ایک مثال 'پتہ پتہ بوٹا بوٹا' سے پیش ہے جس سے اس کی ہیئت اور شعری کیفیت سمجھنے میں مدد ملے گی ؎

چلتے پھرتے ٹیڑھے میڑھے رینگتے سائے
رات کی تاریکی میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں
رات کے ساتھی جو ہیں دن میں وہی پرائے
چلتے پھرتے ٹیڑھے میڑھے رینگتے سائے
کس کا سایہ جانے کس کس سے مل جائے
جانے کن رنگوں میں ظالم کھو جاتے ہیں

چلتے پھرتے ٹیڑھے میڑھے رینگتے سائے
رات کی تاریکی میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں

یہ بظاہر آٹھ مصرعوں کی نظم ہے لیکن بنیادی طور پر اس میں صرف پانچ مصرعے ہیں۔ پہلے مصرعے کو چوتھے اور ساتویں مصرعے کی جگہ پر اور دوسرے مصرعے کو آٹھویں مصرعے کی جگہ پر دہرا کر آٹھ مصرعے پورے کیے جاتے ہیں۔ ترائیلوں کا تجربہ بھی نریش کمار شاد، قاضی سلیم، اور فرحت کیفی کی کوششوں کے باوجود مقبول نہ ہو سکا۔ اس کے اسباب بھی بظاہر وہی ہیں جو سانیٹ کی ناکامیابی کے اسباب ہیں۔ سانیٹ کے مقابلے میں اس میں ایک دشواری بعض مصرعوں کی بار بار تکرار بھی۔ یہ تکرار کسی مخصوص خیال کے پیش کرنے میں تو لطف پیدا کر سکتی ہے لیکن ہر خیال میں تکرار کی یکسانیت گراں گزرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ کیفی کے بعد کسی نئے شاعر نے اس صنف میں طبع آزمائی کی کوشش نہیں کی۔

آزاد نظم اور مختصر نظم کا شمار تجربے کے ضمن میں نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ اب ایک مستقل صنف سخن کی صورت اختیار کر چکی ہیں اور اردو شاعری میں ان کی وہی حیثیت اور اہمیت ہے جو پابند نظم یا دوسرے شعری اصناف کی ہے۔ آزاد نظم کی ابتدا تقریباً سو سال پہلے غیر مقفیٰ نظم کی شکل میں ہوئی اور سو سال کی مسلسل تراش خراش اور شکست و ریخت کے بعد اردو شاعری میں اس نے ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کر لی۔ آزاد نظم کے خدوخال یوں تو شررؔ کے منظوم ڈراموں میں نظر آنے لگتے ہیں لیکن باقاعدہ طور پر تصدق حسین خالدؔ، میراجیؔ، ن م راشدؔ، فیض احمد فیضؔ، ڈاکٹر تاثیرؔ، سردار جعفری، منیب الرحمٰن، کیفی اعظمی، اختر الایمان اور سلام مچھلی شہری وغیرہ نے آزاد نظمیں لکھیں اور خیال اور فکر و بیان کے نئے تجربات سے آزاد نظم میں دلکشی اور تاثیر پیدا کی۔ آزاد نظم کو مقبول بنانے کا کام ترقی پسند تحریک نے انجام دیا جس کے تحت مختلف موضوعات پر اَن گنت نظمیں لکھی گئیں۔

مختصر نظم کو رباعی اور قطعہ کی توسیع کہا جا سکتا ہے جس میں چند مصرعوں میں ایک خیال کو مکمل طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اردو میں بہت سے شعرا نے اسے اپنا ذریعۂ اظہار بنایا۔ مخمورؔ جالندھری نے مختصر نظموں کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ جدید دور میں بہت سے شاعروں نے مختصر نظمیں لکھیں۔ ان میں بعض نظمیں دو اور تین مصرعوں کی بھی لکھی گئیں جس میں ایک مخصوص کیفیت کی کامیاب عکاسی نظر آتی ہے۔ ان نظموں پر جاپانی شعری ہیئتوں 'ہائیکو' اور 'سیڈوکا' کا شبہہ ہوتا ہے۔ حالانکہ مصرعوں میں ارکان کی تعداد کی وہ پابندی اردو کی مختصر نظموں میں نہیں ہے جو جاپانی ہیئتوں میں ضروری ہے۔

اردو شاعری کے جدید ترین تجربات میں نثری نظموں اور آزاد غزل کے تجربات خاصی اہمیت رکھتے

ہیں۔ آزاد نظم میں ارکان، اوزان اور مختلف بحروں کے جو تجربات کیے گئے اور اظہار و بیان کو قافیہ، ردیف، بحر یا ارکان کی مخصوص اور متعین پابندیوں سے جس طرح آزاد کیا گیا اس نے نثری نظموں کے لیے راہیں ہموار کیں۔ آزاد نظم کے تجربے کی کامیابی کے بعد یہ محسوس کیا گیا کہ خیال کو اگر قطعی طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کے اظہار پر وزن و آہنگ کی کوئی پابندی عائد نہ کی جائے تو وہ حقیقت سے زیادہ قریب اور بے ساختہ ہوگا۔ اور فن کار کے مافی الضمیر کو سمجھنے میں زیادہ مددگار ہوگا۔ اردو میں سب سے پہلے نثری نظموں کا تجربہ کس نے کیا یہ بتانا مشکل ہے لیکن اگر نثر کے ایک اسلوب "ادب لطیف" کو نثری نظم کا نقش اول قرار دیا جائے تو یہ تجربہ اتنا نیا نہیں رہتا اس لیے کہ ادب لطیف کی روایت رومانوی تحریک سے وابستہ ہے۔ لیکن نثری شاعری کی شعوری کوشش ۱۹۶۰ء کے قریب شروع ہوئی ہم ۱۹۶۱ء میں سجاد ظہیر کا شعری مجموعہ "پگھلا نیلم" شائع ہوا جس میں بیشتر نظمیں مجموعی یا جزوی حیثیت سے نثری نظمیں تھیں اور جو ادبی حلقوں میں ایک عرصے تک بحث کا موضوع بنا رہا۔ دھیرے دھیرے دوسرے شعرا نے بھی نثری نظمیں لکھنی شروع کیں جس میں جدید شعرا نے زیادہ گرمجوشی سے حصہ لیا۔ احمد ہمیش، شہریار، ڈاکٹر محمد حسن، محمد علوی، عادل منصوری اور بہت سے شعرا نے نثری نظمیں لکھیں۔ بشیر بدر نے اپنی نثری شاعری کو نثری غزل کا نام دیا۔ مثال کے طور پر نثری شاعری کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

آسمان کے سب کواڑے کھول دو
اور اس بجھی بجھی دھرتی کو
کائناتی کرنوں کی
سیمابی روشنیوں سے نہلا دو (نیا سال۔ پگھلا نیلم۔ سجاد ظہیر ص ۱۱۶)

بڈھی کے ساتھ
اخبار پڑھنے میں
مزہ آتا ہے
تمام خبریں
ایک اک کر کے
دم توڑتی چلی جاتی ہیں
اور کچھ اشتہار زندہ رہ جاتے ہیں
خاص طور پر بیماریوں سے متعلق ..... (محمد علوی، تیسری کتاب ص ۶۴)

ایک بچے نے
رنگ برنگے غبارے کو ہنستے ہنستے چھوڑ دیا
آسمان تک اچھلا اور ہنسی کا فوارہ بھی اس کے ہمراہ گیا
آخر جا کر دور گرا
اور ٹکرا کر ٹوٹ گیا
ٹیڑھے میڑھے حرفوں میں
کیا اس غبارے پر لکھا تھا
سکھ، آنند، مسرت، ارماں
جانیں کیا تھا۔ (غبارہ، ڈاکٹر محمد حسن، عصری ادب)

گھر سے باہر نیلی مچھلیاں، سرخ فاختائیں، سنہری گلہریاں اچھی لگتی ہیں لیکن
گھر پر ہر مرد یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیوی ایک عورت ہو۔ (نثری غزل، بشیر بدر)

ہمارے یہاں گذشتہ بیس سال میں تجربہ ایک فیشن بن گیا۔ اور ہر شخص فکر شعر سے زیادہ فکر تجربہ میں غرق ہو گیا تاکہ "ایجادِ بندہ" کی سند پا سکے۔ تجربے کی اس گرم بازاری نے ایک طرف شاعری میں ابہام اور مہملیت مثلاً "اُمان تعزیب پر مجیدن....." (عادل منصوری) اور "نقیب گویائی حرف زن بالارادہ کو شرف ذومعنی....." (افتخار جالب) کے انداز کی شاعری کو جنم دیا اور دوسری طرف اظہار کے لیے نثر و نظم کے فرق کو ختم کر دیا اور اگر کوئی فرق باقی رہا تو صرف اتنا کہ نثری جملے کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھ دیا جائے۔ یہ ایک طویل بحث ہے کہ شاعری کی شناخت اور نثر و شاعری میں حدِ فاصل کیا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ شاعری کے لیے شعری آہنگ ضروری شے ہے۔ یہی شعری آہنگ شاعری کو نثر سے ممیز کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کی نگاہ میں کسی تخلیق میں موزونیت یا شعری آہنگ ضروری نہ ہو لیکن میں ذاتی طور پر ایسی تخلیق کو شاعری نہیں کہہ سکتا جس میں موزونیت اور شعری آہنگ نہ ہو۔ نثر کا خود اپنا حسن ہے اسے نثر کہنے میں کیا رکاوٹ ہے۔ غالب، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتحپوری، اور آل احمد سرور کی نثر ہمارے ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہے اور کسی طرح شاعری سے کم دلکش نہیں ہے۔ نثری شاعری میں بعض لوگوں نے حسن کاری اور جذبے کی تصویر کشی کی کوشش کی ہے لیکن بیشتر جگہوں پر یہ صرف عجز شاعری معلوم ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں نثری نظموں کے تجربے کو بھی کامیاب نہیں کہا جا سکتا حالانکہ بعض حضرات اب بھی اس سلسلے میں کوشاں ہیں اور ان کے تجربات کا سلسلہ جاری ہے۔

غزل اب تک ارکان کے معمولی ردّوبدل کے علاوہ ہیئت کے تجربات سے محفوظ رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ہمارے مزاج میں اس طرح رچ بس گئی ہے اور ہماری تہذیبی زندگی کا ایک حصّہ بن گئی ہے کہ اس کی ہیئت میں تبدیلی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اس کا سانچہ اپنی بعض پابندیوں کے باوجود مختلف خیالات اور شعری تجربات کے اظہار کی سکت رکھتا ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ شاعر اپنے اظہار پر خود کتنا قادر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد کے شعری تجربات اور ہر تحریک کے پرتو اس میں نظر آجاتے ہیں خواہ صوفیانہ خیالات ہوں یا فلسفیانہ اندازِ فکر، ترقی پسند نقطۂ نظر ہو یا جدیدیت، نئے تلازمات، علامت نگاری اور پیکر تراشی لیکن ادھر بعض حضرات نے اس کی ہیئت کو بدلنے کا تجربہ کیا

اس کی پہلی کوشش شاید مظہر امام نے کی تھی لیکن اسے باقاعدہ طور پر علیم صبا نویدی نے شروع کیا۔ ان کی آزاد غزلوں کا مجموعہ "ردِّ کفر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ غزلیں چھوٹے بڑے مصرعوں پر مشتمل ہیں اور پہلی بار انہیں پڑھ کر مستزاد کی طرف ذہن جاتا ہے جس میں ہر مصرعے کے بعد ایک ٹکڑا لگا دیتے ہیں جو اس کے اوّل یا آخری رکن کے برابر ہوتا ہے مثلاً۔

اے طبیبو مرے جینے کے کچھ آثار نہیں　　نہ کرو فکر فردا

اس مسیحا کو دکھا دو تو کچھ آزار نہیں　　ابھی ہو جائے شفا　　(مستزاد)

لیکن آزاد غزل میں ردیف اور قافیے کی پابندی کے ساتھ ایک مصرعے کے ارکان کو کم یا زیادہ کر دیا گیا ہے۔ آزاد نظم کی طرح آزاد غزل کے مصرعے بھی بحر میں ہوتے ہیں لیکن ان کا ایک بحر میں ہونا ضروری نہیں۔ اس آزادی کے لیے "زیادہ وسعت پھیلاؤ اور کشادگی" اور "ترسیل و ابلاغ میں آسانی" کا جواز پیش کیا گیا ہے اگر صرف "وسعت اور پھیلاؤ" اور "ترسیل میں آسانی" ہی اس تجربے کا سبب ہے تو خیال کے اظہار کے لیے آزاد نظم اور مختصر نظم کی ہیئت میں زیادہ گنجائش اور وسعت ہے۔ آزاد غزل میں تو پھر بھی قافیہ اور ردیف کی پابندی آزادیٔ اظہار میں حائل رہتی ہے مثال کے طور پر دو آزاد غزلیں ملاحظہ ہوں۔

کتنے جلتے ہوئے جسموں کا دھواں ہے باہر

ایک ہنگامہ جواں ہے باہر

حاصلِ مدعا نہیں کوئی

سوچتا ہوں تو اس جزیرے میں آج میرے سوا نہیں کوئی　(ردِّ کفر علیم صبا نویدی)

آزاد غزلوں میں دو مصرعوں کو تین ٹکڑوں یا دو اشعار کو ۵، ۶ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو مختصر

نظم کی کیفیت ضرور پیدا ہو سکتی ہے اور چونکہ ان میں ارکان کی پابندی بھی ہے اس لیے یہ اردو میں جاپانی ہیئتوں کی کمی کو پورا کر سکتی ہے لیکن موجودہ شکل میں یہ تجربہ 'ایجادِ بندہ' سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

اردو شاعری میں خاص طور پر گزشتہ بیس سال میں ہیئت کے تجربوں کے ساتھ شعری تجربے بھی کیے گئے جن میں جذبے، فکر اور محسوسات کو مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو ہیئت کے تجربوں سے زیادہ اہم ہیں۔ ان تجربات کے تحت شاعری میں وہ عناصر آئے جو آج کی جدید شاعری کی شناخت سمجھے جاتے ہیں۔ اس سے قبل ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فیض، تاثیر، سردار جعفری، کیفی، جاں نثار اختر، مجاز اور سلام وغیرہ نے کامیاب شعری تجربے کیے تھے جنہوں نے غزل، نظم اور دوسری اصنافِ سخن میں معنویت کی نئی تہیں پیدا کی تھیں اور دلکشی و اثر آفرینی میں اضافہ کیا تھا لیکن یہ تجربات ایک نئی سمت اور انداز کی نشاندہی کر رہے تھے جس کا پس منظر آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور ایٹمی جنگ کی ہیبت سے پیدا ہونے والی غیر محفوظ فضا کا احساس تھا یا پھر گاؤں سے روزگار کی تلاش میں شہروں کی طرف لوگوں کی یورش، تقسیم ملک کے بعد ہجرت اور اس سے پیدا شدہ مسائل یا نئے ترقیاتی منصوبوں کے تحت صنعتوں اور مشینوں سے پیدا ہونے والی ایک نئی تہذیب۔ ان سب چیزوں نے جاگیردارانہ تہذیب یا رومانی تصورات کی پیدا کی ہوئی نرمی، ملائمیت اور سبک روی کو مسمار کر دیا اور غیر محفوظیت، مایوسی، کرب اور اضطراب کے احساس کو فزوں تر کر دیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے انسان کے بنیادی رویے میں تبدیلی آئی اور پرانی اقدار کی وہ وقعت نئی نسل کے ذہن میں نہیں رہ گئی جو ہمارا تہذیبی ورثہ تھا۔ نفسیات کی موشگافیوں نیوراتیت، شعور، لاشعور، خواب، تحلیل نفسی اور آرٹ کی مابعد انسان کو فرار کی نئی راہیں دکھائیں اور وہ شخصیت اور ذات کے خول میں سر چھپا کر یہ سوچنے لگا کہ وہ طوفان سے محفوظ ہو گیا۔ انہیں چیزوں نے جدید شاعری کے ایک بڑے موضوع کو جنم دیا جو احساس کی تنہائی کا موضوع ہے یعنی اس ہنگامہ زار اور ہجوم میں آج کا انسان تنہا اور بے چہرہ ہے اور اپنی شناخت کے لیے پریشان ہے۔ اپنی شناخت اور اظہار کے لیے اس نے شعری تجربے کیے، نئی لفظیات اور تراکیب بنائیں اور بدصورتی اور بدہیئتی میں حسن تلاش کرنے کی کوشش کی۔

یہاں پر اس تفصیل میں جانے کا موقع نہیں کہ یہ تجربات کہاں تک فطری تھے اور کس حد تک اندرونی اور بیرونی اثرات کے زیر اثر تھے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو انتشار، صنعت کاری، بے مقصدیت، تنہائی، اور موت کا خوف مصنوعی طور پر طاری کیا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ہم آج بھی اپنی روایتوں اور رسموں سے جڑے ہوئے ہیں۔ مذہب اور عقیدہ آج بھی ہمارے سماج میں اسی طرح اہم ہے۔ ہمارے تہذیبی اجتماعات اور میلے ٹھیلے، اشنان اور عرس ہماری شہری زندگی میں بھی اسی طرح دخیل ہیں۔ ہمارے شہر اب تک

مکمل طور پر صنعتی شہر نہیں بن سکے ہیں. آج بھی ہمارے ملک کا اسی فیصد حصہ گاؤں پر منحصر ہے۔ وہاں آج بھی محرم میں ہندو مسلمان عورتیں تعزیوں کے پاس بیٹھ کر دوہے روتی ہیں۔ آج بھی بسنت میں بسنتی دوپٹے اور ساون میں درختوں کی شاخوں پر جھولے نظر آتے ہیں۔ دہلی، مدراس، کلکتہ، بمبئی یا کراچی کے چند رہنے والے اپنے اردگرد پھیلے ہوئے حسن کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور موت کے خوف اور صنعتوں کی ہیبت کے نقیب بن جائیں تو وہ حقیقت تو نہیں بن سکتی، ہمارے یہاں صنعتی یا مشینی زندگی اس شکل میں اب تک پیدا ہی نہیں ہوئی ہے جس شکل میں ہمارے کچھ لکھنے والے اسے پیش کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض بیرونی ممالک کی تحریکات کے زیرِ اثر ہم تجریدیت اور نیم وحشی دور کی طرف مراجعت کی کوشش کر رہے ہیں اس کے باوجود ان رجحانات کے تحت شاعری میں جو داخلی تجربات ہوئے وہ یقیناً اہم ہیں۔ ان داخلی تجربات میں علامت پسندی، پیکریت، رمزیت، استعاراتی اسلوب اور بے ساختہ یا غیر مصنوعی اظہارِ بیان بہت اہم ہے۔ یہ چیزیں ترقی پسند شعراء کے یہاں بھی ملتی ہیں لیکن ان کی شکل قدرے مختلف ہے جدید شعرا کے طرزِ اظہار اور Treatment نے ان کو نیا بنا دیا ہے۔ دوسرے علامت یا پیکریت پہلے کسی تحریک کی شکل نہیں رکھتی تھی۔ آج شعوری کوشش اور کثرت کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ علامت اور پیکریت نے ہماری شاعری میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے تو شاید غلط نہ ہوگا بہرحال گزشتہ بیس سال میں شعراء نے بڑی آزادی، بلکہ بے دردی کے ساتھ پیکر تراشی اور علامتوں کا استعمال کیا جہاں یہ علامتیں شخصی اور ذاتی سطح پر تخلیق کی گئیں۔ وہاں شاعری میں ابہام کو راہ ملی لیکن جہاں ان کا عمل غیر ذاتی تھا۔ اور ان کی بنیاد مشاہدے اور فکر پر تھی وہاں شاعری میں نئی معنویت اور حسّیت پیدا ہوئی۔ غزل اور نظم دونوں اصناف میں پیکر تراشی اور علامتوں کے استعمال سے ایک نیا پن پیدا ہوا بعض شعراء نے غزلوں اور نظموں میں بے ساختہ اور بے لاگ اظہارِ بیان کو جنم دیا اور نئی علامتوں، نئی تشبیہوں اور استعاروں کے خوبصورت استعمال سے شعری معنویت میں اضافے کیے ان میں عام طور پر خلیل الرحمن اعظمی، ناصر کاظمی، مصطفےٰ زیدی، اختر الایمان، عمیق حنفی، احمد فراز، جاں نثار اختر، باقر مہدی، حسن نعیم، قاضی سلیم، راج نرائن راز، افتخار عارف، شہاب جعفری، محمد علوی، ساجدہ زیدی، اعجاز فاروقی، زبیر رضوی بشیر بدر، شہریار، براج کومل، وحید اختر، زاہدہ زیدی، حکیم منظور، ندا فاضلی اور حسن کمال وغیرہ نے حسّی تصورات، لطیف احساسات اور خوبصورت علامت و پیکر تخلیق کر کے شعری افق کو وسعت دی، یہاں یہ اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان شعرا کی تخلیقات کا تجزیہ کیا جا سکے۔ یا ان کے کلام سے تفصیلی اقتباسات پیش کیے جا سکیں۔ اس لیے صرف چند مثالیں پیش ہیں تاکہ ان تجربات کی ایک جھلک سامنے آ سکے۔

مدّتیں گزریں مرے دِل کو ہوئے ویرانہ
آندھیاں بھی نہیں آتیں۔
کہ اڑے ریت مٹے نقشِ سراب
اور اک درد کا چشمہ
مندمل زخموں سے پھوٹے نئی خنکی لیکر (ریت اور درد - باقر مہدی)

اے سمندر کیا ہے تو
پیاس کا سوکھا گلا
جس میں دنیا بھر کے دریا جذب
جنکی جلتی اور جھلستی آہ
یہ اساڑھی، ساونی اور بھادویں بادل
خون و اشک و خاک کا نیلا ورق
حسرتوں کا ایک صحرائے لق و دق
کیا ہے تو (شجر صدا۔ عمیق حنفی ص ۶۳)

گرجتی
ٹوٹ کر گرتی گھٹائیں
آسمانوں سے مسلسل سنگ باری
نوحہ گر دیوار و در
زخمی چھتیں
شیشوں پہ پانی قطرہ قطرہ پھیلا بڑھتا
پھیلتی ٹوٹتی ننھی لکیریں
جو تھکے ہاتھوں کی ریکھاؤں کی صورت
نت نرالے روپ بھرتی ہیں۔ (مکتی۔ قاضی سلیم)

مجھے شک کی نظروں سے کیوں دیکھتے ہو۔

مری بات سچ ہے!
مری بات سچ ہے! میں کل رات ناگوں سے لڑتا رہا ہوں۔
کنہیا نہیں میں جو ناگوں کو نتھ لوں
میں ایسا بڑا کوئی انسان کب ہوں۔
جو حرفِ شکایت بھی لب پر نہ لائے۔ — (لذت لفظوں کی، راج نرائن راز، ص ۵۰)

کس قیامت خیز چپ کا زہر سناٹے میں ہے
میں جو چیخا ہوں تو سارا شہر سناٹے میں ہے — (افتخار عارف)

آراستہ بدن پہ ہیں زخموں کے پیرہن
شاید یہ لوگ کوئے بہاراں سے آئے ہیں — (جاں نثار اختر)

آندھی کو اپنی شاخ پہ رد کے کھڑے رہے
یوں احتجاج کچھ نئے اشجار کر گئے۔ — (باقر مہدی)

برف کے پھولوں سے روشن ہوئی تاریک زمیں
رات کی شاخ سے جیسے مہ و اختر برسے (بشیر بدر)

ایک شعر یا نظم کا ایک ٹکڑا کسی شاعر کے شعری تجربے کو پیش کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا پھر بھی ان گزشتہ اقتباسات میں ان شعری تجربات کی ایک جھلک ضرور دیکھی جا سکتی ہے جس کا پچھلے صفحات میں ذکر کیا گیا ہے عہدِ جدید میں بہت سے شعرا نے جدید حسیت اور عصری بصیرت کی روشنی میں استعارات اور الفاظ کو نئی معنویت سے آشنا کیا ہے یا علامت نگاری، رمزیت، اور پیکر تراشی کی کاوشیں کی ہیں ایسے تمام ناموں کا ذکر یا ان کے کلام سے مثالیں دینے کے لیے ایک مضمون کافی نہیں ہو سکتا اسی لیے بہت زیادہ ناموں اور مثالوں سے گریز کیا گیا ہے۔ گزشتہ بیس سال میں کیے گئے بیشتر شعری تجربوں نے اردو شاعری کے حسن میں یقیناً اضافہ کیا ہے اور اظہار و بیان کے نئے دلکش اور توانا پہلو پیدا کیے ہیں۔

غزلیں

حبیب جالب

لاہور

دنیا ہے کتنی ظالم ہنستی ہے دل دکھا کے
پھر بھی نہیں بجھائے ہم نے دیے وفا کے

ہم نے سلوکِ یاراں دیکھا جو دشمنوں سا
بھر آیا دل ہمارا روتے ہیں منہ چھپا کے

کیونکر نہ ہم بٹھائیں پلکوں پہ ان غموں کو
شام و سحر یہی تو ملتے ہیں مسکرا کے

تا عمر اس ہنر سے اپنی نہ جان چھوٹی
کھاتے رہے ہیں پتھر ہم آئنہ دکھا کے

اُس زلفِ خم بہ خم کا سر سے گیا نہ سودا
دنیا نے ہم کو دیکھا سو بار آزما کے

جالب ہُوا قفس میں یہ راز آشکارا
اہلِ جنوں کے بھی تھے کیا حوصلے بلا کے

شاذ تمکنت

حیدرآباد (ہندوستان)

زندگی قید ہے، دنیا در و دیوار لگے
اپنی آواز بھی زنجیر کی جھنکار لگے

اُس کا ہونا ہی بھری بزم میں ہے وجہِ سکوں
کچھ نہ بولے بھی تو وہ میرا طرفدار لگے

خواب کو چُھولیں تو تعبیر کا جادو بولے
سنگ کو ہاتھ لگائیں تو صنم زار لگے

بات کی جھیل میں تو راز کا کنکر پھینکے
کاغذی ناؤ تمنّا کی کہیں پار لگے

دل کی دھڑکن پہ قدم رکھتا ہو جس طرح کوئی
راز بُنتی ہوئی جیسے تری رفتار لگے

وہ جو نقصان کے سودے کا مزہ جانتا ہے
لوگ دیوانہ کہیں گے مجھے فن کار لگے

ہم وہ بے بس کہ سرِ معرکۂ عمرِ رواں
پُشت ہا پُشت کی لٹکی ہوئی تلوار لگے

ہائے اِک اہلِ دُکاں سے ہے ندامت کیا کیا
ہم تہی جیب تھے آنکھوں سے خریدار لگے

کسی خوبی کا تصوّر ہی نہیں تیرے بغیر
حُسن جس جا نظر آئے ترا کردار لگے

تو وہ سادہ کہ تجھے پیار سکھانا ہوگا
بات ایسی ہو کہ اقرار نہ انکار لگے

شاذ اب کون کرے پہلے مسیحا کا علاج!
کون پُرساں ہو جب اک عہد ہی بیمار لگے

فارؔغ بخاری

پشاور

ہو مژدہ اہلِ چمن جاں نثار لوٹ آئے
حریمِ زلف سے پھر سوئے دار لوٹ آئے

ہوا کی ہمسفری کا انہیں بھی سودا تھا
ابھی چلے بھی نہ تھے پا فگار لوٹ آئے

نہ رک سکے وہ جنہیں تھا شعورِ منزل کا
جو دل شکستہ تھے مثلِ غبار لوٹ آئے

محبتوں کا چلن ہے تو کیا عجب ہے کہ پھر
ہوائے موسمِ گل ایک بار لوٹ آئے

یہ نفرتوں کے اندھیرے چھٹیں تو ممکن ہے
کہ پھر وہی سحرِ زر نگار لوٹ آئے

خزاں گزیدوں کی فارؔغ یہی تمنّا ہے
خدا کرے کہ چمن میں بہار لوٹ آئے

شاہ نور اختر
میری لینڈ - امریکہ

دل کے گھاؤ دکھائے نہ جائیں۔ بے چینی پر یار ہنسے
چُپ رہنے سے دم اُلجھے ہے، روئیں تو سنسار ہنسے

چھنے گئے یا ہوا سے بکھرے یا شاخوں پر ہی مرجھائے
پھول بہت ہی پچھتائے کہ پل دو پل بے کار ہنسے

کل تک تو پتوار کو دیکھا تھا، مانجھی کے قبضے میں
آج یہ الٹی رُت دیکھی کہ مانجھی پر پتوار ہنسے

ان کے در سے ہم اٹھے تو استغنا کا جوہر لائے
لیکن خالی ہاتھ سمجھ کر ہم کو، دنیا دار ہنسے

جب بھی ملے وہ ہمیں کہیں تو ان کے تیور کیا بتلائیں
الفت کا اقرار لبوں پر آنکھوں میں انکار ہنسے

ان سے خاص لگن ہے ہم کو اپنی لگن میں مست ہیں ہم
دنیا ہم پر ہنستی ہے۔ اک بار نہیں سو بار ہنسے

اخترؔ ہم نے میخانے میں جانے سے توبہ کر لی تھی
لیکن ہم پھر وہیں گئے تو ساقی اور مے خوار ہنسے

شاہین

آٹوا۔ کینیڈا

کر کے تخلیق ہمیں بھول گیا ہو جیسے
پالنے والا کوئی اور خدا ہو جیسے

فیصلہ اس کا عتاب ساری ندامت میری
یہ مرے جُرمِ خموشی کی سزا ہو جیسے

اپنے انداز میں چاہا ہے تمہیں سب سے الگ
مجھ کو اصرار نہیں تم مجھے چاہو جیسے

اب تو ہستی کا مقدر ہیں تہی مانگیاں
ذہن اور جیب کا رشتہ بھی بڑا ہو جیسے

میں نے چپکا دیے اس طرح ورق کچھ باہم
جزدِ ہستی مرا ماضی نہ رہا ہو جیسے

نام یکساں ہے سمندر کو ترا ہو کہ مرا
سب پریشاں ہیں یہ طوفان نیا ہو جیسے

اپنے لب کھول کے مقتولِ وفا ہو جانا
حلِ عقدہ کوئی اس کے نہ سوا ہو جیسے

اب بھی شاہین اسی سمت قدم اٹھتے ہیں
میری خاطر کوئی دروازہ کھلا ہو جیسے

سفر ہے ختم مگر بے گھری نہ جائے گی
ہمارے گھر سے یہ پیغمبری نہ جائے گی

نظر گنوا بھی چکے تجھ کو دیکھنے والے
افق افق تری جلوہ گری نہ جائے گی

میں اپنے خواب تراشوں انہیں بکھیروں بھی
مری سرشت سے یہ آذری نہ جائے گی

حسیں ہے شیشہ و آہن کا امتزاج مگر
تری سیاستِ آہن گری نہ جائے گی

میں سب کے زخمِ جنوں پھر انہیں زبانیں دوں
بلا سے دل کی مرے ابتری نہ جائے گی

اگرچہ سرد بہت ہے دیارِ قطبِ شمال
سخن وروں کی سخن پروری نہ جائے گی

حسن عابدی

کراچی

تشنہ کاموں کو یہاں کون سبُو دیتا ہے
گُل کو بھی ہاتھ لگاؤ تو لہو دیتا ہے

نیشتر اور سہی، کارِ دگر اور سہی
دلِ صد چاک اگر اذنِ رفو دیتا ہے

تابِ فریاد بھی دے، لذّتِ بیداد بھی دے
دینے والے جو مجھے سوزِ گلو دیتا ہے

ہم تو برباد ہوئے برگِ خزاں کی صورت
شاخِ گُل کون تجھے ذوقِ نمو دیتا ہے

مُنصفو، ہاتھ سے اب دشنہ و خنجر رکھ دو
کیا بُرا ہے اگر انصاف عدو دیتا ہے

اے خداوند مِرے شعر کی قیمت کیا ہے
ایک روٹی کا نوالہ جسے تُو دیتا ہے

شہرِ نا پُرساں میں کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں
بام و دَر روشن ہیں لیکن راستہ ملتا نہیں

فصلِ گُل ایسی کہ ارزاں ہو گئے کاغذ کے پھُول
اب کوئی گُل پیرہن، زرّیں قبا ملتا نہیں

آشنا چہروں سے رنگِ آشنائی اُڑ گیا
ہم زباں اب خشک پتوں کے سوا ملتا نہیں

ایک سنّاٹا ہے شبنم سے شُعاعِ نُور تک
اب کوئی آنچل پسِ موجِ صبا ملتا نہیں

حاکموں نے شہر کے اندر فصیلیں کھینچ دیں
دن میں بھی اب کوئی دروازہ کھُلا ملتا نہیں

اتنے بے پروا ارادے، اتنے بے توفیق غم
ہاتھ اٹھتے ہیں، مگر حرفِ دُعا ملتا نہیں

اکبر حیدرآبادی

آکسفورڈ

کُل عالمِ وجود کہ اِک دشتِ نور تھا
سارا حجاب تیرہ دلی کا قصور تھا

سمجھے تھے عہدِ عشق میں ہم سُرخرو ہوئے
دیکھا مگر تو شیشۂ دل چُور چُور تھا

پہنچے نہ یوں ہی منزلِ اظہارِ ذات تک
تحتِ شعور اک سفرِ لاشعور تھا!

تھا جو قریب، اُس کو بصیرت نہ تھی نصیب
جو دیکھتا تھا مجھ کو — بہت مجھ سے دور تھا

مُبہم تھے سب نقوش نقابوں کی دُھند میں
چہرہ اک اور بھی پسِ چہرہ ضرور تھا!

جمیل مدنی

لندن

محفلِ گُل عذار میں، انجمنِ بہار میں
اُن کا بدل کوئی نہیں ایک ہیں وہ ہزار میں

چار پہر کی شب مگر یوں کٹی ہجرِ یار میں
جیسے ہزارہا ابد بیتے ہوں انتظار میں

بزمِ طرب کی داستاں شمعِ خموش و سوختہ
بیم و رَجا کا فاصلہ نالۂ بے قرار میں

ایک حسینِ گُل بدن، ایک دلِ فُغاں کُناں
اک پہ نہیں کچھ اختیار ایک ہے اختیار میں

طولِ فراق و اعتبار بات ہے اتنی مختصر
جان اٹک کے رہ گئی دیدۂ انتظار میں

تُو نے مجھے زباں تو دی جو نہ دیا تو مدعا
کیسے کہوں کہ تیر ہے اس دلِ داغدار میں

حُسن ہے ایک سلسلہ عشق ہے رشتۂ وفا
کیوں ہو جمیلؔ غم زدہ ایک حسیں کے پیار میں

اعجاز اعظمی
ملائشیا

دل میں شعلوں کی لپک ہے، لب پہ پھولوں کی ہنسی
اک معمہ بن گیا ہے عصرِ نو کا آدمی

اکتسابِ علم و فن ہو یا ریاضِ بندگی
یہ بھی اک سوداگری ہے وہ بھی اک سوداگری

چونک اُٹھے یارانِ نکتہ سنج وآوازِ آشنا
دور ہٹ کر میں نے اس انداز سے آواز دی

ظلمتوں کی گود میں پلتے رہے اطفالِ نور
پتھروں کے دیس میں ہوتی رہی شیشہ گری

وہ اخوت، وہ مروت، وہ محبت کیا ہوئی
کیا سبب ہے آج ہم ملتے ہیں جیسے اجنبی

جب کسی لاچار کو مجھ سے سہارا مل گیا
مل گئی بھرپور میری آتما کو شانتی

حامد جعفری
بھوپال

واسطہ صرف واجبی رکھنا
دوستوں جیسی دوستی رکھنا

دل لگانا نہ جی میں گھر کرنا
خود کو دنیا میں اجنبی رکھنا

قصے اپنے یہاں وہاں سُننا
بات اپنی گلی گلی رکھنا

صورتِ اشک خوں رلائے گا
اک تعلق کبھی کبھی رکھنا

شوق اپنا کہ پاس ہو ہردم
طور اس کا کہ بے رُخی رکھنا

رشیدہ عیاں

نیوجرسی۔ امریکہ

صبر کی سِل بھی نہ پگھلے ہے یہی ڈر لوگو
ہے سوا نیزہ جو سورج مرے سر پہ لوگو

موند کر آنکھیں عناں تھامے ہوئے بیٹھی ہوں
مڑ کے دیکھوں گی تو ہو جاؤں گی پتھر لوگو

اجنبی ہیں در و دیوار، نئے ہیں آثار
کچھ بتاؤ مجھے، کیسا تھا مرا گھر لوگو

ورقِ ذہن پہ شاید کوئی پہچان اُبھرے
دیکھ تو لو، مرا چہرہ مرا پیکر لوگو

ہے یہ تہذیبِ جنوں، رسم تو باقی رہ جائے
عہد ایفا کرو، مارو مجھے پتھر — لوگو

روح کے زخم پرانے ہیں، بہت گہرے ہیں
ڈھونڈ کر لاؤ کہیں سے نئے خنجر لوگو

مٹھیاں بھر کے رُخِ آفاق پہ مٹی پھینکو
اپنے ہی سر پہ وہ خاک آئے گی اُڑ کر لوگو

کس گنہگار کے ہاتھوں نے چھوا تھا اس کو
آسودی ہو گیا کیوں فکر کا مرمر لوگو

بدر منیر الدین بدر

راولپنڈی

لے چلے ہم کو چاہے جدھر راستہ
تیرے در تک ہی آئے گا ہر راستہ

وہ مرے گھر تو آیا، مگر اس طرح
جیسے آئے کوئی بھول کر راستہ

مل گئی چند لمحوں میں منزل اُنہیں
ڈھونڈتے جو رہے عمر بھر راستہ

منزلیں راستہ دیکھتی ہیں مرا
کر رہا ہے مجھے در بدر راستہ

پھر کوئی بھی مسافر نہ بھٹکے کبھی
بولنا سیکھ جائے اگر راستہ

کھا گئی نقشِ منزل شبِ تیرگی
جب دکھانے لگا راہبر راستہ

رہروِ منزلِ عشق کی خیر ہو
ہے ہر اک راستہ پُر خطر راستہ

اجنبی شہر میں ہوں تو غیروں سے بھی
پوچھ لیتے ہیں اے خوش نظر راستہ

وقار ناصری
لکھنؤ

ختم جادو کا تماشا ہو چکا
ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہو چکا

بن چکیں کاغذ پہ نہریں بھی بہت
دُور تک سرسبز صحرا ہو چکا

خشک جھیلیں ہو گئیں لبریز پھر
موجزن بے آب دریا ہو چکا

ہو چکیں خوشحال ساری بستیاں
اور اِس کا خوب چرچا ہو چکا

ہو چکے آباد ویرانے تمام
جنگلوں کا خوف پھیکا ہو چکا

چھٹ گئی ساری سیاہی چھٹ گئی
ایک اک منظر سنہرا ہو چکا

بھر چکے جو پیٹ خالی تھے وقارؔ
اک سخی حاتم کا شہرہ ہو چکا

یوں لپکتے کب شرارے ریت میں
چھُپ گئے ہیں چاند تارے ریت میں

ہم جو بچھڑیں گے تو ملنا ہے محال
نقش ڈھونڈو گے ہمارے ریت میں

لے رہا تھا دور تک لہریں سراب
تھے کہاں پانی کے دھارے ریت میں

ننھے مُنّے آرزوؤں کے محل
ڈھہ گئے دریا کنارے ریت میں

اب کہاں وہ قافلے وہ محملیں
کھو گئے خوش رنگ دھارے ریت میں

مل گئے ذرّوں میں ذرّوں کی طرح
ریت کے ٹیلے تھے سارے ریت میں

حمیرا رحمان

نیویارک

اندھیارا بھی اپنے گھر کا کتنا اپنا لگتا ہے
اُس کے گھر سے تو سورج بھی بیگانہ سا لگتا ہے

میں جب اپنی آنگن کیاری میں بیلے کے پھول چنوں
سجنا! کیا بتلاؤں مجھ کو کتنا اچھا لگتا ہے

سکھیوں نے، مہندی سے میرے ہاتھوں پر جو نام لکھا
کہتے ہیں چہرے مُہرے سے اچھا لڑکا لگتا ہے

تم یہ کیا پچھلے موسم کے شکوے لے کر بیٹھے ہو
خوشبوؤں کے میلے میں یہ ذکر بُرا سا لگتا ہے

آئے تھے تو ساتھ اپنے ہنگامے لے کر آئے تھے
بچھڑے ہو تو سپنوں میں بھی سونا سونا لگتا ہے

اُجلے نگر کے اُجلاپے کا، ہم سے پوچھو ہم سے سنو
اب تو حمیرا اُجلا پن بھی میلا میلا لگتا ہے

اختر لکھنوی

کراچی

میری بستی میں اُجالوں کا گزر بھی ہو گا
یہ اگر شب ہے تو ہنگامِ سحر بھی ہو گا

ہم تو ہیں شہرِ تضادات کے رہنے والے
ہم میں ہر خندہ بلب، خاک بسر بھی ہو گا

شعلے جب اٹھیں گے لکھنے کو گھروں کی تاریخ
ان کے اک باب کا عنواں مرا گھر بھی ہو گا

اب اسی رُخ پہ جلائیں گے چراغوں کو ہم
اے ہوا آج سے رُخ تیرا جدھر بھی ہو گا

یہ جو بکنے کے لیے رکھتے ہیں بازاروں میں
انھی کاسوں میں کسی دن مرا سر بھی ہو گا

بند کمروں میں ابھی فیصلے ہوتے ہیں تو ہوں
فیصلہ ایک سرِ راہگزر بھی ہو گا

علی عباس اُمید
بھوپال

اتنے افسردہ نہ ہو دیوار و در میں کچھ تو ہے
دشت میں سبزہ نہ تھا ویران گھر میں کچھ تو ہے

بھولے بسرے دل کا بھی آ جاتا ہے اکثر خیال
قحطِ احساسات میں بھی اُس نظر میں کچھ تو ہے

سرد صبحوں نے کیا تھا جتنے دروازوں کو بند
اب وہ کھُلنا چاہتے ہیں دوپہر میں کچھ تو ہے

لفظ پہلے گونج تھا اب مل گئے معنی اسے
کچھ نہ تھا منزل پہ لیکن اب سفر میں کچھ تو ہے

سُرخ رو سورج کے چہرے پر ہے خوابوں کا لہو
شام بے غازہ سہی لیکن سحر میں کچھ تو ہے

دھند کا اک سلسلہ در سلسلہ آنکھوں میں ہے
جستجو تیرے لیے اس خشک و تر میں کچھ تو ہے

ہر طرف کربِ عمل اور بے یقینی ہے رواں
پھر بھی ہے اُمید تیرے ہی نگر میں، کچھ تو ہے

جوش مندوزی
ٹورنٹو

ہوئی نہ تھی مری تخلیق گر فنا کے لیے
فنا وسیلہ بنی کیوں مری بقا کے لیے

وہ بے نیاز مرے حال سے ہے خود واقف
اٹھاؤں ہاتھ ضروری نہیں دُعا کے لیے

قصور وار نگاہیں تھیں، بے خطا ٹھہریں
ہدف بنایا گیا دل مرا سزا کے لیے

کہو تو آج بھی مر جائیں، مرتے آتے ہیں
نہیں ہے وقت مقرّر کوئی قضا کے لیے

محبّتوں کا ہے بھوکا نصیحتوں کا نہیں
نہ چھیڑ دو جوش کو اے ناصحو خدا کے لیے

غلام حسین ساجد

لاہور

آئینہ آسا یہ خوابِ نیلمیں رکھوں گا میں
اور اس اُجلے ستارے پر یقیں رکھوں گا میں

عمر بھر خوش آئے گی کیا میری تنہائی مجھے
رابطہ ہر چند لوگوں سے نہیں رکھوں گا میں

شہر ہی ایسا اندھیرا ہے کہ اک دن بھول کر
طاقچے میں پھر چراغِ اوّلیں رکھوں گا میں

راس آتی ہی نہیں جب پیار کی شدت مجھے
اک کمی اپنی محبت میں کہیں رکھوں گا میں

ایک سایہ سا گزر جائے گا موجِ نور سے!
جب اُجالے میں وہ شاخِ یاسمیں رکھوں گا میں

ہاں یہی مٹی وراثت ہے مرے اجداد کی
لوٹ کر اپنی کمائی بھی یہیں رکھوں گا میں

جہاں بھر میں مرے دل سا کوئی گھر ہو نہیں سکتا
کہ ایسی خاک پر ایسا سمندر ہو نہیں سکتا

رواں رہتا ہے کیسے چین سے اپنے کناروں میں
یہ دریا میری بے تابی کا مظہر ہو نہیں سکتا

کسی کی یاد سے دل کا اندھیرا اور بڑھتا ہے
یہ گھر میرے سُلگنے سے منوّر ہو نہیں سکتا

بہت بے تاب ہوتا ہوں میں اس کو دیکھ کر لیکن
ستارہ تیری آنکھوں سے تو بڑھ کر ہو نہیں سکتا

یہ موجِ عمر ہر شے کو بہت تبدیل کرتی ہے
مگر جو سانس لیتا ہے وہ پتھر ہو نہیں سکتا

میں اُس دنیا میں رہتا ہوں کہ جس دنیا کے لوگوں کو
خوشی کا ایک لمحہ بھی میسّر ہو نہیں سکتا

ظفر زیدی

نیویارک

اک شجر ایسا محبت کا لگایا جائے
جس کا ہمسائے کے آنگن میں بھی سایا جائے

یہ بھی ممکن ہے بتا دے وہ کوئی کام کی بات
اک نجومی کو چلو ہاتھ دکھایا جائے

دیکھنا یہ ہے کہ کون آتا ہے سایہ بن کر
دھوپ میں بیٹھ کے لوگوں کو بلایا جائے

یا مری زیست کے آثار نمایاں کر دے
یا بتا دے کہ تجھے کیسے بھلایا جائے

اُس کے احسان سے انکار نہیں ہے لیکن
نقش پانی پہ ظفر کیسے بنایا جائے

لیاقت علی عاصم

کراچی

ملے تو کاش مرا ہاتھ تھام کر لے جائے
وہ اپنے گھر نہ سہی مجھ کو میرے گھر لے جائے

بتانِ شہر تمہارے لرزتے ہاتھوں میں
کوئی تو سنگ ہو ایسا کہ میرا سر لے جائے

دیا کروں گا یونہی تیرے نام کی دستک
مرا نصیب مجھے لاکھ در بدر لے جائے

وہ آدمی ہو کہ خوشبو بہت ہی رُسوا ہے
ہوائے شہر جسے اپنے دوش پر لے جائے

مرے قریب سے گزرے تو اہلِ دل بولے
اُٹھا کے کون پرندہ لہو میں تر لے جائے

پلٹ کے آئے تو شاید نہ کچھ دکھائی دے
وہ جا رہا ہے تو عاصم مری نظر لے جائے

عارف امام

کراچی

فصیلِ ذات سے باہر بھی دیکھنا ہے مجھے
شکستِ خواب کا منظر بھی دیکھنا ہے مجھے

ابھی تو میں نے فقط بارشوں کو جھیلا ہے
اب اس کے بعد سمندر بھی دیکھنا ہے مجھے

بنا رہا ہوں ابھی گھر کو آئینہ خانہ
پھر اپنے ہاتھ میں پتھر بھی دیکھنا ہے مجھے

سپاہِ کارِ جہاں سے نمٹ چکا ہوں مگر
تمہاری یاد کا لشکر بھی دیکھنا ہے مجھے

ابھی تو غم کو سخن کرنا سہل ہے عارف
مقامِ عجزِ سخنور بھی دیکھنا ہے مجھے

جاوید صبا

کراچی

اپنی آواز کی تکرار سے باتیں کرنا
جشنِ تنہائی ہے دیوار سے باتیں کرنا

تو ہے خاموش ترا حسنِ سخن بولتا ہے
کیا ترے حاشیہ بردار سے باتیں کرنا

کل کسی وقت بھی بڑھ سکتی ہے قیمت میری
آج دو ٹوک خریدار سے باتیں کرنا

روشنی گُل کیے دیتی ہے توقع کے چراغ
تم ذرا اب مرے پندار سے باتیں کرنا

تجھ سے شکوہ ہے عبث شیوۂ محبوباں ہے
ایک ہی وقت میں دو چار سے باتیں کرنا

اسما وارثی نازؔ
ٹورنٹو

جانے کب تک ابھی گردش میں یہ دن رات رہیں
ہم پہ لازم ہے نہ یوں کشتۂ حالات رہیں

مسکرا کر مجھے دیکھا ہے کسی قاتل نے
کیسے قابو میں بتاؤ مرے جذبات رہیں

ہم نے ہر رات کو خوابوں میں تمہیں دیکھا ہے
خط وہ لکھتے ہیں جو محرومِ ملاقات رہیں

ربط و ایقان ہی دراصل ہیں الفت کی اساس
کس لیے دل کے قریں فکر کے لمحات رہیں

آسماں کا یہ کرم روزِ ازل سے ہے ندیم
درد میں ڈوبے ہوئے پیار کے لمحات رہیں

دل سے ہو پاس اگر تم تو زباں سے بھی کہو
کب تلک سہمے، ادھورے مرے جذبات رہیں

جمالؔ زبیری
ٹورنٹو

جو دل پہ چل رہی ہے وہ شمشیر آپ ہیں
دل کے ہر ایک زخم کی تعبیر آپ ہیں

الزام اب کسی کو بھی دینے سے فائدہ
بن کر جو مٹ گئی مری تقدیر آپ ہیں

میں سادہ دل ہوں سادہ سی تحریر ہے مری
کوئی نہ پڑھ سکا جو وہ تحریر آپ ہیں

کیا پوچھتے ہیں دل میں مرے رہ گیا ہے کیا
جو دل میں رہ گیا ہے وہی تیر آپ ہیں

مجھ سے چھڑا کے جان نہ جا پائیں گے کہیں
پہنے ہوئے وہ ہاتھ میں زنجیر آپ ہیں

ہر اک کو رحم آپ پہ آنے لگا جمالؔ
اک درد سے بھری ہوئی تصویر آپ ہیں

رضی مجتبیٰ

پیرس

پھر کوئی موسم مری ہر شاخ پہ گُل کار تھا
پھر مری تنہائیوں پہ رنگ و بُو کا بار تھا

کثرتِ مفہومِ غم تو دیکھیے کہ ہر کوئی
حرفِ پندِ نو لیے لب پر مرا غم خوار تھا

میں ہی اپنی جستجو کی راہ کا پھیلاؤ بھی
میں ہی اپنی جستجو کی راہ میں دیوار تھا

تھی ہر اک جنسِ گراں قیمت سے کیا رغبت مجھے
جب کہ خالی جیب میں پھرتا سرِ بازار تھا

تابِ توہینِ تمنّا تھی غرورِ عشق سے
غم زدہ ہونا تو میرا غمزۂ پندار تھا

تھی مری آنکھوں میں میری تشنگی کی آب و تاب
اور وہ سیرابیوں کے رنگ سے سرشار تھا

صبح کرنا معرکہ تھا اس ستم کی رات کا
جس کا ہر پل، سر پہ لہراتی ہوئی تلوار تھا

دل تری ہی روشنی کا آئینہ تھا جانِ من
میرے پہلو میں ترا ہی شعلۂ رخسار تھا

رضی مجتبیٰ
پیرس

صدائے وہم ہوں ہنگامۂ قیاس نہیں
مرا سراغ سرِ محشرِ حواس نہیں

ہمارے ہوش پہ چھایا ہے اس خلش کا خمار
جو دل سے دُور نہیں اور جاں کے پاس نہیں

وہی نگاہ جو مجھ کو کبھی سمجھ نہ سکی
اسی کو میں نے یہ سمجھا کہ ناشناس نہیں

مرا وجود ہے نقشِ نشاطِ تشنہ لبی
حصولِ آب کی خوگر تو میری پیاس نہیں

قبائے زخم میں دیکھے گئے ہیں دیوانے
جنوں لباس بھی تج دے تو بے لباس نہیں

ترے فراق کی گھڑیاں بھی قہر ہیں جاناں
ترے وصال کا موسم بھی مجھ کو راس نہیں

کسی کے ذوقِ ستم کی شکار ہو جائے
کچھ اس سے بڑھ کے مری آرزو کو آس نہیں

اشفاق حسین

ٹورنٹو

ہوگا کوئی بے نشان جھونکا
دستک مرے در پہ کون دے گا

اونچی تھی فصیلِ شہر لیکن
خوشبو کے قدم کو کس نے روکا

اپنی ہی صلیب خود اُٹھائے
ہر شخص ملا بدن دریدہ

آندھی کو دعائیں دو کہ اُس نے
جنگل کا سکوت توڑ ڈالا

ساحل تھا قریبِ تشنگی میں
دریا تھا اگرچہ ساتھ بہتا

یوں آئی کسی کی یاد جیسے
بارش کا زمیں پہ پہلا قطرہ

یہ کون گیا اُداس کر کے
کیوں درد ہے دل میں ہلکا ہلکا

کانٹے کی طرح جو تھی زباں پر
وہ بات میں تجھ سے کیسے کہتا

شاید تجھے یاد کچھ دلائے
یہ شام کا سرمئی اُجالا

یہ شام بھی مجرمِ وفا ہے
اس شام بھی رہ گیا میں تنہا

وہ کس کی گلی تھی جس میں اشفاقؔ
پتھر بھی لگا گلاب جیسا
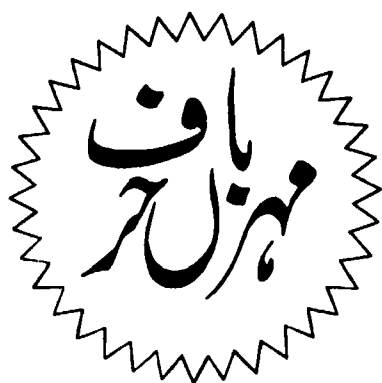
محمد علی صدیقی ۔ کراچی

"اُردو انٹرنیشنل" کا تیسرا شمارہ ملا ۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ نے شمالی امریکہ ہی سے نہیں بلکہ پوری اُردو دُنیا کے لیے قابلِ فخر سہ ماہی ادبی جریدہ کی داغ بیل ڈالی ہے ۔ تخلیقات کا معیار خوب سے خوب تر کی جانب رواں ہے ۔ دوسرے شمارہ میں "بیروت" پر خوبصورت نظمیں شامل کی گئی ہیں ۔ ڈاکٹر قمر رئیس کا مضمون پسند آیا ۔ تازہ شمارہ میں انور احسن صدیقی کی نظم "نذرِ جوش" بطورِ خاص پسند آئی ۔ اس کے علاوہ جوش اور فراق کے بارے میں گوشہ بہت بھاری بھرکم ہے ۔ ثقافت کے عنوان کے تحت فیض احمد فیض کا مضمون خاصے کی چیز ہے ۔ حصّہ نظم میں انور احسن صدیقی کی نظم "مظلومین بیروت کی درخواست" کے علاوہ واحد بشیر، منیر الدین احمد کا ترجمہ، انیس انصاری، فاروق حسن اور ظفر زیدی کی تخلیقات پسند آئیں ۔ افسانہ کے سیکشن میں رام لعل کا ایک افسانہ "ایک اور پاکستانی"، رشید امجد کا افسانہ "بند کنوئیں میں سرسراہٹ" کمال مصطفےٰ کا افسانہ "نوحہ" مرزا حامد بیگ کا افسانہ "نیند کے ماتے" اور علی عباس اُمید کا افسانہ "بے زمینی کا المیہ" قابلِ توجہ تخلیقات ہیں ۔ حصّہ غزل بھی جاندار ہے ۔ دوسرے شمارہ میں اقبال مجید کا افسانہ "ایک حلفیہ بیان" اور آغا سہیل کا ڈرامہ "خفیہ ہاتھ" سے بہ آسانی مترشح ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں موضوعیت اور معروضیت کی حدود بڑی تیزی کے ساتھ خلط ملط ہو رہی ہیں ۔ دوسرے شمارہ میں انور سجاد اور اختر مومنکا کا افسانہ اور سفرنامہ کا حصّہ بالترتیب اس رجحان کے فروغ کی گواہی دے رہے ہیں ۔ "بیروت" پر دیے گئے سیکشن کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ۔ دوسرے اور تیسرے شمارہ میں نظم و غزل کے سیکشن میں جمیل الدین عالی، جون ایلیا، حبیب جالب، شاہین، افتخار عارف، رضی مجتبیٰ، اعجاز اعظمی، حسن عابد، شریف منور، حسنین سید، احمد نوید اور محبّ عارفی کی تخلیقات کی یکجائی بذاتِ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ اپنے جریدہ کے معیار کے بارے میں کس درجہ سنجیدہ ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ "اردو انٹرنیشنل" کا مستقبل اتنا ہی تابناک ہے جتنا خود اُردو کا ۔

درانئت شکوہ کشمیری ۔ پینسلوانیا،

"اُردو انٹرنیشنل" کے شمارے موصول ہوئے دونوں شمارے بے حد پسند آئے ۔ "مضامین اور خاکے" خصوصاً میرے لئے باعثِ تعلیم رہے ۔ پہلے شمارے میں قمر عباس ندیم مرحوم کو جس طرح آپ نے متعارف کرایا ہے ۔ اس میں جواں مرگی کا المیہ شامل ہے تعارف کا یہ سلسلہ اگر غیر المیاتی صورت میں بھی قائم رہے تو خوب رہے گا ۔ ہم میں سے اکثر جو اپنے سرچشمۂ تمدن سے ہزاروں میل دور ہیں ۔ وہ آسمانِ ادب پہ چمکنے والے نئے ستاروں سے ناواقف ہیں اور اسی لئے اردو ادب کے نئے رجحانات سے بھی نابلد ہوتے جا رہے ہیں ۔ اس سلسلے کے جاری رہنے سے ہم جواں عمر شاعروں اور ادیبوں سے روشناس رہ سکیں گے ۔

ظفر اقبال راؤ۔ اسلام آباد

تسلیمات! اُردو انٹرنیشنل ملا۔ سب سے پہلے تو میری طرف سے دلی مبارکباد قبول کریں کہ دیارِ غیر میں ہوتے ہوئے اتنی محنت اور لگن سے کیا خوبصورت پرچہ نکالا ہے۔ انتخابِ مضامین سے لے کر چھپائی اور کتابت تک کے مراحل انتہائی معیاری ہیں۔ دعاگو ہوں کہ آپ کا یہ حسنِ انتخاب خدا کرے کامیابی کے جملہ مراتب طے کرتا رہے اور پابندی سے چھپتا رہے۔ میری طرف سے ایک دفعہ پھر مبارکباد قبول فرمائیں۔

صدر انجمن "عرفانِ اُردو"۔ لندن

"اُردو انٹرنیشنل" کے دونوں شمارے موصول ہوئے۔ سرورق اتنے دیدہ زیب اور جاذبِ نظر ہیں کہ جو بھی دیکھتا ہے دیکھتا رہ جاتا ہے۔ فہرستِ مضامین عالی ہے۔ واقعی دونوں شماروں میں عالمِ اُردو کے ادباؑ و شعراء کی خوب سے خوب تر نگارشات ہیں۔ میں آپ کو اور "اردو انٹرنیشنل" کے تمام متعلقین کو اپنی طرف سے اور انجمن عرفانِ اردو کی مجلس عاملہ کی طرف سے، شمالی امریکہ سے اس معیار کا ادبی جریدہ شائع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا ہے کہ "اردو انٹرنیشنل" سپہرِ ادب پر ماہِ تاباں کی طرح روشن رہے۔

جمیل مدنی۔ لندن

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہاں کہا تھا کہ لندن اردو کا تیسرا بڑا مرکز ہے یہی بات کمار پاشی نے بھی "قومی آواز" میں دہرائی ہے ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر وہ مقام جہاں اردو کے پرستار موجود ہیں، اردو کا ایک بڑا مرکز ہے۔ اور اس حوالے سے شمالی امریکہ میں ٹورنٹو بھی اردو کا ایک بڑا مرکز ہے جس کے ثبوت میں "اردو انٹرنیشنل" پیش کیا جا سکتا ہے۔

راحت سعید۔ کراچی

"اُردو انٹرنیشنل" مل رہا ہے اور اسی کے ساتھ تمہارے ادبی ذوق، محنت اور لگن کی خوشبو بھی پھیل رہی ہے۔ ایسا خوبصورت اور معیاری جریدہ اور وہ بھی دیارِ غیر سے۔ کیا ہنرمند آدمی ہو

ع نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو

حسن عابد نے کافی بُرا بھلا کہا ہے، کچھ لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ جلد ہی بھیجوں گا ہاں۔ کلکتہ یونیورسٹی میں جو اقبال چیئر قائم ہوئی ہے وہ پہلے فیض احمد فیض کو offer ہوئی تھی۔ فیض صاحب چونکہ نہ جا سکے اس لیئے وہاں کی انتظامیہ نے فیصلہ کر کے یہی offer ڈاکٹر قمر رئیس کو بھیجی ہے۔ دونوں حضرات مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں۔ کیا یہ خوشگوار اتفاق نہیں۔

کلثوم محمدی - دنی پیگ

چند روز ہوئے عرفانہ آپا (عرفانہ عزیز) کے گھر "اردو انٹرنیشنل" دیکھا بے ساختہ دل سے دعا نکلی اس رسالے کی صورت میں آپ نے کینیڈا اور امریکہ میں رہنے والے اردو دوستوں کو ایک گراں مایہ تحفہ دیا ہے آپ کو جن لوگوں کا تعاون حاصل ہے اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "اردو انٹرنیشنل" کی صورت میں ہم لوگوں کو نقوش، فنون، اوراق اور افکار جیسے رسالوں کا بدل مہیا کیا گیا ہے

اسما وارثی، ٹورنٹو

اُردو انٹرنیشنل کے دونوں شمارے موصول ہو چکے ہیں بہت اچھی کاوش ہے خدا سے دعا ہے کہ اس مجلہ کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے دیارِ غیر میں تشنگی کا احساس کافی مدت کے بعد سیراب ہوا ہے

پروفیسر ممتاز حسین - کراچی

صہبا لکھنوی کے یہاں" اردو انٹرنیشنل" دیکھا، بہت پسند آیا، چنانچہ یہ خط اس کی تعریف میں بھی ہے۔ اور اس حسنِ طلب میں بھی ہے کہ جلد از جلد اس کی کاپیاں مجھے ملیں گی، اتنا معیاری رسالہ کینیڈا سے نکل سکتا ہے۔ اس کا سان وگمان بھی نہ تھا میں تو اس کے حُسنِ صورت پر ہی فدا ہوں مشمولات پر گفتگو بعد میں ہوگی۔

جوگندر پال - دہلی

اُردو انٹرنیشنل کے دونوں شمارے آج ہی ملے۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا ہے۔ اب انہیں بڑی محبت اور انہماک سے پڑھوں گا آپ نے کوئی کہانی بھیجنے کو لکھا ہے۔ اتفاق سے آج ہی میں نے اپنی ایک کہانی پوری کی ہے اسے اردو انٹرنیشنل کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔

قتیل شفائی - لاہور

اُردو انٹرنیشنل کا دوسرا شمارہ بھی مل چکا ہے۔ کتنا خوبصورت پرچہ نکال رہے ہیں آپ۔ خوبصورت تو خیر کئی اور پرچے بھی ہوں گے۔ لیکن جو معنوی حسن آپ کے پرچے میں ملا ہے۔ اس نے میرے وجدان کو تھوڑا اور جوان کر دیا ہے

ڈاکٹر منیر الدین احمد - ہمبرگ، جرمنی

اُردو انٹرنیشنل" کا دوسرا شمارہ بھی مل چکا ہے۔ آپ نے اپنا معیار قائم رکھا ہے۔ انتخاب عمدہ ہے اگرچہ ابھی تک یورپ اور شمالی امریکہ میں مقیم ادیبوں کی نمائندگی قدرے کم ہے برلشیٹ کا افسانہ جس کا میں نے حال ہی میں ترجمہ کیا ہے۔ بغرضِ اشاعت بھیج رہا ہوں۔

آغا خالد سعید - برکلے، کیلی فورنیا

اُردو انٹرنیشنل کا شمارہ میری اور میرے دوستوں کی نظر سے گذرا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بیرونِ پاکستان ایک فکری ونظری اُردو مجلہ نکالنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اور اس سلسلے میں ہم سب ہر ممکنہ تعاون کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ایسے تعاون کے لئے فکری ونظری اتفاقِ رائے موجود ہو۔

احمد سعید - علی گڑھ

گذشتہ دنوں اُردو انٹرنیشنل کے شمارے ملے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے اتنا اچھا خوبصورت اور معیاری ادبی رسالہ کینیڈا کی سرزمین سے نکالا ہے۔ پرچہ ہر اعتبار سے معیاری ہے۔ اتنا اچھا رسالہ دیکھ کر آپ لوگوں کی صلاحیت کے قائل ہو گئے ہیں میری طرف سے اور الفاظ کے ادارے کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیں۔ خدا کرے کہ آپ لوگ کینیڈا میں اردو ادب کی ہمیشہ خدمت کرتے رہیں۔

منّو جہاں - لاس اینجلس

خدا تم کو خوش رکھے اور جس عظیم کام کا تم نے بیڑا اٹھایا ہے۔ اس میں تمہیں سرخرو کرے۔ پچھلے شمارے میں اقبال مجید کا افسانہ "ایک حلفیہ بیان" غضب کا افسانہ ہے میری طرف سے افسانہ نگار کو خصوصی مبارکباد دینا۔ ویسے پورا شمارہ ہی لاجواب ہے۔

منظر امکانی - کراچی

"اردو انٹرنیشنل کا دوسرا شمارہ دیکھا تو طبیعت بے پناہ خوش ہوگئی۔ آپ دیارِ غیر میں اُردو زبان اور شعر و ادب کے فروغ میں جس جذبے سے مصروفِ عمل ہیں اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔

اکرام بریلوی - ایڈمنٹن

آپ نے اُردو زبان کی جو شمع کینیڈا میں روشن کی ہے۔ خدا کرے اس کی روشنی دور دور تک پھیلے اور یہ پھیلے تیرے پھولوں کی مہک اور زیادہ۔ ایک تازہ، مختصر سا افسانہ اردو انٹرنیشنل کے لئے بھیج رہا ہوں امید ہے کہ پسند آئے گا۔

خالد اقبال یاسر - اسلام آباد

آپ کے پرچے کی اٹھان بہت اچھی ہے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ابتداء ہی سے اچھا لکھنے والوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔ اور اس طرح ایک ایسا معیار آپ نے قائم کر لیا ہے جو اُردو کے کسی بھی اچھے پرچے سے کم نہیں ہے۔

طاہر نقوی - کراچی

اُردو انٹرنیشنل کا تیسرا شمارہ پاکر مجھے مسرت سے زیادہ حیرت ہوئی کہ اُردو کے علاقوں سے اتنی دور اِس زبان میں اتنا نفیس اور معیاری پرچہ نکل رہا ہے اور وہ بھی باقاعدگی سے۔ ویسے تو یہ بجا ہے کہ اُردو کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں مگر آپ نے اِس زبان کو حدود کی قید سے نکال کر اب دنیا کے ہر کونے میں پھیلا دیا ہے جہاں اِس پرچے کی آؤ بھگت ہوگی۔ آپ نے تقریباً ہر ملک کی نمائندگی دے کر اسے حقیقی معنوں میں بین الاقوامی بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی معیار بھی ملحوظ رکھا ہے۔

مجھے تازہ شمارہ پڑھ کر آسودگی ملی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اِس میں چھپ کر ہر ادیب کو بجا طور پر آسودگی حاصل ہوگی۔ ہاں رام لعل صاحب نے مجھے اپنے افسانے "ایک اور پاکستانی" کے انجام سے الجھن میں مبتلا کر دیا ہے۔ شروع سے افسانہ سلجھا ہوا اور خوبصورت رہا مگر افسانے کو شعوری طور سے کسی مصلحت کی بنا پر ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر سلمان اختر - پنسلوانیا

اُردو انٹرنیشنل کا نیا شمارہ ملا۔ دوسروں کو پڑھا، اپنی غزلیں دیکھیں۔ دونوں باتوں سے خوشی ہوئی۔ رام لعل میرے ہم وطن یعنی لکھنؤ کے ـــــ اور گھاگ افسانہ نگار ہیں لیکن دماغی بیماریوں کے بارے میں CLICHES اور NAIVETTE سے نہ بچ سکے۔ بہر حال رام لعل جی کا نام اور ڈاکٹر محمد حسن ـــــ کہ میرے پرانے واقف کاروں میں ہیں ـــــ کا نام رسالے میں دیکھ کر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں

ڈاکٹر مجیب ایمان - لندن

اُردو مرکز کی تقریب میں "افتخار کے ساتھ، ادب کے عارف نے کہا" "ڈاکٹر صاحب! آپ نے اُردو انٹرنیشنل دیکھا"؟ نفی میں سر ہلایا تو موصوف نے پیش کیا۔ سرورق کی ترکین نظر نواز ہوئی، ذوق کی داد دل نے دی۔ سات سمندر پار، کینیڈا کی سرزمین سے، اردو ادب کی باوقار خدمت آپ ہی کا حصہ ہے۔

رشیدہ عیاں - نیوجرسی

اُردو انٹرنیشنل کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ الفاظ نہیں ملتے کہ پسند اور مسرت کا اظہار کر سکوں ـــــ اتنا خوبصورت اور اتنا مکمل اور اتنا معیاری مجلّہ منظر عام پر لانے کے لیے آپ کو جس قدر سراہا جائے کم ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں۔ آپ کی سعی اور کاوش لائق صد ستائش ہیں۔ جب ان ملکوں میں اردو کی تاریخ لکھی جائے گی تو اُردو انٹرنیشنل کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائیگا

ہمارے
رنگ
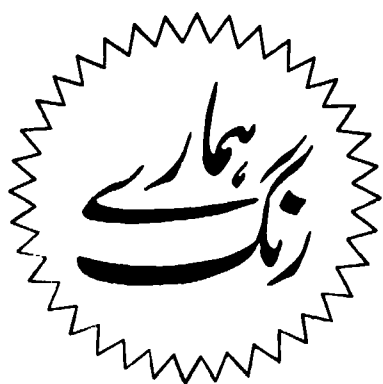
مقامی سرگرمیاں

مرتبہ
ڈاکٹر عبدالقیوم لودھی

جب شمالی امریکہ کی برفیلی ہواؤں نے موسم بہار کی آمد پر اپنی تیزی میں کمی کی اور یخ ہوتے ہوئے چہروں کو کچھ سوچنے کا موقع ملا۔ تو دیگر کاروبارِ حیات کے ساتھ ساتھ ادبی فضاؤں میں بھی ہلچل سی مچ گئی۔
گزشتہ دنوں ٹورنٹو میں "رائیٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈین" کا قیام عمل میں آیا۔ اس نئی تنظیم کو جس کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی، ابتدا ہی سے سنجیدہ اہلِ قلم کا تعاون حاصل ہے اور یوں امید کی جاتی ہے کہ کینیڈا کے سب سے بڑے اردو مرکز کی ادبی سرگرمیوں میں یہ تنظیم ایک مؤثر اور بھرپور کردار ادا کرے گی۔

ٹورنٹو سے نیاگرا فال جاتے ہوئے راستے میں ایک شہر ہملٹن پڑتا ہے۔ کینیڈا کی معاشی زندگی میں یہ شہر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ۲۶ فروری کی شام اس شہر کے اردو داں طبقہ کے لئے انتہائی اہمیت اور مسرت کی حامل تھی کہ اس شام حلقۂ ادب ہملٹن کے اراکین نے مک ماسٹر یونیورسٹی میں ممتاز شاعر احمد فراز

احمد فراز غزل سناتے ہوئے

انور خلیل شیخ حلقۂ ادب کا تعارف کراتے ہوئے

کے ساتھ ایک شعری نشست کا اہتمام کیا جس میں ٹورنٹو اور گرد و نواح کے بیشتر شاعروں کے علاوہ مقامی شعرأ نے بھی اپنا کلام سنایا۔

جمال زبیری، احمد فراز، عروج اختر زیدی اور اشفاق حسین۔ حلقہ ادب کے مشاعرے کے بعد

ادھر بزم اردو ادب نیوجرسی کی جانب سے ۹ اپریل کی شام شہر ولنگ برو میں ایک کامیاب شعری نشست کا اہتمام کیا گیا، جس کی صدارت واشنگٹن شہر کے مشہور شاعر جناب شاہ انور اختر نے کی۔ اس مشاعرے میں امریکہ اور کینیڈا کے مختلف شہروں سے شعرأ نے شرکت کی۔ جن میں امریکہ سے حنیف اخگر، محمد انور، ڈاکٹر وراثت شکوہ کاشمیری، رشیدہ عیاں، عزیز الحسن، محمد عارف اور کینیڈا سے جوش منذوزئی، عابد جعفری، اختر آصف اور خالد فرید کے نام قابل ذکر ہیں۔

دوسری جانب نیویارک میں ۱۰ اپریل کو حلقہ فن و ادب کی ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی جس میں اردو کے ممتاز مستشرق پروفیسر رالف رسل نے شرکت کی " اردو غزل کل سے آج تک کا سفر " " نئی شاعری نئے امکانات و رجحانات " " اردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر " —— یہ تھے موضوعات جن پر رسل صاحب نے اظہار خیال کیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص شگفتہ لہجے اور شستہ زبان میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ " نئی شاعری کے سلسلے میں میرا مطالعہ محدود ہے لیکن شاعری قدیم ہو یا جدید، شاعری تو بہرحال ہونی ہی چاہئے۔ اچھے اور برے شعر ہر زمانے میں کہے گئے ہیں، صنف پر موقوف نہیں کہ کس میں اچھی شاعری ممکن ہے اور کس میں بری، میں غزل سے زیادہ مانوس ہوں اور شاعری کی اسی صنف پر میں نے کام کیا ہے۔ "

حلقۂ فن وادب کی جنرل سیکریٹری حمیرا رحمان
نے پروفیسر رالف رسل کو حلقہ کی جانب سے
ایک PLAQUE پیش کی اور انہیں حلقہ کا اعزازی
ممبر بنایا۔ تصویر میں رسل ممبرشپ فارم پر دستخط
کرتے ہوئے

حلقۂ فن وادب کی اس مجلس میں کولمبیا یونیورسٹی میں اردو کی استاد محترمہ فرانسس پریچٹ نے اردو شاعری کے انگریزی تراجم سنائے، جن میں فیض احمد فیض، افتخار عارف اور جرأت کی نظم "شہر آشوب" کے تراجم شامل تھے۔ اس کے بعد ایک مختصر سی شعری نشست ہوئی اور یوں، حلقۂ فن وادب کی یہ محفل ایک یادگار اور انفرادی ادبی محفل بن گئی۔
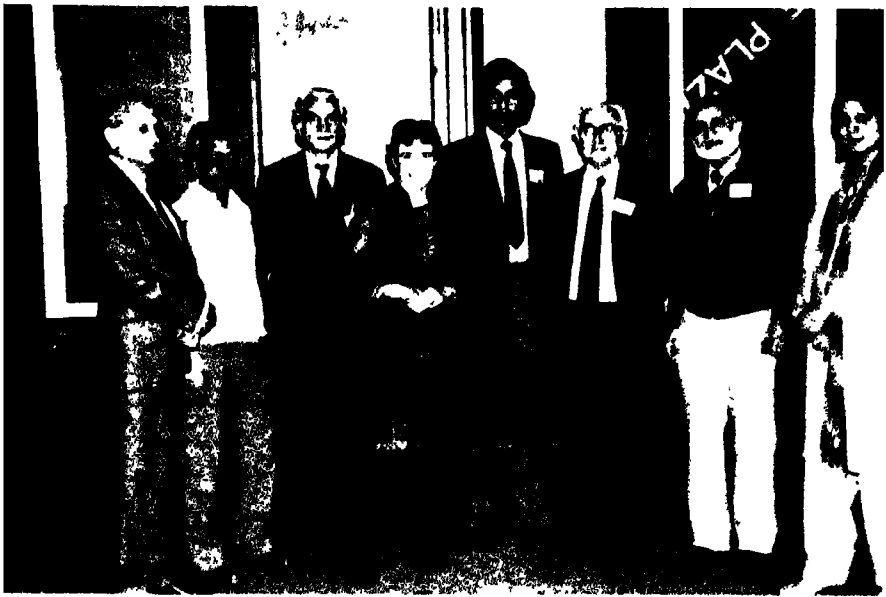
حلقۂ فن وادب نیویارک کی اختتامی تقریب کے موقع پر (دائیں سے بائیں) حمیرا رحمان، ایم۔ اے۔ راز
پروفیسر رالف رسل، ظفر زیدی۔ فرانسس پریچٹ۔ مظفر شکوہ، محمد اعجاز اور اسد الرحمان

۲۴ اپریل کی شام ٹورنٹو شہر میں اردو کے عہد آفریں شاعر جوش ملیح آبادی کی یاد میں ایک عظیم الشان طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں جوش صاحب کا یہ مصرع طرح کے لئے منتخب کیا گیا تھا

ع آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو

پہلے کرنل انور احمد نے اپنے ایک مقالے میں جوش ملیح آبادی کو خراج تحسین پیش کیا، پھر شعرا کی خاصی بڑی تعداد نے اس طرح میں اپنی غزلیں سنائیں۔ مقامی شاعروں میں، جوش مندوزئی، اعجاز برزی، اطہر رضوی، عروج اختر زیدی، اسلم وارثی، عقیلہ شاہین، نزہت صدیقی، سلیم صدیقی، نذیر صدر، تجمل بانی، اشعر وارثی، مدحت، بیدار بخت، امیر صولت، معزز شارب، ریاض الوارث، عتیق عادل، عابد جعفری، اختر آصف اور اشفاق حسین کے علاوہ آٹوا سے شاہین، ابرار الحسن، ڈاکٹر علی رضا، نیویارک سے ڈاکٹر مظفر شکوہ، مامون ایمن، سحر فتحپوری، شکاگو سے ڈاکٹر عنایت شاداں، ملک سعیدی، مانٹریال سے اجمال منتظر اور میری لینڈ سے شاہ نور اختر نے شرکت کی۔ محفل مشاعرہ کی صدارت جناب شاہ نور اختر نے کی جبکہ منتظم مشاعرہ کے فرائض اختر آصف نے ادا کئے۔

شاہ نور اختر کلام سناتے ہوئے۔ پس منظر میں مظفر شکوہ اور عنایت حسین شاداں

ان ہی دنوں آٹوا سے ابرار الحسن کا پہلا شعری مجموعہ "دائرے" کے نام سے شائع ہوا۔ دائرے میں صرف نظمیں ہیں، ہیئت اور موضوع دونوں کے اعتبار سے ابرار کی یہ نظمیں جدید شاعری کے تمام محاسن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ابرار کو یہ اولیت حاصل ہے کہ آٹوا شہر سے ان کا مجموعۂ کلام پہلی بار شائع ہوا اور یہی نہیں بلکہ انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع ہوا۔

تبصرہ

رضیہ فصیح احمد
کراچی

جدید اُردو افسانہ

"جدید اردو افسانہ"، شہزاد منظر کے ۱۰ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ جدید افسانے پر کوئی مربوط کتاب نہیں ہے۔ تاہم اس میں کم از کم آٹھ مضامین جدید افسانے سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں روائتی کہانی سے لے کر تجریدی افسانے تک انہوں نے افسانے کا پوری طرح جائزہ لیا ہے۔ بعض جگہ فرداً فرداً افسانہ نگاروں اور افسانوں کا تفصیلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس طرح بات پوری طرح سامنے آگئی ہے اور اس میں اتنا پھیلاؤ آگیا ہے کہ یہ ایک کتاب آپ کو بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

شہزاد منظر نے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات کے معنی کو بھی واضح کیا ہے۔ فکشن، نان فکشن، ڈاکیومینٹری فکشن وغیرہ سے کیا مراد ہے۔ علامت اور استعارے کے مفہوم اور معنویت میں کیا فرق ہے؟ علامت اور تجرید کسے کہتے ہیں؟ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ آج تک علامتوں کے استعمال کے کون سے طریقے رائج رہے ہیں۔ انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ جدید افسانے لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس میں کیا خوبیاں، کیا خامیاں اور کیا قباحتیں ہیں۔ وہ کس حد تک مقبول ہوئے۔ اگر نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے۔ ایسے بہت سے سوالات انہوں نے اٹھائے ہیں اور اپنے طور پر جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ جدیدیت اسلوب کا نام نہیں، رویّے کا نام ہے۔ جدیدیت کی پہچان افسانہ نگار کے اسلوب سے نہیں۔ زندگی اور ادب کے بارے میں اس کے رویّے سے ہوتی ہے۔ انہوں نے نئی نسل کے ایسے افسانہ نگاروں کا بھی تجزیہ کیا ہے جو تجریدیت کو اپنا کر بے معنویت کا شکار ہو رہے ہیں اور ان کو بھی پرکھا ہے جو علامت کے ذریعہ بامعنی اور موثر افسانہ لکھ رہے ہیں۔ دوسرے ممالک میں نان فکشن، فکشن کی بے پناہ مقبولیت سے انہیں یہ خدشہ ہے کہ قاری واقعاتی افسانوں کا اس قدر گرویدہ ہو رہا ہے کہ یقیناً تجرید سے اس کی دلچسپی کم سے کم ہوتی چلی جائے گی۔ آخر میں انہوں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ اینٹی اسٹوری یا بے ربط افسانے لکھنے کا تجربہ ناکام ہو چکا ہے۔ چنانچہ حالیہ افسانے میں کہانی پن اور ڈرامائی سطح بحال ہو رہی ہے۔ خیال، احساس، کیفیت یا واقعہ کو کہانی پن کے بغیر لکھنا ممکن نہیں۔ اس طرح انہوں نے بیماری کی تشخیص اور علاج سب کچھ بتلادیا ہے۔ اس کتاب میں پریم چند، مرزا حامد، ممتاز شیریں اور ابراہیم جلیس پر الگ الگ مضامین بھی ہیں۔ یہ مضامین ان مصنفوں کے تقریباً تمام افسانے پڑھنے کے بعد نہایت محنت اور دیانت داری سے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب تنقیدی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے

اردو انٹرنیشنل

کے چوتھے شمارے

کی اشاعت پر

ہدیۂ تبریک

ڈاکٹر فرحت زبیر ——— (لاس اینجلس)
ڈاکٹر عبدالحئی خان ——— (شکاگو)
ڈاکٹر عبدالخالق ——— (ایڈمنٹن)

URDU INTERNATIONAL: May 1983, Volume 2 - No. 3

Editor: Ashfaq Hussain

Associate: Hasan Abid

Advisory Council. Faiz Ahmed Faiz
Dr Qamar Raees
(Delhi University)
Dr Abdul Q Lodhi
(University of Toronto
The Ontario Institute for Studies in Education)

Circulation Manager Abid Jafri

URDU INTERNATIONAL, a journal of literature and literary criticism, is published quarterly in August, November, February and May by the U I Publishers, Toronto, Canada Subscription rates institutions, 1 year $40.00; individuals, 1 year $20.00. Single copy rates institutions $10 00, individuals $5.00

Concerning manuscripts, address

Ashfaq Hussain, Editor, Urdu International,
80 Richmond Street West, Suite 201,
Toronto, Ontario
Canada M5H 2A4

 Printed in Canada